سالنامہ ۲۰۱۵ء

اردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و ثقافتی مجلہ

سہ ماہی

الاقرباءؔ

اسلام آباد

جامعہ نظامیہ حیدرآباد (دکن)

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۸ شمارہ نمبر ۱ جنوری۔مارچ / اپریل۔جون ۲۰۱۵ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Fax 051-2221670 Ph.051-4442686

E-mail alaqreba@hotmail.com

website www.alaqreba.com

بیرون ملک مشیران اعلیٰ

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone

London, E-11. 3 DG (U.K.)

Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849

Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE

Mill Creek WA 98012- 4677(USA)

Phone: (001) 425-385-8666

E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۳۰۰ روپے
سالنامہ ۲۰۱۵ء	۶۰۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۱۲۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۱۰ / ڈالر ۷/ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰ /ڈالر ۳۰/ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	سالنامہ (جنوری۔مارچ/اپریل۔جون ۲۰۱۵ء
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سید ناصر الدین

مندرجات

مندرجات

تاریخ

عالمی ادب

گوشۂ ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق

یادِ رفتگاں

انشائیہ۔ افسانہ

متفرقات

حمد و نعت

سلام و منقبت/ منظوم تراجم

غزل

اردو ایوانِ عدل میں

قائمقام چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس جواد ایس خواجہ کی سربراہی میں عدالتِ عظمیٰ کی ایک سہ رکنی بنچ نے اپنے حالیہ فیصلے میں حکومتِ پاکستان سے آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت اردو کو سرکاری و دفتری زبان کا درجہ دینے میں تاخیر کے ذمہ داروں کے نام طلب کر لیے ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت دی گئی رعایت کے مطابق یہ حکومت کی ذمہ داری تھی کہ قومی زبان اردو کو آئندہ پندرہ برسوں میں (۱۹۸۸ء تک) بحیثیت سرکاری و دفتری زبان عملاً نافذ کر دیا جاتا لیکن مزید ۲۷ سال گزر جانے کے باوجود آئینی شق کی سنگین مجرمانہ خلاف ورزی بدستور جاری ہے۔ عدالتِ عظمیٰ کا مذکورہ حکم اسلام آباد کے ایک معروف قانون دان جناب کوکب اقبال خواجہ کی ایک آئینی درخواست پر صادر کیا گیا۔ اس سے قبل بھی ۱۹۹۱ء میں یعنی ۲۴ برس پہلے چند محبِ وطن اور غیرت مند پاکستانیوں کی جانب سے جناب محمد اسمٰعیل قریشی سینئر ایڈووکیٹ عدالت عظمیٰ پاکستان نے جس دردمندی، اخلاص اور غیرتِ قومی کے جذبے کے ساتھ عدالت عالیہ لاہور میں ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد کے ساتھ آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت جو تاریخی درخواست پیش کی تھی وہ آج بھی عدالتی سرد خانے سے باہر نہیں آسکی۔

عزت مآب جناب جسٹس جواد ایس خواجہ نے انھیں دنوں عدالتی قوانین کے اردو ترجمہ پر مشتمل کتب کی اشاعت میں سنگین حکومتی فروگزاشتوں کا بھی عدالت عظمیٰ کی دو رکنی بینچ کے سربراہ کی حیثیت سے 'از خود نوٹس' لیا ہے انھوں نے دوران سماعت 'منجملہ دیگر' یہ بھی فرمایا کہ شاید ہم پتھر کے دور میں جی رہے ہیں، اگر نااہل ممالک کی فہرست مرتب کی جائے تو دنیا کے ۱۸۰ ممالک میں پاکستان پہلے نمبر پر آئے گا۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں قوم کے ساتھ کیا مذاق کرنا چاہ رہی ہیں۔ اگر یہ قوانین کا ترجمہ نہیں کر سکتیں تو کیا انگریز کی غلامی اختیار کر لیں؟ قوانین کو شہریوں

کے لیے عام فہم ہونا چاہیے۔ اس دوران سکریٹری لا اینڈ جسٹس ڈویژن نے بتایا کہ تمام وفاقی اور صوبائی قوانین جون ۲۰۱۶ء تک مرتب اور اُن کے ترجمے ہو جائیں گے۔ جس پر جسٹس موصوف نے فرمایا کہ کیا جون ۲۰۱۶ء تک لاقونیت رہے گی؟ نہایت آسان کام کو اتنا پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ انتہائی غفلت کا معاملہ ہے لیکن کوئی غفلت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ غفلت و لاپرواہی کے ذمہ داروں کے خلاف کاروائی نہ کرنے والوں کے نام بتائیں مگر ذمہ داروں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی اور نہ ہی نام بتائے گئے۔ انگریز نے ۱۸۹۹ء میں قوانین کے مقامی زبانوں میں ترجمے کرائے تھے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کو تیار نہیں۔ عدالتی احکام پر درآمد نہ ہوا تو وفاقی اور صوبائی چیف ایگزیٹوز اور وزراء کو بلائیں گے۔

عدالت عظمیٰ نے پاکستان کے آئین کے محافظ اور آئینی دفعات کی خلاف ورزی کا نوٹس لینے اور آئین کی روح کے مطابق اُس پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے سلسلہ میں بحیثیت مقتدرہ کی حیثیت میں اپنا آئینی کردار ادا کرنے کے عزم صمیم کا جس طرح واضح اور دوٹوک اظہار کیا ہے وہ ہر محب وطن پاکستانی کے لیے ایک نوید جاں فزا سے کم نہیں لیکن ملکی انتظامیہ کی قومی بے حسی کا شاہکار وفاقی چیف ایگزیکٹو کی وہ خیر مقدمی تقریر ہے جو اُنھوں نے اسی دوران مخلص و معتمد اور پڑوسی ملک چین کے سربراہِ مملکت کے اپنی قومی زبان میں خطاب کے بعد انگریزی زبان میں ارشاد فرمائی۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جس طرح چینی مہمانِ گرامی کی تقریر کا بیک وقت ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا اُسی طرح وزیر اعظم پاکستان کی تقریر کا ترجمہ بھی جن کی قومی زبان اردو ہے انگریزی زبان میں کر دیا جاتا؟۔ اکثر غیر ملکی زعما، جو پاکستان تشریف لاتے رہے ہیں اُنھوں نے اپنی قومی زبان ہی میں تقاریر کیں۔ آنجہانی چو۔ این۔ لائی جب تشریف لائے تھے تو پریس کانفرس سے چینی زبان میں خطاب فرمایا اور مترجم اُن کی تمام گفتگو کو انگریزی میں ترجمہ کرتا رہا۔ کہیں مترجم سے سہو ہوا اور اُس نے کسی جملے کا غلط ترجمہ کر دیا۔ چینی وزیر اعظم نے اُسے فوراً ٹوکا تو تمام صحافی حضرات حیران رہ گئے۔ ایک اخبار نویس نے کہا کہ آپ انگریزی جانتے ہیں تو

انگریزی میں بات کیجیے۔انھوں نے چینی زبان میں جواب دیا کہ جب میری قومی زبان چینی ہے تو انگریزی کیوں بولوں؟ پاکستان کے حکمرانوں میں جنرل ضیاءالحق مرحوم واحد شخص تھے جنھوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے اردو میں خطاب کیا بلکہ خطاب سے پہلے تلاوتِ کلام پاک کا بھی اہتمام کیا

بد قسمتی سے یہ بھی ہمارا قومی المیہ ہے جس کی تمام تر ذمہ داری قومی قیادت پر عائد ہوتی ہے کہ ہم نے اپنی قومی زبان کی قدر نہیں کی جس کا سکہ چار دانگِ عالم میں چلتا ہے۔اقوام متحدہ کا سرکاری ادارہ یونیسکو اسے عالمی سطح کی زبان قرار دے چکا ہے جسے چھ ارب عالمی آبادی میں کم و بیش ڈیرہ ارب افراد سمجھ سکتے ہیں بول سکتے ہیں لیکن یونیسکو میں بھارتی سفارت کاروں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اِسے ''ہندوستانی'' کے نام سے موسوم کرا دیا حالانکہ ہندوستانی نام کی زبان دنیا بھر میں کہیں نہیں پائی جاتی جب کہ ہندوستان کی قومی زبان کا نام بھی 'ہندوستانی' نہیں بلکہ 'ہندی' ہے۔ہم نے متعدد بار اپنے ارباب بست و کشاد کی توجہ اِس طرف دلائی کہ اول تو یونیسکو کے ریکارڈ میں نام کی تصحیح کرائیں دوم اردو کو عالمی سطح کی زبان ہونے کے ناطے حق حاصل ہے کہ اُسے عالمی ادارے کی سرکاری زبانوں میں شامل کرایا جائے مگر'' کون سنتا ہے فغانِ درویش''

ممکن ہے کہ بیشتر افراد کو اس حقیقت کا علم نہ ہو کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد آئین سازی کے دوران بھارتی 'لوک سبھا' (ایوان زیریں) میں قومی زبان کے حوالے سے اردو یا ہندی میں سے کسی ایک کو قومی زبان قرار دینے کی تجویز پر جب رائے شماری کرائی گئی تو دونوں زبانوں کے حق میں برابر برابر ووٹ پڑے اور فیصلہ ہندی کے حق میں اسپیکر کے صرف ایک ووٹ (Casting Vote) سے ہوا۔ایک اور ناقابل تردید حقیقت یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے 'انڈین ایکسپریس' نے اپنے ایک اداریے میں اردو کو بھارت کی سرکاری زبان قرار دینے کا پُر زور مطالبہ کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ گاندھی جی

'ہندوستانی' کے نام سے بھارت میں سرکاری زبان کے طور پر فارسی رسم الخط کے ساتھ ہی اردو کا نفاذ چاہتے تھے چنانچہ یہ ہے وہ حقیقت جسے محاورۃً کہا جاتا ہے: ''جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے''

اخبار مذکور نے یہ بھی لکھا تھا کہ 'لوک سبھا' کے ۱۰۴ اراکین کی جانب سے مختلف ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کے طور پر بھی اردو کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا تھا چنانچہ بعض ریاستوں میں اردو کو یہ مقام آج بھی حاصل ہے نام کے اعتبار سے بھی اس زبان کی شناخت دنیا کے کسی بھی خطے سے وابستہ نہیں۔ جغرافیائی اور نسلی ماورائیت اس کا وہ اختصاص ہے جو دنیا کی کسی زبان کو حاصل نہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ لسانی تعصبات سے پاک جو ہر زبان کو گلے لگا لیتی ہے اور اُس کے الفاظ خود بھی قبول کرتی ہے اور اُسے بھی اپنے لامحدود ذخیرۂ الفاظ سے مالا مال کرتی ہے۔

ہم اسے تمام قوم کے لیے ایک مبارک فال سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی عدالت عظمیٰ نے اپنے آئینی اختیارات کو کج فہم انتظامیہ پر واضح کر دیا ہے جو احساسِ کمتری کے مرض میں بُری طرح مبتلا ہے اور جسے یہ معلوم نہیں کہ احساسِ برتری نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ بھی صرف احساسِ کمتری ہی ہوتی ہے۔ عزت مآب جناب جسٹس جواد خواجہ نے درست فرمایا ہے کہ اگر آئین سے انحراف کیا جائے گا تو کوئی بھی سرکار کو یہ کہہ سکتا ہے کہ حکومت خود آئین کی پاسداری نہیں کر رہی تو ہم کیوں کریں؟ اب جب کہ الحمدللہ طلوعِ صبح نو کے آثار پیدا ہو چکے ہیں تو ہم محترم عدالت عظمیٰ سے مودبانہ یہ گزارش بھی کریں گے کہ لاہور ہائی کورٹ میں ۱۹۹۱ء سے جو مذکورہ آئینی درخواست زیرِ التوا چلی آرہی ہے اُسے بھی ازراہ کرم طلب فرما کر اُسی نوعیت کی موجودہ زیرِ سماعت درخواست سے منسلک کر لیا جائے تاکہ طلوعِ صبحِ نو کے ساتھ ہی اندھیرے پاش پاش ہو جائیں اور ظلمت پرست بھی اُنھیں کے ساتھ رخصت ہو جائیں:

اور کوئی دم کی مہماں ہے گزر جائے گی رات — پو پھٹے تک آپ اپنی موت مر جائے گی رات

جو بھی ہیں پروردۂ شب جو بھی ہیں ظلمت پرست — وہ تو جائیں گے اُسی جانب جدھر جائے گی رات

(سرور بارہ بنکوی)

’تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم‘

افسوسناک ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے یہ صورت حال کہ منجملہ دیگر اسباب بدنامی و رسوائی، ہمیں یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ پاکستان میں ملک کے نظامِ تعلیم کی اعلیٰ ترین سطح پر علم کی خرید و فروخت ایک کاروبار کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ دوکانوں پر سرِ بازار حل شدہ امتحانی مشقوں کے اشتہار آویزاں نظر آتے ہیں اور دوکانداروں کے کارندے سرِ راہ چلنے والوں کو آوازیں دے کر اور اُنھیں روک کر بازار کے موجود نرخوں سے کم قیمتوں پر گھر بیٹھے امتحان پاس کر لینے نیز یونیورسٹی اسناد یا اعلیٰ ڈگریوں کے حصول کی یقین دہانی کراتے ہیں۔ شاید ہمارے قارئین کو یقین نہ آئے جیسا کہ ایسی صورت حال خود ہمارے بھی وہم و گماں اور تصور سے ماورا تھی لیکن اِس حقیقت کا انکشاف پاکستان کے موقر ترین انگریزی روزنامے ’’ڈان‘‘ نے جسے بین الاقوامی سطح پر بھی قارئین کا اعتماد و احترام حاصل ہے اپنی اشاعت مورخہ ۲۷ مارچ ۲۰۱۵ء کو کیا۔ اخبار مذکور اپنی خبر بعنوان ’’اے۔ آئی۔ او۔ یو (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) کی مشقیں برائے فروخت‘‘ میں لکھتا ہے:

ترجمہ:

’’پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں فاصلاتی نظامِ تعلیم بدنامی و رُسوائی کی نذر ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی جو ملک میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی جامعہ ہے جس سے تیرہ لاکھ طلباء و طالبات وابستہ ہیں اس کے نصاب کی حل شدہ مشقیں (Assignments) بازار میں ہاتھوں ہاتھ فروخت (Selling like hot cakes) ہو رہی ہیں۔ یہ حل شدہ مشقیں بالخصوص جڑواں شہروں (راولپنڈی۔ اسلام آباد) کے تمام

بڑے بازاروں میں کھلے بندوں دستیاب ہیں۔ کراچی کمپنی (اسلام آباد کی ایک بڑی مارکیٹ) اور 6th Road (راولپنڈی میں خرید وفروخت کا ایک بڑا مرکز) فریب کاری کے اِن 'آلات کار' کی فروخت کے لیے خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔۔۔ ایک دوکان کے سیلز مین نے نرخ نامہ پڑھ کر بتایا کہ ماسٹرز (ایم۔اے۔ایم۔ایس۔سی) کی حل شدہ مشقیں ایک ہزار روپے سے ڈیڑھ ہزار روپے تک اور ڈگری (بی۔اے۔بی۔ایس۔سی) نیز انٹرمیڈیٹ کی حل شدہ مشقوں کے نرخ پانچ سو اور آٹھ سو روپے کے درمیان ہیں۔ حماد نامی ایک سیلز مین نے ڈان کو بتایا کہ وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی حل شدہ مشقوں کی فروخت کا یہ دھندہ گزشتہ دس سال سے کر رہا ہے اور ان کے پینل پر متعدد مستند اساتذہ ہیں جو اِن مشقوں کے حل انھیں مہیا کرتے ہیں۔ ایک ایم۔ایس۔سی کے طالب علم نے بھی جو مارکیٹ سے حل شدہ مشقیں خریدنے آیا تھا 'ڈان' کو بتایا کہ جوں ہی اُس نے اے۔آئی۔او۔یو میں داخلہ (Enrolment) لیا اُسے چار دوکانوں سے خطوط ملے جنھوں نے حل شدہ مشقیں مہیا کرنے کی پیش کش کی جس پر پہلے پہل وہ حیران ہوا کہ اِن کتب فروشوں کو اُس کے رہائشی پتہ کا کس طرح علم ہوا لیکن بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ یونیورسٹی کے عملہ کی ملی بھگت سے ایسا کرتے ہیں جو طلباء سے متعلق معلومات اُنھیں مہیا کرتے ہیں۔ حالیہ تقرر یافتہ وائس چانسلر ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ڈان کو بتایا کہ وہ اِس عمل کو روکنے کے لیے متعدد اقدامات کر چکے ہیں اور پہلا کام جس کے کرنے کا اُنھوں نے منصوبہ بنایا ہے وہ نصاب پر نظر ثانی اور امتحانی مشقوں کی ہیئت میں تبدیلی لانا ہوگی اور اس مسئلہ پر ایک کمیٹی تشکیل دی جا چکی ہے۔''

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ حکیم الامت اور مصوّرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ سے منسوب فاصلاتی نظامِ تعلیم کی دانش گاہِ ملک کی واحد جامعہ میں ضمیر و کردار کے اس عدیم المثل گھناؤنے بحران پر اگر نظر پڑی بھی تو اُس اخبار کی جس کا آغاز بانیِ پاکستان حضرت قائداعظمؒ نے خود فرمایا۔ ہمیں

انتہائی دکھ کے ساتھ محسوس ہوتا ہے آج اِن دونوں محسنین قوم کی روحیں بے چین اور مضطرب ہونگی۔
مزید دُکھ کا سبب یہ بھی ہے کہ محترم رئیس الجامعہ کا ایسا کوئی پروگرام نہیں کہ گذشتہ دس برس سے جاری وساری اِس ایمان فرشانہ کاروبار کی اعلیٰ سطحی تحقیقات کرائی جائیں اور ملوث پائے جانے والے عملہ کے اراکین کو بالخصوص قانون کے مطابق سخت ترین سزائیں دے کر کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے تاکہ آئندہ کوئی بھی ایسی ناپاک جسارت کا تصور نہ کر سکے۔ علم کی ترسیل جیسے پاکیزہ مشن کے شمع بردار ادارے کو ضمیر فروشوں سے پاک کیا جائے جو وطنِ عزیز کی ذلت و رسوائی کا سبب بنے ہیں۔ پہلے ہی شعبۂ تعلیم سے متعلق بدعنوانیاں کیا کچھ کم تھیں کہ پاکستان کو دنیا بھر میں ذلیل و خوار کرنے کے لیے تازہ ترین ذلت آمیز صورت حال سے اغماض برتا جائے۔ ذرائع ابلاغ کا کردار قابلِ تحسین ہے کہ وہ خود کو خطرات میں ڈال کر بھی اپنا قومی و پیشہ ورانہ فرض انجام دے رہے ہیں۔ اِسی تناظر میں تھامس جیفرسن کا یہ شہرۂ آفاق قول ہمارے ذہن میں تازہ ہو گیا ہے کہ:

”میں ایک ایسے مُلک میں رہنا پسند کرونگا جہاں حکومت نہ ہو بہ نسبت اک ایسے ملک کے جہاں حکومت تو ہو لیکن اخبارات نہ ہوں۔“

جامعہ نظامیہ حیدرآباد، ایک قدیم گہوارۂ علم و ادب

حیدرآباد مسلمانوں کی تہذیب کے گہرے نقوش لیے، دکن یعنی، جنوبی ہند کے بیچوں بیچ نگینے کی طرح جڑا ہوا، ایک بہت گنجان اور زندگی سے ہمکتا ہوا شہر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی یہاں مسلمانوں کی سیاست، تہذیب اور ایمانی رنگ کا غلبہ تھا۔ اُن کی حکمرانی کے نقوش آج بھی وہاں تازہ ہیں۔ اُن کی ایک شان تھی، شوکت تھی، دبدبہ تھا۔ وقت وہاں ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔

لیکن تابہ کے، وقت کے تیور بدلے اور اُسی عروج کے دل افروز قصے اور عروج کے بعد زوال کی دل دوز داستانیں سمیٹے یہ شہر اپنی جگہ موجود ہے۔ آج بھی وہاں زندگی خوب ہمکتی اور روزمرّہ والی آسائشوں کی تلاش میں مگن رہتی ہے۔

حیدرآباد ایک ایسا نڈر شہر ہے کہ تاریخ کی ہر کروٹ میں جاں بَر ہوا۔ اِس نے وقت کے ہر تیور کو قریب سے دیکھا بہت سے ادوار کو اپنے وجود کا حصہ بنایا۔ کبھی مشرق میں مرہٹوں کی تاتنی اور دسوتی میں لپٹی دشمنی دیکھی۔ کبھی شمال کی جانب سے عروس البلاد دلّی میں جمے جمائے مغل راج کی دی ہوئی ہل چل کے جھٹکے سہے۔ مغلوں کے بعد انگریزوں کی مکارانہ اور غاصبانہ سیاست کے داؤ پیچ دیکھے اور اس کے ساتھ ساتھ کافی نیچے جنوب مشرق میں ریاست میسور (کیرالا) میں حیدر علی اور اس کے جانشین فرزند سلطان ٹیپو کی شیروں کی سی لپک جھپک دیکھی اور اُن کی مجاہدانہ للکاریں بھی اُسے سنائی دیں، چال باز انگریز اپنی کاسہ لیس مقامی قوتوں کے ساتھ انھیں گھیر رہے تھے۔ وقت کا تموّج جاری رہا تنہا ٹیپو دشمنوں سے لڑتا رہا بالآخر اس کی شیر کی سی زندگی تاریخ کے دھندلکوں میں جا چھپی۔ تاہم حیدرآباد کا تشخص ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے قائم رہا۔

بّرصغیر میں انگریز چھا گئے تھے لیکن تادیر کچھ ڈھکی کچھ کھلی سیاسی آویزشیں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کا سال آگیا۔ گھڑیال کی فیصلہ کن منادی اور اس کے ساتھ ہی بّرصغیر تقسیم ہوا۔

دو ملک ظہور میں آئے۔ ریاست حیدرآباد کی آزادی کا بھی مسلم حکمرانوں نے فیصلہ کیا۔ برصغیر میں یہ دوسرا مسلم ملک کیوں؟ ہندو کی پیشانی پر بل پڑے، پولیس ایکشن ہوا اور پھر ریاست حیدرآباد اور اس کا بانکپن ٹوٹ گیا۔ حیدرآباد اب بھارت کے جغرافیہ کا حصہ ہے لیکن اپنی اسلامی تہذیب کے تابندہ نقوش بخوبی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ان ہی نقوش میں سب سے نمایاں ''جامع نظامیہ'' ہے مسلمانوں کی علم پروری اور کتاب دوستی کا ایک پُرشکوہ مظہر۔

جامع نظامیہ: شہر کے ایک معروف تاریخی مقام چارمینار سے صرف تین کلومیٹر دُور مغرب میں شبلی گنج میں واقع ہے، وہاں ایک سو چوالیس سال پرانی اسلامی یونی ورسٹی ''جامع نظامیہ'' سادہ لیکن پُروقار انداز میں کھڑی ہے۔ پہلے کی طرح اس کی تدریس کا شہرہ آج بھی ہے اور اس کے معیار کو قاہرہ کی جامع الازہر کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ نظام کے وزیر برائے مذہبی امور مولانا محمد انوار اللہ فاروقی اسکے بانی تھے۔ اس وقت یہ جنوبی ہند کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ آج کل اس میں تقریباً تیس ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ مین کیمپس کے علاوہ اس کی ڈھائی سو سے زائد برانچیں آس پاس کی چار ریاستوں (صوبوں) میں کام کر رہی ہیں۔ ادارے کا بجٹ چار کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ طالب علموں سے تدریس اور قیام وطعام کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ گورنمنٹ سے بھی کوئی مالی اعانت حاصل نہیں۔ البتہ عام مسلمانوں سے زکوٰۃ اور عطیات کی شکل میں رقوم اکٹھی کی جاتی ہیں۔ شیخ الجامعہ یا یونی ورسٹی کے سربراہ مفتی خلیل احمد ہیں جن کی زیرِ نگرانی یہ جامعہ ایک مشن کے تحت اپنا کام کر رہی ہے۔

کتب خانہ: قدیم وجدید علوم کی تدریس کے لیے جامعہ میں بہت سے شعبے موجود ہیں سب سے عظیم المرتبت شعبہ اس کا کتب خانہ ہے۔ شیخ الجامعہ مفتی خلیل احمد نے اس کے لیے بالالتزام قدیم و جدید کتب منگوائیں تاکہ طلبا اور سکالرز اُن سے مستفید ہوں۔ دراصل حصول کتب کے کام کی ابتدا ادارے کے بانی مولانا محمد انوار اللہ فاروقی نے اپنی وزارعت کے دوران ہی کر دی تھی۔ انھوں نے اپنے ذاتی خرچ سے دنیا بھر کے ممالک سے اس لائبریری کے لیے عمدہ کتب کے علاوہ قلمی

نسخے بھی منگوائے۔ ان کی خواہش تھی کہ بھارت کے علاوہ بیرونی ممالک سے بھی طلبا اور محقق حضرات اس دارالمطالعے میں آئیں۔ ہر موضوع پر بالعموم اور بین المذاہب تقابلی ریسرچ والے موضوعات پر بالخصوص کام کریں۔ یہ مولانا کی ابتدائی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج جامعہ کا کتب خانہ قدیمی اور قلمی نسخوں سے مالا مال ہے۔ اور اس قیمتی ذخیرے کا بھارت کے علاوہ دور ونزدیک کے ممالک میں شہرہ ہے۔ اس وقت صرف قرآن وحدیث سے متعلق کتب خانے میں ایک لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ جو اردو عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں۔

قیمتی نسخے: چند قدیم قلمی نسخوں کے علاوہ کتب خانے کی قیمتی اور اہم کتابوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

- قرآن پاک کا مخطوطہ: یہ مخطوطہ چار سو سال پرانا ہے۔ اس کے پہلے دو صفحے سونے کے ہیں
- کتاب التبصرہ فی القرأت العشرہ: یہ کتب خانے میں موجود سب سے قدیم یعنی ۷۵۰ سال پرانا نسخہ ہے جو معروف اسلامی سکالر ابو محمد مکی بن طالب نے تجوید کی مدد سے مطالعۂ قرآن کے موضوع پر لکھا تھا۔ اِس وقت اس اعلیٰ کتاب کے پوری دنیا میں صرف دو نسخے ہیں
- مجموعۂ احادیث: یہ مجموعہ بائیس جلدوں میں سینتالیس ہزار احادیث پر مشتمل ہے عربی سکالروں کے لیے ایک عمدہ حوالہ جاتی کتاب ہے۔
- کنز العمال: یہ کتاب انڈین سکالر شیخ علی متقی برہان پوری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی قریباً سو برس قبل جامع کے بانی مولانا فاروقی اسے قلمی نسخے کی شکل میں مدینہ سے لائے اور پھر مرتب کر کے حیدرآباد سے شائع کیا۔
- کتاب الروح: یہ ایک عرب سکالر ابن القیوم کی لکھی ایک نایاب کتاب تھی جس میں انسانی روح کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث جمع کی گئی تھیں۔ سن ۱۹۰۰ء میں اسے حیدرآباد سے شائع کیا گیا۔

○ مہابھارت: ہندو دھرم کی مشہور مذہبی کتاب۔ قریباً چار سو برس پہلے شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے نورتنوں میں سے ایک معروف رتن ابوالفضل نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اٹھارہ لاکھ الفاظ پر مشتمل کل پانچ ہزار صفحات لکھے گئے۔ اس ضخیم کتاب کا کافی عرصہ شہرہ رہا یہ مغلوں کی دوسرے مذاہب کی تعظیم کیے جانے کے ساتھ ساتھ اُن کی علم دوستی کا مظہر بن گئی۔ وقت بدلا اور یہ قیمتی نسخہ مغلوں کے شاہی کتب خانے سے نکل کر جانے کب اور کن کن ہاتھوں سے ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچ گیا۔ اور پھر مولانا فاروقی کی کوششوں سے جامعہ نظامیہ کے کتب خانے کی زینت بنا۔

جامعہ کے بانی مولانا محمد انوار اللہ فاروقی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ۱۸۸۸ء میں ''دائرۃ المعارف'' کے نام سے حیدرآباد میں ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جہاں نایاب اسلامی کتب کو تلاش اور تحقیق کے بعد شائع کیا جاتا تھا۔ ایسا ادارہ دنیائے اسلام میں اور کہیں نہ تھا۔

محمد انور معین زبیری مجدّدی

'بہارِ ایجادیٔ بیدل'۔۔ تفہیمِ بیدل کی ایک عظیم کاوش

ہم ابھی تک غالب کی فارسی شاعری کو ہی اک جہانِ دگر سمجھے ہوئے تھے اور غالب کی مشکل پسندی اور مضمون آفرینی کے سحر میں ہی گرفتار تھے اور حضرت عبدالقادر بیدلؒ کے کلام کی طرف رخ کرنا اپنے مبلغِ علم کی پہنچ سے بہت بلند خیال کر بیٹھے تھے مگر خدا بھلا کرے سید نعیم حامد علی صاحب کا کہ ان کے تراجم کی مدد سے بیدل جیسے نابغۂ روزگار کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوسکے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ اس قصرِ طلسمات میں داخل ہونا آسان ہے لیکن اس سے باہر نکلنا انتہائی مشکل۔ مجھے پہلی بار جرأت ہوئی کہ میں کلامِ بیدل کو سید نعیم حامد علی کے تراجم کے حصار سے نکل کر مزید بھی مطالعہ کروں۔ میں زندگی میں کبھی خیال کرنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میں اور کلامِ بیدل کے حوالے سے سید نعیم حامد علی کے اس چیدہ اور چنیدہ کارنامے پر کوئی تبصرہ قسم کی عبارت آرائی کر سکوں گا۔ کیونکہ بیدل کا کلام ایک ایسی پُراسرار دنیا ہے جس کے اکثر منطقے عوام الناس ہی کے لیے نہیں بلکہ ہمارے انتہائی پڑھے لکھے طبقے پر بھی تاحال منکشف نہیں ہوئے بلکہ میں یہاں یہ لکھنے کی جسارت کروں گا کہ ہمارے یعنی پاکستان اور ہندوستان کے فارسی داں طبقوں کے لیے بھی ان کی حثییت تاحال تاریک براعظم کی سی ہے۔ ہم سب کو سید نعیم حامد علی کا ممنون ہونا چاہیے کہ جنہوں نے اس شجرِ ممنوعہ کے اثمار سے ہماری جھولیوں کو بھر دیا۔ بیدل کے اظہار و بیان کا طنطنہ ہے، عالمانہ شان و شوکت ہے، اندازِ سخن اور ادائیگیِ سخن کی پیچیدگیاں ہیں، خیال آرائی، نکتہ آفرینی، جزئیات نگاری کے ساتھ علوئے تخیل کے ان لازوال نمونوں کو سید نعیم حامد علی نے کس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ اردو کے لباسِ شاعری میں منتقل کیا ہے۔ اور اس احتیاط کے ساتھ کہ حشو و زوائد کے عیب سے ترجمہ بالکل پاک وصاف ہے۔ بیدل کی شاعری کا منظرنامہ اتنا وسیع و بسیط ہے کہ اس میں پوری شریعت و طریقت و حقیقت اُس دور کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، فطری اور علمی و ادبی

رنگوں میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ موضوعات کے تنوع اور ان کی غیر معمولی وسعت نے بھی اس ترجمانی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سید نعیم حامد علی نے جو ترجمانی فرمائی ہے وہ اکثر جگہ سے ترجمانی لگتی ہی نہیں بلکہ حضرت بیدل بہ نفسِ نفیس خود اردو میں منتقل ہوتے نظر آرہے ہیں۔ وہ اس لیے کہ اس ترجمانی کا کوئی پہلو ایسا نہیں کہ لوحِ دل پر نقش نہ ہو جائے اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو کانوں کی راہ نہاں خانۂ دل میں جاگزیں نہ ہو جائے۔ گویا کہ سیّد نعیم حامد علی اپنے قاری کو یہ نوید دے رہے ہیں

گھونگھٹ الٹ دیا ہے عروسِ خیال کا　　ہر سمت جلوہ ہائے معانی کی سیر کر

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص کو ''شخصیت'' نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہر فرد کو انفرادیت میسر آتی ہے بیدل کو قدرت نے وہ ذہن وہ دماغ اور وہ طبّاعی عطا کی تھی جو قدرت کے کارخانے سے صدیوں میں شاذ ہی برآمد ہوتی ہے۔ بیدل شخصیت، انفرادیت، علوئے فکر اور بے مثال طباعی کا لازوال نمونہ تھے وہ شریعت وطریقت وحقیقت کے ترجمانِ برحق تھے وہ ایسی نابغۂ روزگار ہستی تھے کہ جن کے ہاتھ میں گونگے پتھر بولنے لگتے ہیں اور بے جان چیز میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذوق و وجدان کے تحت جس موضوع کو بھی ہاتھ لگایا اس کو کمال کی اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں طائرانِ عقیدت وارادت کا پہنچنا بھی محال تھا مگر حیرت ہوتی ہے کہ سید نعیم حامد علی نے ہاتھ ڈالا تو کس کے کلام کے ترجمہ پر کہ جس کے سمجھنے والے بھی اب ناپید نہیں تو کم یاب ضرور ہیں اور ترجمہ بھی ایسا کہ بکمال سرعت اور بلندی فکر کا جواب بلندی فکر کے ساتھ کہ نقل پر اصل کا گمان گزرے۔ پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ اگر بیدل اپنے دور سے لے کر اس دور تک ایک آفاقی تاثر ایک ہمہ گیر اہمیت اور ایک مافوق الفطرت دماغ کا انعکاس نظر آتا ہے تو سید نعیم حامد علی کا ترجمہ بھی اپنے وقت کا اتنا بڑا کارنامہ نظر آتا ہے کہ یہ ترجمہ اس دور کے لیے ایک مافوق الفطرت دماغ کا انعکاس ہے۔

اپنے دعوے کے ثبوت میں جناب نعیم حامد علی کے چند تراجم بیدل کے اشعار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ لیکن ان کو پیش کرنے سے پہلے یہ سائنسی اصول بھی یاد رکھیے جس کے مطابق ہر توانائی

قوت ترسیل میں تھوڑی بہت ضائع ضرور ہو جاتی ہے ترجمہ کے ذیل میں یہ کمی زبان کی تبدیلی کی وجہ سے ضرور پیش آئے گی اس لیے کہ اردو بیچاری فارسی زبان جیسا طنطنہ اور تجمّر کہاں سے لائے گی۔ اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اگر بیدل کے اشعار کا ترجمہ آپ کو مبہوت و مسحور کر دے تو اندازہ لگایئے کہ بیدل کی فارسی میں کتنی توانائی ہوگی اور اس کے شعر کے تاثر کا کیا عالم ہوگا۔

سیر ایں گلشن غنیمت داں کہ فرصت بیش نیست　　　در طلسمِ خندۂ گل بال و پر دارد بہار

وقت کم ہے سیرِ گلشن کو غنیمت جانیئے　　　خندۂ گل موسمِ گل کا پر پرواز ہے

پیکرت خم کرد پیری از فنا غافل مباش　　　سخت نزدیک است بیدل سجدہ ہا سازِ رکوع

کیا ہے پیری نے جسم کو خم نہیں ہے باب حواس باہم　　　نہ بھول وقتِ فنا کو بیدل رکوع سے ہے قریب سجدہ

آپ "بہار ایجادیٔ بیدل" کو کہیں سے بھی دیکھ لیجیے آپ یقیناً بیدل کے سحر سے نکل کر ترجمے کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ کیونکہ شعر کا اصل مفہوم بے ساختہ و برجستہ مہارت و قدرت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اور ترجمہ کا اہتمام بھی اس سلیقے اور طریقے سے کیا ہے کہ عام قاری کے لیے بیدل جیسے عدق گو کا کلام اتنا آسان کر دیا ہے۔ الخواص کے شاعر کو عوامی شاعر بنا کر اس کے فکر و مفاہیم کو عام قاری کی دسترس تک پہنچا دیا ہے۔ مثلاً بیدل کے یہ اشعار دیکھیے اور ان کے تراجم دیکھیے

سفلۂ کسبِ کمال قدرِ مُربی شکست　　　قطرہ چو گوہر شود بد گہری می کند

نہیں کرتا کبھی کم ظرف عزت اپنے محسن کی　　　نہیں رکھتا صدف کو یاد قطرہ بھی گہر بن کر

قابلِ برقِ تجلی نیست جز خاشاکِ من　　　حسن ہر جا جلوہ پرداز است من آئینہ ام

قابلِ برقِ تجلی صرف میری خاک ہے　　　ہر طرف وہ جلوہ فرما اور میں آئینہ ہوں

امروز قدرِ ہر کس، مقدارِ جاہ و مال است　　　آدم نمی تواں گفت، آں را کہ زر نبا شد

کیا جاتا ہے جاہ و مال سے عزت کا اندازہ　　جو بے زر ہے اُسے اس دور میں انساں نہیں کہتے

عرضِ حالِ بے دلاں را، گفتگو در کار نیست　　گردشِ چشمِ تحیّر ، ہم ادائے مدّعاست
عرضِ حالِ عاشقاں ہے گفتگو سے بے نیاز　　گردشِ چشمِ تحیّر ہے بیانِ مدّعا

بر اُمیدِ وصل مشکل نیست قطعِ زندگی　　شوقِ منزل می کند نزدیک راہِ دور را
وصل کی اُمید پر جینا کوئی مشکل نہیں　　شوقِ منزل کرتا ہے نزدیک راہِ دور کو

چوں فنا نزدیک شد مشکل بود ضبطِ حواس　　در دمِ پرواز بال و پر پریشاں می شود
رہیں اوسان قائم وقتِ آخر غیر ممکن ہے　　دمِ پرواز بال و پر پریشاں ہو ہی جاتے ہیں

کتنی سادگی کے ساتھ کتنا رواں ترجمہ ہے اور کتنا اصل مفاہیم کی روح کو ترجمہ میں ضم کر دیا ہے کہ بیدل کو عام ذہنی سطح تک سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے اور پھر یہ دیکھیے کہ بیدل جس نے عام انسانی رویوں کو زندگی کے تجربوں کو اور انسانی حیات و نفسیات کو موضوعِ شعر بنایا ہے اس کو کس طرح اردو شاعری کا لباس پہنایا ہے یہ دو شعر دیکھیے جو ہمارے روزمرہ کے تجربے ہیں۔

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست　　شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن

بیدل کا یہ شعر روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتا ہے، بہت مشہور شعر ہے اب ترجمہ دیکھیے۔

زندگی پڑ گئی گلے بیدل　　شاد و نا شاد اب تو جینا ہے

اگر دشمن تواضع پیشہ است ایمن مشو بیدل　　بخوں ریزی بود بے باک شمشیرے کہ خم دارد
تواضع سے اگر پیش آئے دشمن خوش نہ ہو بیدل　　کہ شمشیرِ خمیدہ اور بھی خوں ریز ہوتی ہے

شمشیرِ خمیدہ کو دشمن کی تواضع سے کیا عمدہ مثال دی ہے اور روزمرہ کے معمولات میں منافقانہ رویوں سے چوکنا رہنے کی کس خوبصورت انداز سے ترغیب دی ہے۔

بیدل کے شعراور ان کے تراجم کی چند مثالیں آپ نے دیکھیں ، صرف یہی ہی نہیں سید حامد علی الحامد کا یہی ایک کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کتاب ''بہار ایجادیٔ بیدل'' میں بیدل کے منتخب اشعار کا اردو منثور اور منظوم ترجمہ ہی نہیں ہے بیدل کا سراپا بھی موجود ہے۔ سوانح بھی ہے۔ بیدل کے اساتذہ اور ان کے نامور شاگردوں کا تعارف بھی ہے اور پھر ایک اور بڑا کارنامہ جناب نعیم حامد علی نے یہ کیا ہے کہ بیدل پر اب تک پاکستان و ہندوستان کے ادیبوں۔ ۔ جو کچھ تحریر کیا ہے ان کے مضامین کا اجمالی تعارف بھی ہے یہ کتنے دردسر اور تحقیق و جستجو کا کام ہے یہ واقعی وہ ہی جانتا ہے جس نے اس باریک بینی میں اپنے شب و روز صرف کیے ہیں اس عمیق اس گراں قدر کاوش میں مترجم اپنی آگاہی اور خبر کے اس سفر میں کہاں کہاں سے گزرا ہے کتنی لائبریریاں کھنگالی ہوں گی جب کہیں جا کر یہ دُرِ منثور یکجا ہوئے ہیں واقعی قابل داد ہے یہ کارنامہ اور لائق تحسین ہیں سید نعیم حامد علی اپنے اس قابلِ قدر کام مرزا عبدالقادر بیدل پر یہ تحقیقی کتاب مرتب کرنے پر۔ بیدل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دفتر کا دفتر چند الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں اور ہر چند بسا اوقات شعر کا تنگ میدان ان کو مجبور کر دیتا ہے کہ بہت سی درمیانی کڑیوں کو ترک کر دیں لیکن بحیثیت مجموعی وہ اپنے وسیع خیال کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ ذہن سامع از خود ان متروک کڑیوں کو مربوط کر کے مدعا تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اس کی لذت میں غرق ہو جاتا ہے۔

ذات باری کے مظاہر کا تنوع اور باوجود خفا کے اس کا ذرہ ذرہ سے ظہور یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو قریب قریب تمام صوفی شعراء نے بیان کیا ہے لیکن بیدل کی قدرتِ شاعرانہ ملاحظہ کیجیے۔

تجدید ناز آشفتۂ رنگ لباس آرائیست ـــــــ بے پردگی دیوانۂ طرح نقاب افگندنت

وہ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ تیری لباس آرائی کے انداز کا وہ عالم ہے کہ ہر وقت اس سے نیا ناز پیدا ہوتا ہے اور تیری نقاب افگنی کی ادا کا وہ رنگ ہے کہ اس سے زیادہ بے پردگی اور کوئی نہیں ہو سکتی لیکن انہوں نے پہلے مصرعے میں لفظ 'آشفتۂ' اور دوسرے میں دیوانہ کہہ کر شعر کو اس حد تک پہنچا دیا کہ اس سے زیادہ ترقی ناممکن تھی۔ یہ تجدید کے متعلق یوں کہنا کہ وہ رنگ لباس آرائی کی فریفتہ ہے اور بے

پردگی کو "طرح نقاب افگنی" کا دیوانہ کہنا مضمون کو جس قدر بلند کر دیتا ہے ارباب ذوق سے مخفی نہیں۔

ہر چند کہ بیدل کے رنگ شاعری پر لکھنے کا یہ کوئی موقع نہیں لیکن بیدل کی اس مخصوص صفت کو میں نے ان تراجم میں جگہ جگہ مطالعہ کیا اس لیے چند الفاظ سے اپنا خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوا۔

بیدل کے یہاں دقت پسندی اور بلند پروازی اس حد تک چھائی ہوئی ہے کہ انہوں نے نثر و نظم کا انداز ہی بالکل بدل دیا ہے۔ اور وہ جدید اسلوب اختیار کیا ہے جو اس سے قبل فارسی شاعری میں رائج نہیں تھا۔ بیدل انتہائی پُر گو شاعر تھے صاحب تذکرہ 'سرخوش' لکھتے ہیں کہ میں نے انکے کلیات کا وزن کیا تو پندرہ سیر نکلا۔

یہاں تک تو بات مکمل ہوئی ہے اس گرانقدر تحقیقی کام پر یعنی کتاب 'بہار ایجادی بیدل' پر۔ مگر ہم جب دیکھتے ہیں کہ بیدل وہ ہستی ہیں جن کے خوشہ چینوں میں ہمارے صفِ اوّل کے دو بڑے نام شامل ہیں یعنی غالب اور اقبال تو اور بھی بیدل کی عظمتوں اور رفعتوں تک پہنچنے کے لیے طبیعت بے قرار ہوتی ہے اول اول غالب نے ریختہ میں بیدل ہی کے تتبع کی کوشش کی مگر یہ ضرور ہوا کہ آخر کار منزل کی دشواریوں کے پیش نظر اپنا جادہ ہی بدل دیا۔ اس سلسلے میں غالب کا اپنا موقف کیا ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ساز پر رشتہ پے نغمۂ بیدل باندھا

غالب نے بیدل کے رنگ سخن کو بے حد پسند کیا آخری دو شعر اس بات کے گواہ ہیں مگر پہلا شعر جو لازمی اس تجربے کے بعد کہا گیا ہے اور جس میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ بیدل کا تتبع غالب کے بس کی بات نہیں۔ مگر غالب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ غالب نے اکثر جگہ

ریختہ میں بیدل کا تتبع کیا ہے مثلاً

غرورِ ضبط وقتِ نزع ٹوٹا بیقرارانہ　　نیازِ بال افشانی ہوا صبرِ وشکیب آخر

پیانہ وسعت کدہ شوق ہوں اے اشک　　محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیب گلشنِ ؛ آفریدہ ہوں

شوق سامانِ فضولی ہے وگرنہ غالب　　ہم میں سرمایۂ ایجاد تمنا کب تھا

ہوں قطرہ زن بوادیٔ حسرت شبانہ روز　　جز تارِ اشک جادۂ منزل نہیں رہا
جاندادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے　　یاں عرصۂ تپیدنِ بسمل نہیں رہا

اور وہ غزل بھی دیکھئے جس کے مقطع میں غالب نے رنگِ بیدل کی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

فضائے خندۂ گل تنگ وذوقِ عیش بے پروا　　فراغت گاہِ آغوش وداعِ دل پسند آیا
ہوئی جس کو بہار فرصتِ ہستی سے آگاہی　　برنگ لالہ جام بادہ بر محمل پسند آیا
سواد چشم بسمل انتخاب نقطہ آرائی　　خرام ناز بے پروائی قاتل پسند آیا
اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے　　مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

یہ ساری غزل غالب نے بیدل کے رنگ میں کہی تھی جس کا اعتراف انہوں نے خود مقطع میں کیا ہے پھر غالب کے یہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بیدل کے رنگ ہی کو نہیں انہوں نے بیدل کے اشعار کے مفاہیم کو بھی اپنے اشعار میں منتقل کیا ہے۔ مثلاً بیدل کا شعر ہے

حسنِ مطلق داشتم خود بیم آئینہ کرد　　ایں قدر باہم اثر بیہودہ است اوہام را

مرزا غالب فرماتے ہیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بیدل کا شعر ہے

دریا است قطرہ کہ بدریا رسیدہ است جز ما کسے دگر نتواند بما رسید!

مرزا صاحب کے ہاں دیکھئے یہی خیال ہے "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا"

بیدل کے اشعار ہیں

محیط است چوں محو گردد حباب زخود گم شدن جزو را کل کند

پیشتر آشوب کثرت وحدتے ہم بودہ است یاد آں موجے کہ در بیرونِ ایں دریا زدیم

مرزا صاحب فرماتے ہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

بیدل کا شعر ہے

آب گہریم و خونِ یاقوت داریم بروئے خود چکیدن

مرزا صاحب کا شعر ہے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

بیدل فرماتے ہیں کہ عالم خلق میں بہتر سے بہتر چیز کو لے لیں مثلاً گوہر دیا قوت لیکن ان کا بھی حال یہ ہے کہ اس کا عجز اس کی حالت سے ظاہر ہے 'داریم بروئے خوں چکیدن' مگر غالب دل

کی تخصیص کر کے بساطِ عجز کے صرف ایک محدود و مخصوص منظر کو سامنے لائے ہیں اس کے برعکس بیدل کوئی تعین نہیں کرتا بلکہ وہ تمام عالم وجود سے بحث کرتا ہے اور بہت ہی مختصر الفاظ میں اور بڑی شدید قوت کے ساتھ اپنا مفہوم واضح کر دیتا ہے۔ دیکھئے بیدل اپنے تصور کو اپنے خیالوں کو شعر کا جامہ اس انداز میں پہناتا ہے کہ مختصر الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد کر دیتا ہے مثلاً کسی صحبتِ گذشتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ما ہم از گلشنِ دیدار گلے می چیدم　　ہر کجا آئینہ بنید مرا یاد کنید

اپنے ایک دوست سے بذریعہ خط مخاطب ہے اور انداز یوں اختیار کیا ہے۔

شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وا می شود　　قطرۂ ما می رسد جائے کہ دریا می شود

مولانا رومؒ کو اقبالؒ نے جا بجا اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہے پیر رومیؒ کے علاوہ اقبال، بیدل سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور ایک طرح سے ان سے رہنمائی کے خواہاں بھی۔ انہوں نے بیدل کو اپنا مرشد کامل بھی تسلیم کیا ہے۔ بیدل کا بہت مشہور شعر ہے۔

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است　　ہر چند عقلِ کُل شدۂ بے جنوں مباش

اردو میں ذرا تھوڑا مختلف انداز ہے مگر خیال یہی ہے اقبال فرماتے ہیں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بیدل کے فلسفے میں حرکت اور عمل کا پہلو اکثر نمایاں نظر آتا ہے اقبال، بیدل کے اِسی فلسفہ کی وجہ سے ان سے متاثر نظر آتے ہیں بیدل کا ایک شعر ہے۔

موجِ دریا را بہ ساحل ہم نشینی مشکل است　　بیقراراں نذرِ منزل کردہ اند آرام را

اب اس بازگشت کو اقبال کے ان اشعار میں دیکھیے

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

بیدل کے کلام کے بعض اور عناصر میں اقبال سے فکری ہم آہنگی ملتی ہے مثلاً معرفت خودی۔

"بانگ درا" کا وہ بند پیش نظر رکھیے جو اس مصرع سے شروع ہوتا ہے۔

؎ 'آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا'

اور اس کے بعد بیدل کی یہ غزل دیکھیے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

پئے نافہ ہائے رمیدہ بو، مپسند زحمتِ جست و جو بخیالِ حلقۂ زلف او گرہے خورد بہ ختن درآ

نفست اگر نہ فسوں دہد بہ تعلقِ ہوسِ جسد رہِ دامن تو ہمی کشد کہ دریں رباطِ کہن درآ

مرزا عبدالقادر بیدل کا شعر ہے

باطنِ ایں خلق کافر کیش، با ظاہر مسیح جملہ قرآں در کنار و صنم در آستیں

اور علامہ اقبال نے بھی اس مضمون کو اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔

؎ "اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں"

علامہ اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں

تعلیمِ پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور　　مجھ پر کیا ہے مرشدِ کامل نے راز فاش

"باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است　　ہر چند عقلِ کُل شدۂ بے جنوں مباش"

یہ آخری فارسی کا شعر بیدل کا ہے جن کے لیے اقبال نے کہا ہے 'مجھ پر کیا ہے مرشدِ کامل نے راز فاش'۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال صرف بیدل کی شاعری ہی سے نہیں بلکہ ان کے فلسفہ حیات اوران کے مقام معرفت کے بھی قائل تھے اس لیے کہ بیدل صوفی مشرب شخصیت تھے بیدل نے پہلے شیخ کمال قادری اور پھر شاہ ملوک کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کیں۔ وہ اس راہ کے راہی ہی نہیں ایک بہت بڑی صاحب مقام ہستی تھے بیدل نے سلوک کی منزلیں بڑی پا مردی کے ساتھ طے کیں اور کئی اولیاء کرام سے کسب فیض کیا جن میں شاہ فاضل مولانا عبدالعزیز عزت اورشاہ قاسم ھواللہی بہت اہم ہستیاں ہیں۔ ان کا تمام کلام عشق الٰہی اور حُبِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے وہ جلال وجمال کے مالک، حال وقال کی راہ کے مسافر اور بڑے عالی ہمت صاحب ورع و تقویٰ تھے ان کے یہاں جو دنیا سے بے تعلقی کا رنگ شاعری میں نظر آتا ہے یہ سب اسی بے نیاز کی نیازمندیوں میں گم ہوجانے کا کرشمہ ہے۔ عشق کی سرشاریاں انہیں نفسانی خواہشات سے بے نیاز کرگئیں۔ ذکروفکر کی کثرت سے ان کا آئینہ قلب اتنا صاف وشفاف ہو چکا تھا کہ وہ اپنے اندر ہی ایک عالم کی سیر میں مصروف رہے ان کی حیوانی جبلتوں پر ملکوتی صفات کا غلبہ رہا یہ سب انکو باکمال اولیاءاللہ کی صحبت سے نصیب ہوا۔ مجاہدہ ومشاہدہ اوروصال ہی ان کی منزلیں تھیں ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور اہل دنیا میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی عشق حقیقی کا بڑا گہرا رنگ ان کے قلب وروح پر محیط تھا اس دنیا کی حقیقت ایسے لوگوں کی نظر میں کچھ نہیں جو فنا کی منزلوں کے مسافر ہوتے ہیں۔ جن کی نگاہوں میں خلاقِ ذوالجلال کا جلال سما جائے اور یہی کیفیت ان کا حال بن جائے پھر دنیا سے ان کا دل بالکل سرد ہوجاتا ہے اوراس دنیا کی ان کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش　　من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

بے نیازانہ بہار باب کرم می گزرم　　　　چوں سیہ چشم بہر سُرمہ فُروشاں گزرد

مرزا عبدالقادر بیدل نہایت قوی الاعضا اور زبردست قد وقامت کے انسان تھے جوانی میں ساتھ سیر اور ضعیفی میں ڈھائی سیر غذا ہضم کر لینا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کی آہنی جریب کا وزن ۳۶ سیر شاہجہانی تھا یعنی ایک من سے زیادہ وزن کا توان کا عصا تھا۔ باوجود زہد وتقوی اور سلوک کی منزل کے راہی ہونے کے ریش و بروت صاف رکھتے تھے۔ خزانہ عامرہ میں ان کی وفات کے بعد کا ایک واقعہ لکھا ہے میر عبدالوالی عزلت سورتی ایک مرتبہ بیدل کے عرس کے موقع پر ان کے مزار پر گئے تو دیکھا کے شاہجہاں آباد کے اکثر شعرا کا ہجوم ہے اور وہیں ان کا کلیات رکھا ہوا ہے انہوں نے اس نیت سے کہ یہ دیکھیں مرزا کو میرے آنے کی خبر ہوئی یا نہیں۔ کلیات کھولا تو اس صفحہ کا پہلا ہی شعر تھا۔

چہ مقدارِ خوں در عدم خوردہ باشم　　　　کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا عبدالقادر بیدل اپنے عہد کے نہ صرف بے مثل شاعر تھے بلکہ صاحب باطن بھی اسی درجے کے تھے جس کا ثبوت میر عبدالوالی کے اس واقعہ سے زیادہ ان کے کلام سے مل سکتا ہے اس کتاب کی طباعت کے بارے میں سید بابر علی صاحب بے حد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ پیسہ تو بہت سوں کے پاس ہے مگر ایسے تعمیری اور خالص علمی وادبی کام پر خرچ کرنے کا حوصلہ شاید ہی کسی کو میسر آیا ہو یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی طلب کی بات ہے کہ سید بابر علی کے تموّل کے توسّل سے لاتعداد اہل شوق بیدل شناسی سے فیضیاب ہوئے اور بیدل کے عرفان وآگہی کی وسعتوں میں گم ہونے کے نشے کی سرشاریوں سے معمور ہوئے۔ بیدل کے معنی ومفاہیم کو عام کرنے کے لیے جناب بابر علی کی ہمت کو داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اس کتاب ''بہار ایجادیٔ بیدل'' کی طباعت بڑے سلیقے، طریقے اور نفاست سے عمل میں آئی ہے۔ بابر علی صاحب نے زر کثیر صرف کیا ہے بہترین کاغذ، طباعت اور خوبصورت جلد کا اہتمام کر کے اہلِ سخن کے دل جیت لیے۔ اور کئی صدیوں کے بعد اہلِ فکر ودانش کو بیدل تک دسترس بہم پہنچائی ہے۔

غلام ابن سلطان

دکن میں اردو ادب کا ارتقا

۷۱۲ء میں جب محمد بن قاسم نے سندھ کے علاقے میں پیش قدمی کی تو برعظیم میں ایک نئی تہذیب وثقافت کی آمد کی نوید ملی۔ عربوں کی آمد کے ساتھ ہی ملتان، اُچھ، شورکوٹ اور منصورہ کو اہم علمی مراکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ آفتاب اسلام کی ضیا پاشیوں سے جنوبی ہند میں تاریکیوں کا کافور کرنے کے جس سلسلے کا آغاز ہوا اس سے گجرات میں بھی روشنی کے عظیم الشان سفر کا آغاز ہوا۔ جنوبی ہند کی طرح گجرات کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں گجرات کی اپنی ایک انفرادیت رہی ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں گجرات کے کچھ علاقے ایرانی حکومت میں شامل تھے۔(۱) گجرات کو ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت سے ممتاز مقام حاصل تھا۔ ۷۸۶۸۷ مربع کلومیٹر پر مشتمل یہ ریاست اپنے سولہ سو کلومیٹر کے ساحلی علاقے کی وجہ سے زمانہ قدیم سے تجارتی مرکز رہی ہے۔ بحرین، مصر اور خلیج فارس کے ممالک کے ساتھ گجرات کے تجارتی تعلقات کا عرصہ ۱۰۰۰ اسے ۷۵۰ قبل مسیح پر محیط ہے۔ اس علاقے کی تہذیب وثقافت، فنون لطیفہ اور ادبیات پر بیرونی اقوام کے اثرات نمایاں ہیں۔ گجرات کی حدیں سندھ سے ملتی ہیں۔ سندھ پر بنوامیّہ نے ۳۹ سال حکومت کی اس کے بعد ایک صدی تک اس علاقے میں بنوعباس کی حکومت رہی اس کے بعد بھی یہ علاقہ عربوں کے زیر نگیں رہا۔ مجموعی طور پر سندھ میں عربوں کی حکومت کا عرصہ ۲۸۲ سال ہے(۲) تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ ہجری میں عباسی خلیفہ متوکل نے عمر بن عبدالعزیز ہباری قریشی کا تقرر بہ حیثیت حاکم سندھ کیا۔ مقامی حالات اور سیاسی نشیب وفراز کے تحت اس عرب خاندان نے خودمختاری حاصل کرلی اور اس کا تعلق بغداد کی حکومت سے برائے نام تھا۔ اس خاندان کی حکومت نے پڑوسی ریاستوں کے ساتھ نصف صدی تک قریبی تعلقات استوار اور قائم رکھے۔ سندھ ملتان اور گجرات کے علاقوں میں تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی

تھیں علم وادب پر اس کے ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ شمالی ہند کے مقابلے میں گجرات اور دکن کے علاقوں میں ان تبدیلیوں کے اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ گجرات میں سلطان محمود غزنوی، سلطان معزالدین محمد بن سام غوری، قطب الدین ایبک اور علاؤالدین خلجی کی مہمات کی وجہ سے حالات کی کایا پلٹ گئی۔ سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور معاشرتی سطح پر ایک نئے نصب العین اور ایک نئی سوچ کی راہ ہموار ہو گئی۔ تخلیقی سوچ پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ایک منفرد احساساتی کیفیت کو نمو ملی۔ نئے لسانی عمل کا آغاز ہوا جس کے اعجاز سے تخلیق فن کے لیے نئے تجربات، نئے اسالیب اور نئے موضوعات کے بارے میں سوچ پروان چڑھنے لگی۔

برصغیر کی جغرافیائی تقسیم کچھ اس طرح کی ہے کہ دریائے نرمدا (Narmada) اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ میکالا رینج (Maikala Range) سے نکلنے والا یہ دریا جو مشرق سے مغرب کی جانب رواں دواں ہے ہندوستان کے بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ اس دریا کی لمبائی ۱۲۸۹ کلومیٹر ہے اور یہ مدھیہ پردیش، گجرات اور مہاراشٹر سے گزرتا ہے۔ اس دریا کے اس پار کے جنوبی علاقوں کو دکن کہا جاتا ہے۔ برصغیر کو شمال اور جنوب کے دو حصوں میں تقسیم کرنے میں دریائے نرمدا کے علاوہ وندھیا رینج (Vindhya Range) کا سلسلۂ کوہ بھی جغرافیائی تبدیلیوں کا امین ہے۔ یہ سلسلۂ کوہ جو مغرب میں گجرات تک ہے مشرق میں راجھستان اور مدھیہ پردیش تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰۸۶ کلومیٹر ہے۔ یہ ایک واضح جغرافیائی تقسیم ہے جس نے ہر شعبۂ زندگی پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اگر اردو زبان وادب کے ارتقا پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ تاریخی اعتبار سے جنوبی ہند میں اردو زبان نے پہلے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ جنوبی ہند کے علاقوں گجرات اور دکن میں جس وقت اردو شاعری کا آغاز ہوا، اس وقت شمالی ہند میں اس کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ دکن میں اردو شاعری کا آغاز بہمنی عہد (۱۳۴۶۔۱۵۲۷) میں ہو چکا تھا۔ اس عہد کی ادبی تاریخ کی تخلیقات بشمول سوانح اور بیش تر ادب پارے ابلق ایام کے سموں کی گرد میں اوجھل ہو چکے ہیں۔ بہمنی عہد میں تخلیق ہونے والے اردو زبان کی شاعری کے اولین نمونے جن کی

مدد سے اردو شاعری کے ارتقا کی حقیقی صورت حال کے بارے میں آگاہی ملتی ہے ان کی تعداد بہت کم ہے۔ دکن میں اس زبان میں تخلیق ہونیوالی شاعری کے ابتدائی نمونے اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اردو شاعری کا ہیولیٰ یہیں سے اٹھا تھا۔ خواہ اسے کسی نام سے پکارا جائے یہ اردو شاعر کا نقش اول ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر گجرات میں اردو شاعری کے اولین نمونوں کو گجری یا گجراتی زبان کی شاعری کے نمونے قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اپنی اصلیت کے اعتبار سے یہی اردو شاعری کی ابتدائی شکل ہیں۔ بہمنی دور میں دکن کو اہم تجارتی اور علمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی تاہم اس عہد کی کوئی قابل ذکر تصنیف اب دستیاب نہیں۔ اس عہد کے ایک ممتاز ادیب عین الدین گنج العلم کا نام مختلف تذکروں میں ملتا ہے لیکن اس کی کسی ایسی تصنیف کا سراغ نہیں مل سکا جو زبانِ دکنی میں ہو۔ اس دور کی اولین اور اہم ترین تصنیف جس تک ادب کے طلبا کی رسائی ہے وہ فخر الدین نظامی کی تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" ہے مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عرصۂ اقتدار (۱۴۲۱۔۱۴۳۴) میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کا اہم ترین موضوع سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد حکومت کے اہم واقعات اور معاملات سلطنت ہیں۔ اس مثنوی میں سیاسی نشیب و فراز، معاشرتی زندگی کے ارتعاشات اور سماجی مسائل کے بارے میں تاریخ کے مسلسل عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی مہارت سے لفظی مرقع نگاری کی گئی ہے۔ اس میں صدا آفرینی کو جو کیفیت ہے اس کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے اس عہد کے حالات نے تہذیبی اور ثقافتی زندگی اور فنون لطیفہ پر جو اثرات مرتب کیے ان کے بارے میں یہ مثنوی ایک اہم ماخذ ہے۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار — پرت پال، سنسار، کرتا ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ — کنور شاہ کا شاہ احمد بجنگ
لقب شہ علی آل بہمن ولی — وہ تھی ہی بہت بدھ تد آگلی

اس مثنوی میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ چھ سو سال قدیم ہے۔ اتنی قدیم زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو آج کے دور میں سمجھنا بلاشبہ ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مثنوی میں اسلوب کے دو پہلو قابل توجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ تخلیق کار نے "ہندوی اثرات" کو اپنے اسلوب میں پوری آب و تاب سے جگہ دی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس مثنوی میں فارسی زبان اور اس کا لہجہ واضح طور پر موثر دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح اسلوب میں ایک دھنک رنگ کیفیت سامنے آتی ہے۔ لسانی ارتقا ایک مسلسل عمل ہے۔ گردش ماہ و سال کے نتیجے میں زبانیں بھی اپنے ذخیرۂ الفاظ میں ردو بدل اور ترک و انتخاب کے مرحلے سے گزرتی رہی ہیں۔ نئے نئے خیالات، متنوع اسالیب اور نئی زبانوں کے الفاظ کے اشتراک عمل سے ایک قوس قزح کا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے۔ لسانی ارتقا کی یہ کیفیت جہاں تخلیق کار کی ذاتی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے وہاں اس کے مطالعہ سے اقتضائے وقت کے مطابق عصری آگہی کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ مثنوی کے تخلیق کار نے اپنا پورا نام اور تخلص اپنی تخلیق میں متعدد مقامات پر لکھا ہے۔

تخلص سو فیروز ہے بے دری   مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری

بہمنی دور میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں پائے جانے والے درج ذیل تین رجحانات قابل توجہ ہیں جن کی عکاسی اس عہد کے اہم تخلیق کاروں کے اسلوب میں ہوتی ہے:

۱   زیادہ تر تخلیق کاروں نے شعور اور غور و خوض سے یہ کوشش کی کہ عجائبات فطرت، عبرت آموز واقعات، لوک داستانوں، قصوں، کہانیوں، انوکھی باتوں یا دلچسپ موضوعات کو پُرلطف انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھال کر قارئین ادب کے لیے سکون قلب اور مسرت کے فراواں مواقع پیدا کیے جائیں۔

۲   بہمنی عہد کے اکثر تخلیق کاروں کی توجہ مذہبی اقدار و روایات، تاریخی واقعات اور سبق آموز حکایات کو شاعری میں سمونے پر مرکوز رہی۔

۳ بہمنی عہد کے تخلیق کاروں کے اسلوب میں مذہب سے وابستگی کا عنصر غالب رہا۔ انھوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ تصوف اور مذہبی رشد وہدایت کے اہم موضوعات کو شاعری کے وسیلے سے قارئین تک پہنچایا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعری ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو قارئین ادب تک ان کے خیالات کی ترسیل پر قادر ہے۔ تخلیق فن کے لمحوں میں بہمنی دور کے تخلیق کاروں نے ادب کے وسیلے سے مسرت وشادمانی کے حصول کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا ان کے ادب پاروں میں ان کی شخصیت کے اہم پہلو پوری طرح سما گئے ہیں۔ ان کے شخصی وقار نے تخلیقی عمل کو بھی اسی حسین رنگ میں رنگ لیا۔ اس عہد کی مشہور اور مقبول مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں تخلیق کار کے اسلوب میں پائے جانے والے رجحانات. کی چند مثالیں پیش ہیں، ان کے مطالعہ سے لسانی ارتقا کے مختلف مدارج کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے۔

سنیا تھا کہ ناری دھرے بہت چھند سو میں آج دیٹھا تری چھند پند

بڑے ساچ کہہ کر گئے بول اچوک دودھا دودکا چھا چھا پیوے پھوک

مجھے مارناں مار کے گھال دے ولے آج اکھر مارنیکال دے

جو کچ کل کرنا سو توں آج کر نہ گھال آج کا کام توں کال پر

بھلائے کوں بھلائی کرے کچ نہ ہوئے برے کوں بھلائی کرے ہوئے تو ہوئے

نظامی کی ایک اور مثنوی ''خوف نامہ'' ہے۔ اس مثنوی میں تخلیق کار کے اسلوب میں ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ پہلی مثنوی کی نسبت اس دوسری مثنوی میں نظامی نے سادہ، سلیس اور صاف لہجہ اپنایا ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے حیات بعد الموت کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے قاری کو روز محشر کے بارے میں مذہبی روایات سے مطلع کیا ہے۔ قیامت کے دن اعمال کی بنا پر جزا اور سزا کا نہایت موثر اور دل نشیں انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر نے اپنے ناصحانہ اسلوب کے

ذریعے قاری کو اخلاقیات کا درس دیا ہے۔ اس مثنوی میں تعلیم کو اولین ترجیح سمجھتے ہوئے شاعر نے افراد کے اعمال کی اصلاح کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا ہے۔ اس مثنوی میں تفریح کے بجائے تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ رفعت تخیل اور جذبات کی صداقت اس شاعری کے اہم وصف ہیں:

نہ بھائی کوں بھائی مدگار ہوئے — نہ کوئی یار کوں یار غم خوار ہوئے
میاں کوں نہ کوئی بھی آوے غلام — گواہ دیون اس وقت اعضا تمام
یہی وقت اچھے گا ہر یک تن اپر — کہ بھویں پھاٹے نین جو سینے بھتر

شاعری میں علاقائی بولیوں اور مروج زبانوں کے الفاظ کا استعمال اس زمانے میں عام تھا۔ تخلیق کار اس بات کے آرزومند تھے کہ وہ تخلیق فن کے لمحوں میں زندگی کے بارے میں بدلتے ہوئے تقاضوں، متغیر اقدار، روایات اور نئے حقائق کو پیرایہ اظہار عطا کر سکیں۔ حسن شوقی کی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' (۱۵۶۴) اور اشرف بیابانی (۱۵۲۸-۱۴۵۹) کی مثنوی ''نوسر ہار'' اس عہد میں زبان و بیان کی ارتقائی کیفیت کی مظہر تصانیف ہیں۔ اشرف بیابانی اپنی تصانیف ''واحد باری'' اور ''قصۂ آخرالزماں'' کی شاعری میں استعمال ہونے والی زبان کو ہندی یا ہندوی کا نام دیتا ہے۔

ایک ایک بول یہ موزوں آن — تقریر ہندی سب بکھان

تخلیقی اعتبار سے دیکھیں تو تخلیق ادب کے یہ معائر جہاں نئے حقائق کے مظہر ہیں وہاں ان کی وجہ سے جمود کا خاتمہ ہوا اور نیا لسانی نظام وجود میں آنے کے امکانات روشن ہوتے چلے گئے۔ اس عہد کے ایک شاعر میراں جی شمس العشاق (م:۱۴۹۴) نے اپنی شاعری میں تصوف کے موضوع پر نہایت دلنشیں انداز میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ بہمنی عہد میں ان شعرا کی کاوشوں سے اردو کو پورے دکن میں زبردست پذیرائی نصیب ہوئی۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ بہمنی عہد میں تخلیق ادب کے سلسلے میں پورے دکن میں صرف اردو ہی واحد مشترک زبان تھی

جس میں تخلیق کار پرورش لوح وقلم میں مصروف تھے۔ دکن کے اہل قلم نے اردو نثر میں بھی سب سے پہلے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ اخلاق وتصوف کے موضوعات پر اس عہد میں چند رسائل منصۂ شہود پر آئے۔ ان رسائل کے مصنف شیخ گنج العلم ہیں۔ یہ رسائل بہمنی خاندان کے عہد میں دکن کی سرزمین سے تصنیف ہوئے۔ میراں جی شمس العشاق کی موضوعاتی نظمیں خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق اور مغز مرغوب اس زمانے میں زبان زد عام تھیں۔ ذیل میں بہمنی عہد کے شاعر میراں جی شمس العشاق کی تصنیف ''شہادت التحقیق'' سے ایک اقتباس پیش ہے۔ اس اقتباس کے مطالعہ سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ نئی زبان نے پرانی مروج زبان سے اس لیے برتری حاصل کی کہ اس نئی زبان میں قاری کے لیے افادی پہلو نمایاں تھا۔ اس کے برعکس شمالی ہند میں ابھی اُردو نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی جس قدر وہ دکن میں کر چکی تھی۔ دکن میں رونما ہونیوالی لسانی تبدیلیاں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ زبان کی سطح پر ذخیرۂ الفاظ اور علاقے کی دوسری بولیوں اور زبانوں کے امتزاج وانجذاب کا جو تجربہ اس خطے میں کیا جا رہا تھا اس کے معجز نما اثر سے لسانی شعبے میں ایک دوررس تبدیلی کے رونما ہونے کے امکانات روشن تر ہوتے چلے گئے۔ اس زبان میں جو پیرایۂ اظہار اپنایا گیا ہے وہ اپنی لطافت اور احساس ترفع میں اپنی مثال آپ ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر یہ ایک مثبت تبدیلی کی نوید ہے۔

اللہ، محمدؐ، علیؓ، امام، دائم ان سوں حال	سب خاصوں سوں اللہ اللہ توں رکھوں کیا کمال
مغز مرغوب دھریا جانو اس نسخے کا نام	مرشد موکھوں سمجھے تو ہوئے کشف تمام
نفی غیر پر لا کرے، الا اللہ اثبات	پرتی بدھ اٹوپی ناباج کرو کی بات

میراں جی شمس العشاق کی زندگی ہی میں بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ حکمرانوں کی بے بصری کے باعث انتشار، خانہ جنگی اور باہمی افتراق نے سیاسی عدم استحکام پیدا کر دیا۔ معاشرتی زندگی میں ظالم وسفاک، موذی ومکار استحصالی طبقے کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

مجبوروں اور مظلوموں کی زندگی اجیرن کردی گئی۔ اس طوائف الملو کی، انتشار اور لاقانونیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قومی یک جہتی عنقا ہوگئی اور پوری سلطنت پانچ ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ یہ انتشار، بیدر، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ اور برار کی خود مختار ریاستوں کے قیام پر منتج ہوا۔ ہر ریاست میں الگ الگ نظام سلطنت قائم ہوگیا۔ ان میں سے دکن کے مغرب میں واقع بیجاپور میں عادل شاہی حکومت (عرصۂ اقتدار (۱۶۸۶۔۱۴۹۰) کے عہد میں اردو زبان کو بہت فروغ ملا۔ اسی عہد میں مشاعروں کے رجحان نے تقویت پکڑی جس نے بعد میں ایک مضبوط و مستحکم روایت کی صورت اختیار کرلی اور ان عصری رویوں اور رجحانات نے شمالی ہند میں بھی مقبولیت حاصل کرلی۔ اس عہد کی دکھنی زبان میں تخلیقی عمل جاری رہا اور اس میں تیزی آنے لگی بہمنی عہد میں دکھنی زبان کے فروغ کے لیے جو مساعی کی گئیں عادل شاہی دور میں وہ ثمر بار ہوئیں۔ دکھنی اردو میں تخلیق ادب پر توجہ مرکوز رہی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی (عرصہ اقتدار: ۱۶۲۷۔۱۵۸۰) اپنی غریب پروری، علم دوستی، ادب پروری اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی وجہ سے "علت گرو" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے اردو کی سرکاری سطح پر سرپرستی کی اور حکومتی کاموں، دفتری امور، اور ریاستی اداروں میں اردو زبان ہی مستعمل تھی۔ اس زمانے میں ریاست گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت (عرصہ اقتدار: ۱۶۸۷۔۱۵۸۱) قائم تھی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور میں اردو زبان و ادب کی نمو، نشو و ارتقا پر بھرپور توجہ دی گئی۔ گولکنڈہ کے حاکم اور اس عہد کے ممتاز ادیب اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور عظیم تخلیق کار سلطان محمد قلی قطب شاہ (پیدائش: ۱۵۶۵ وفات: ۱۶۱۱) نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں جو اہم کردار ادا کیا وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اس کی دریا دلی، فیاضانہ علم دوستی کی وجہ سے اسے بہت مقبولیت نصیب ہوئی۔ اردو، فارسی اور تلنگی کے علاوہ کئی مقامی زبانوں پر خلاقانہ دسترس رکھنے والے اس نابغۂ روزگار تخلیق کار نے پچاس ہزار سے زائد اشعار لکھ کر جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کردیا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا تخلص "معانی" تھا۔ اردو زبان میں اسے پہلے صاحب کلیات شاعر کی حیثیت سے امتیازی مقام حاصل ہے۔ ۱۰۲۰ ہجری میں اس کا

دیوان مکمل ہوا جس کا منظوم دیباچہ عبداللہ قطب شاہ نے تحریر کیا۔ ۲۱ منظوم دیباچے کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

رہیا جائے نا شاعراں من منیں　　بن آکے صفت شعر ۔ فن سئیں
جو خاصا ہے یو شاعراں کا ہر ئیک　　نہ ریں بن کہے وصف، بتیاں کیتک
مگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار　　دہرے وصف ایس ۔ ہن بہت عار

قلی قطب شاہ کے دربار میں اس عہد کے متعدد نامور ادیب، شاعر اور دانش ور موجود تھے۔ ان میں میر محمد مومن، ملا وجہی اور غواصی کے نام قابل ذکر ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو لسانی تجربہ کیا اس کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے تخلیقی عمل میں کئی تہذیبوں کا سنگم دکھائی دیتا ہے۔ ایک زیرک تخلیق کار کی حیثیت سے اس نے ایرانی، عربی اور مقامی تہذیب و ثقافت کے درخشاں پہلوؤں کو اپنے فکر و فن کی اساس بنایا۔ اس کے تخلیقی عمل میں فارسی شاعری کی روایت اور اسالیب پر توجہ مرکوز رہی۔ اس نے علم عروض، صنائع بدائع بالخصوص تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے سلسلے میں بالعموم فارسی زبان کی روایات کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کی شاعری میں اس عہد کی تہذیب و معاشرت کی حقیقی تصویر جلوہ گر ہے۔ جہاں تک حسن و رومان اور عشق و محبت کے موضوع کا تعلق ہے قلی قطب شاہ نے یہاں ہندی روایت کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے اظہار محبت، اور پیمان وفا باندھنے کے سلسلے میں ہندی روایت ہی کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ عشق کی ہندی روایت میں محبت کا اظہار سب سے پہلے عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ محبت کے دشت پر خار میں جب آبلہ پا مسافر کی طرح صدائے جرس کی جستجو میں بھٹک کر سرابوں اور سکوت کے صحرا میں آہ و فغاں کرتی ہے تو یہ بات قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ حریف اور رقیب کے ستم تو حرف حرف بیان کیے جا سکتے ہیں مگر عاشق کی کج ادائی اور بے وفائی خون کے آنسو رلاتی ہے۔ قلی قطب شاہ کے

اسلوب کو سمجھنے کے لیے اس کے چند اشعار پیش ہیں:

پیا کس سوں گمائی رات ساری تمن انکھیاں میں پائی میں خماری
پیاباج پیالہ پیا جائے نا پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہتے تھے پیا بن صبوری کروں کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شاہ نہ دے مج دوانے کوں پند دوانے کوں کج پند دیا جائے نا

سلطان محمد قلی قطب شاہ کو سراپا نگاری میں کمال حاصل تھا۔ اس کے نظام خیال میں سادگی۔ سلاست۔ خلوص اور دردمندی کی فراوانی ہے۔ وہ ہر موضوع پر بے تکلفی سے اظہار خیال کرنے پر قادر ہے۔ اس کے اسلوب میں تصنع اور ریاکاری کہیں موجود نہیں۔ وہ راست گوئی کو شعار بنا کر زندہ وتابندہ خیالات کی اساس پر اپنی ۔ عمری کا قصر عالی شان تعمیر کرنے کی سعی میں مصروف رہا۔ اس عہد کے حالات، احساساتی کیفیات اور خیالات کو جس حسین پیرائے میں اس نے بیان کیا ہے وہ اس کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

پھل بن رخ یار خوش ندیسے بن مد پھلی جھاڑ خوش ندیسے
مری پیاری سہاتی ہے تجھے اپ حسن زیبائی بہت روپ ونت ناریاں ہیں دیا اللہ تج شاہی
عشق میں کرے اپ آشیانہ سچیں تج کو سہاتا ہے اے خانہ
ساقیا آشراب ناب کہاں چند کے پیالے میں آفتاب کہاں
ساری بھنواں تیریاں جوں کی چند اسے دیکھنے میں ہیں عشاق بند
توں سولہ سنگاراں کوں جب پین آئے تجے کون سکلائے اے مست چھند
ہوئے عاشقاں بے خبر دیکھ تج تجھے دیکھ کر پائے عیشاں انند

تمھار حسن سو قدرت تھی روشنی پایا ہوراں کا حتر ے حسن اگنے جیسے چراغ

شراب پھول کھلے تیرے باغ تو خط میں پلاتوں ساقی، سرمست منج کوں یک دوایاغ

برہ کا باؤ منجے باوارا کیا ہے اب صبا کا باؤ معطر کریں توں میرا دماغ

معانی شکر خدا کر، نہ کرتوں غم ہرگز نبیؐ کے ناتوں تھی آتا تو جھے خبی کا سراغ

بہمنی دور کے بعد قطب شاہی دور میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا سلسلہ جاری رہا۔ جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں اس عہد کے تخلیق کاروں نے بڑی محنت اور جگر کاوی کا ثبوت دیا۔ اس عہد کے ادیبوں نے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے قارئین ادب کو اخلاص و مروت کا پیغام دیا۔ گولکنڈہ کے قدیم ادیبوں کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ اس عہد کے اہم تخلیق کاروں کی تخلیقی فعالیت کا اجمالی جائزہ درج ذیل ہے۔

۱۔ ملا خیالی: یہ باکمال تخلیق کار جس نے ۱۵۶۹ تک تخلیقی ادب کی شمع فروزاں رکھی وفات کے بعد گوشۂ گم نامی میں چلا گیا۔ سیل زماں کے تھپیڑوں نے اس کی حیات اور خدمات کو ریگ ساحل پر لکھی تحریر کے مانند مٹا دیا۔ اس عہد کے ممتاز ادیب جن میں نشاطی اور ملا وجہی جیسے صاحب کمال شامل ہیں وہ بھی اسکے ادبی کمالات کے معترف تھے۔ اپنی تصنیف ''پھول بن'' میں ابن نشاطی نے اس عظیم تخلیق کار کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

اچھے تو دیکھتا ملا خیالی یو میں برتیا ہوں صاحب کمال

۲۔ سید محمود: سید محمود کا کلام قدیم اردو کا نمونہ ہے اسے سمجھنے میں کافی مشکل پیش آتی ہے۔ اسے اپنے عہد میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ملا وجہی نے اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے

کہ فیروز و محمود اچتے جو آج　　تو اس شعر گوں بھوت ہوتا رواج

ابن نشاطی نے بھی سید محمود کے اسلوب کو سراہتے ہوئے اس کی حق گوئی اور بے باکی کو بہ نظر تحسین دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ سید محمود نے کبھی مصلحت کی پروانہ کی اور جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ اس کا تجزیاتی انداز لائق تقلید تھا۔ ابن نشاطی نے سید محمود کے بارے اپنے خیالات میں اس کی انصاف پسندی کو اس کی شخصیت کا اہم وصف قرار دیا ہے۔

رہے صد حیف جو نہیں سید محمود　　کتے پانی کوں پانی دودکوں دود

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے بھی سید محمود کے اسلوب کو پسند کیا اور اسے اپنے عہد کا ایک اہم شاعر قرار دیا۔ سید محمود نے مقامی لہجے کو اپنایا اور دکھنی اردو میں اپنا مافی لضمیر بیان کیا۔ قلی قطب شاہ نے اس کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ اس تخلیق کار کے منصب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے:

اگر محمود ہور فیروز بے ہوش ہویں عجب کیا　　ہوئے تج وصف نا کر سک ظہیر ہور انوری بے ہوش

۳۔　فیروز: مشہور شاعر فیروز نے گولکنڈہ میں رہتے ہوئے اردو شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ فیروز کی مثنوی "توصیف نامہ" جو ۱۵۶۵ء سے قبل کی تصنیف ہے، اس عہد کے ادب کی مجموعی صورت حال کے بارے میں اہم معلومات سے لبریز ہے۔ مثنوی "توصیف نامہ" میں فیروز نے اپنے مرشد مخدوم جی (متوفی: ۱۵۶۴ء) کے حضور اپنی عقیدت کے جذبات پیش کیے ہیں۔

مرا پیر مخدوم جی جگ منے　　منگوں نعمتاں میں سدا اس کنے

پیا جیو تھے تو ہمیں پیاس ہے　　تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

وہی پھول جس پھول کی باس توں　　　وہی جیو جس جیو کی آس توں
کریماں کی مجلس کرامت تجے　　　ایناں کی صف میں امامت تجے
جسے پیر مخدوم جی پیاک ہے　　　اسے دین و دنیا میں کیا باک ہے

۴۔ ملا وجہی دکن کے اس نامور ادیب نے ابراہیم قطب شاہ سے لے کر عبداللہ قطب شاہ تک کے عہد حکومت (۱۶۲۵۔۱۵۵۰) چار بادشاہوں کی حکومت کے دوران علم وادب کی شمع فروزاں رکھی۔ اس کی زندگی کے مکمل حالات دستیاب نہیں۔ اس کا انتقال ۱۶۵۶ اور ۱۶۷۱ کے درمیانی عرصے میں ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسے شاہی دربار میں عزت وتکریم سے نوازا اور اسے ملک الشعراء کا منصب عطا کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں ملا وجہی کو نظر انداز کیا گیا اور اس نے کسمپرسی کے عالم میں وقت گزارا۔ ابتلا اور آزمائش کا یہ دور اس خوددار شاعر پر بہت بھاری رہا۔ اس نے ہلاکت خیزیوں کے اس دور میں بھی صبر واستقامت سے کام لیتے ہوئے تخلیق فن پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اس کی مستحکم شخصیت کا نمایاں وصف یہ تھا کہ اس نے اپنی الگ پہچان برقرار رکھی اور اپنے رنج وغم کا برملا اظہار کر کے تزکیہ نفس کی صورت تلاش کر لی۔ اس کے حالات زندگی کی ادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

پادشاہ جہاں مفلسم　　　خاک ہم نیست در دخترانہ ما

اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ملا وجہی نے ۱۶۳۵ میں "سب رس" لکھی۔ اس معرکہ آرا تصنیف میں ملا وجہی نے دکن کی ادبی روایات کی اساس پر اپنی نثری تخلیق کی عظیم عمارت تعمیر کی۔ ملا وجہی سے قبل دکن میں نثری ادب کے جو ابتدائی نقوش ملتے ہیں انھیں ملا وجہی نے نکھارا اور انھیں دکن کے نثری ادب کی لاتقصد رشک روایت کی شکل عطا کر دی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملا وجہی نے دکن قدیم اردو نثر میں اظہار و ابلاغ کے لیے جو طرز فغاں اپنائی وہ اس قدر جامع،

پرکشش اور عام فہم تھی کہ اسے بے حد پزیرائی ملی اور وہی اپنی اس مکمل صورت میں بعد میں آنے والوں کے لیے طرز ادا ٹھہری۔ اسی لیے ملاوجہی کے اسلوب نثر کو دبستان دکن کی نثری روایت کا نقطۂ تکمیل قرار دیا جاتا ہے۔(۳) اردو نثر کی ایک اور تصنیف ''تاج الحقائق'' بھی ملاوجہی کی تصنیف خیال کی جاتی ہے لیکن اس بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں کہ یہ ملاوجہی کی تصنیف ہے بھی یا نہیں (۴) ملاوجہی کی ایک اور تصنیف ''قطب مشتری'' ہے۔ یہ مثنوی معیار اور وقار کی اس رفعت کی امین ہے کہ اسے دکن میں صنف مثنوی کی بلند و بالا عمارت کی خشت اول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اپنی اس تصنیف پر ملاوجہی کو بہت ناز تھا۔ اس نے لکھا ہے:

قطب مشتری میں جو بولیا کتاب   سوہوئی جگ میں روشن کہ جیوں آفتاب

اپنی قدامت کے اعتبار سے ''قطب مشتری'' کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ اسے اس عہد کے اذہان کی مقیاس یا ذہنی قطب نما قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔(۵) اپنی شاعری میں ملاوجہی نے اپنے تجربات، مشاہدات اور حالات و واقعات کی لفظی مرقع نگاری میں اپنے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ دکن کی محبت اس کے ریشے ریشے میں سماگئی ہے جس کا وہ برملا اظہار کرتا ہے۔

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں   پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ   انگوٹھی کوں حرمت نگینا ہے لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے   کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے   تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

قطب مشتری میں ملاوجہی کا اسلوب اس زمانے کے ادبی معیار کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ ایک اہم پیش رفت ہے۔ اس زمانے میں اس قدر موثر کلام عنقا تھا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی

سنے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو (History of Urdu Literature) میں ملا وجہی کی تصنیف قطب مشتری کو اس عہد کے پورے ہندوستان کے ادبیات کی ایک اہم تصنیف قرار دیا ہے۔ سب رس نے اردو کے نثری ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور قطب مشتری کو اردو شاعری کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ قطب مشتری میں ملا وجہی نے حالات وواقعات کی لفظی مرقع نگاری کرتے وقت جس فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔

شہنشاہ مجالس کے ایک رات	وزیروں کے فرزند تھے سب سنگات
ہر یک خوب صورت ہر ایک خوش لقا	سو ہر ایک دل کش ہر ایک دل ربا
مہابت کے کام میں جم جم ہے جیون	شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیون
ندیم ہور مطرب سگھر فہم دار	اتھے شہ سوں مل کر یو سب ایک ٹھار
صراحی، پیالے لے ہاتاں منے	ندیماں تھے مشغول باتاں منے
لگے مطرباں گانے یوں سازسو	کہ دھرتی ہے ست آواز سوں
ندیماں لطافت میں جو چکر آئیں	تو روتیاں کو خوش کر گھڑی میں ہنسائیں

۵۔ سلطان محمد قطب شاہ: (عرصہ اقتدار: ۱۶۲۵۔۱۶۱۱) یہ گولکنڈہ کا چھٹا بادشاہ تھا۔ اس نے بھی اردو میں شاعری کی لیکن اس کا کلام دستیاب نہیں۔ اس کی شاعرانہ استعداد اس منظوم دیباچے میں ملتی ہے جو اس نے قلی قطب شاہ کے دیوان کے لیے لکھا تھا۔

۶ ملا غواصی: ملا غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ یہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی کا ہم عصر تھا۔ زبان وبیان پر اس کی کامل دسترس، قدرت کلام اور فنی مہارت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۶۱۸ء (۱۰۲۵ ہجری) میں اس نے دو ہزار سے

۶۔ زائد اشعار پر مشتمل مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" صرف تیس دن میں مکمل کی

برس یک ہزار ہور پنج بیس میں کیا ختم یو نظم دن تیس میں

سلطان عبداللہ قطب شاہ : (پیدائش: ۱۶۱۴ء وفات ۱۶۷۲ء) اس کا عرصۂ اقتدار ۱۶۲۶۔۱۶۷۲ ہے۔ اس نے دکن کی مقامی تہذیب وثقافت، سماج اور معاشرت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس کی شاعری میں دکن کی معاشرتی زندگی کی دلکش تصویر کشی کی گئی ہے۔ حسن وجمال اور سراپا نگاری پر اسے عبور حاصل ہے۔

جن تج کو ایسا روپ دے اپروپ کر سجایا ‌ ‌ ‌ تج گال کا لٹ شام میں کیا خوب دیوا لایا

روشن ہے جگ تج بھن تے نازک ہتھیلیاں پان تھے ‌ ‌ ‌ تج سارتن کسی کھان تھے اجنوں نکل نہیں آیا

دو پھند نا لکھ چھند کا بے مثل ہے مانند کا ‌ ‌ ‌ تج دھن کے بازو بند کا خوش منج رجھالبدایا

مختلف ادوار میں گولکنڈہ کے جن شعرا نے اپنی تخلیقی فعالیت سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ان میں قطبی شاہ سلطان جنیدی، ابن نشاطی، میراں جی، میراں یعقوب، بلاقی، طبعی، محب، کبیر، اولیا، غلام علی، سیوک، فائز، لطیف، شاہ راجو، فتاحی، افضل اور شاہی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مغلوں نے ۱۶۸۵ء میں بیجاپور اور ۱۶۵۸ میں گولکنڈہ کو فتح کر لیا تو جغرافیائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی، ثقافی، لسانی، معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے سلطنت میں ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ مغلیہ عہد میں دکن میں جو ادب تخلیق ہوا وہ اردو زبان کے ارتقا کا مظہر ہے۔ اس عرصے میں جو مثنویاں لکھی گئیں ان میں شعرا نے بالعموم تصوف، اخلاقیات، حسن و رومان اور رزم و بزم کی شان دل ربائی قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" موضوع اور اسلوب کی دل کشی کے لحاظ سے شمالی ہند میں تخلیق ہونیوالی مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں۔

سراج اورنگ آبادی نے مثنوی بوستان خیال میں تخیل کی جولانیاں دکھاتے ہوئے اپنے کمال فن کو ادبی تخلیق میں احسن طریقے سے سمو دیا ہے۔ قاری اسے پڑھ کر حظ اٹھاتا ہے۔

اری ہم نشینو! مرا دکھ سنو | مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
کہوں کیا کلیجے میں سوراخ ہے | مری داستاں شاخ در شاخ ہے

مغلیہ عہد میں دکن میں جن شعرا نے تخلیق ادب کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیں ان میں شیخ داؤد، قاضی محمود، سید محمد خاں، خواجہ محمود بحری، ولی ویلوری، اشرف، وجدی اور غضنفر کے نام اہم ہیں۔ اس عہد کے شعرا نے رزم نامے حسن و رومان کی داستانیں، سچی کہانیاں، لوک داستانیں، اخلاقیات، تصوف اور فلسفیانہ خیالات پر مبنی تمثیلی مثنویاں لکھ کر قارئین ادب کے اذہان کی تطہیر و تنویر کا اہتمام کیا۔ ان شعرا کے اسلوب کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے شعرا نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کی۔ دکن میں تخلیق ہونیوالی ان مثنویوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ شمالی ہند کے شعرا نے اس اسلوب کو لائق تقلید سمجھا اور خاصی مدت تک اس کی تقلید کی۔ (۶) اس عہد کے ایک نامور شاعر خواجہ محمود بحری نے ذاتی رومان پر مبنی اپنی شاعری کو ساحری میں بدل دیا ہے۔

اس عمر میں عشق جیو میں جاگ | یوں گھیر لیا جیوں بھیڑ کو بھاک
آگ عشق کی دل میں دبکی تھی | بھرتن میں تمام تک پکی تھی
پن مجھ کو سمجھ نہیں جو یہ کیا | یونامہ، یوناز، یونگہ کیا
یو درد سو کیا یو دل جلے کیوں | تن آنچہ سوں عشق کے گلے کیوں

ولی دکنی (پیدائش اورنگ آباد۔ مہاراشٹر: ۱۶۶۷ وفات: احمد آباد ۱۷۰۷) نے اردو غزل کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں جلوہ گر ہیں۔ اس نے چار سو تہتر (۴۷۳) کے قریب غزلیں

لکھیں جو تین ہزار دو سو پچیس (۳۲۲۵) اشعار پر مشتمل ہیں۔ ولی نے فارسی مضامین اور خیالات کو بڑی کامیابی سے اردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اسی لیے اُسے اردو غزل کے جدید اسلوب کا معمار اوّل سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ولی نے فارسی شاعری کے تخیل کی اساس پر اردو شاعری کی فلک بوس عمارت تعمیر کرنے کی خشتِ اوّل رکھی۔ ولی نے ۱۷۰۰ء میں سید ابولمعالی کے ہمراہ دلی کا سفر کیا۔ یہاں ایک ملاقات میں شاہ سعد اللہ گلشن (متوفی: ۱۷۲۸) نے ولی کے اسلوب شعر کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے ایک صائب مشورے سے نوازا:

"ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند، ریختۂ خود بہ کار بہ بر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔" (۷)

ولی دکنی نے شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے پر عمل کیا اور اس کے بعد اس کے اسلوب میں ایک واضح تبدیلی کے آثار سامنے آئے۔ فارسی زبان کی شعری روایت سے بھر پور استفادہ کرتے ہوئے ولی دکنی نے اپنے رنگ سخن کو صد رنگ تخلیق کی مثال بنا دیا۔ اس طرح اردو شاعری کو افکار تازہ کی مشعل تھما کر جہان تازہ کی جستجو کی ترغیب ملی۔ ولی دکنی کے فکری، فنی اور لسانی تجربے اردو ادب میں نئے امکانات تک رسائی میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ان سے مروج اسلوب کی یکسانیت کا خاتمہ ہوا اور ندرت و تنوع پر مبنی نئے اسالیب شعر کی تخلیق کی راہ ہموار ہو گئی اس وسیع و عریض عالم آب و گل میں ہر جگہ موضوعات، مواد اور واقعات کا ذخیرہ قریب قریب ایک جیسا ہی ہوتا ہے لیکن انداز بیاں اور پیرایۂ اظہار ہر جگہ الگ رہتا ہے۔ یہی منفرد اسلوب کی پہچان ہے۔ ولی دکنی کی شاعری کا امتیازی پہلو اس کا منفرد لہجہ ہی ہے۔ جس نے اس کی شاعری کی تاثیر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ولی دکنی کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

"ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔" (۸)

دکن میں اردو زبان کے جو علاقائی رنگ موجود تھے ان میں ریختہ، ہندوی، گجری اور دکنی

شامل ہیں۔ اس عہد میں ریختہ گویان کے اسلوب میں جو خاص کیفیت رہی اس میں بالعموم جو پہلو اہم ہیں ان میں فارسی زبان کی شعری روایت کی تقلید، زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی اور سلاست شامل ہے۔ جنوبی ہند سے جانیوالی شعری روایت نے شمالی ہند کے ادب پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ شمالی ہند کے ادب پر پہلے ہی سے فارسی زبان کے ادب کے اثرات موجود تھے۔ ولی دکنی کی دلی آمد سے ان میں زیادہ پختگی پیدا ہوئی۔ ولی دکنی نے فارسی زبان کی شعری روایت کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنی شاعری میں روبہ عمل لانے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

چہرۂ گل رنگ و زلف موج زن خوبی منیں　　آیت جناب تجری تحتہا الانہار ہے

یٰسین وطٰہٰ والضحیٰ نازل ہوئے تجھ شان میں　　واللیل اور والشمس ہے تجھ زلف و مکھ کے درمیاں

ولی دکنی کی شاعری میں حسن و جمال عشق و محبت سیاسی مجلسی معاشی اور معاشرتی معاملات کے بارے میں نہایت دردمندی اور خلوص سے اظہار کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ صبر و تحمل اور توکل و قناعت کا دامن تھام کر آلام روزگار کے سامنے سینہ سپر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ اس کی شاعری سے سکون اور مسرت کے سوتے پھوٹ رہے ہیں جس کے ماحول اور کثیف فضا میں اس کی شاعرہ تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند ہے۔ ولی دکنی کی شاعری سے ایک عہد آفریں تجربے کا آغاز ہوا جس کے اعجاز سے تخلیق ادب کے تمام معائر بدل گئے۔ اس کی شاعری نے یکسانیت اور جمود کی فضا کا قلع قمع کر دیا اور حرکت و عمل کو زادِ راہ بنایا۔ اس منفرد اسلوبیاتی تجربے نے تخلیق ادب کو نئی اقدار اور روایات سے روشناس کرایا اور اس طرح اردو زبان و ادب کی جہان تازہ تک رسائی کو یقینی بنا دیا گیا۔ دکن کی ہندی روایت جو سالہا سال سے دکن میں تخلیق ہونے والے ادب کا امتیازی وصف رہا اس نے فارسی زبان کے امتزاج سے ایک متنوع اسلوب شعر کی صورت اختیار کر لی اور یہ اسلوب شعر ولی دکنی کے ذریعے جب شمالی ہند میں پہنچا تو اسے

بہت پذیرائی ملی۔ ولی دکنی کے اسلوب کی چند مثالیں:

گر ہوا ہے طالب آزادگی　　بند مت ہو سبحہ و زنار میں

حق پرستی کا اگر دعویٰ ہے　　بے گناہاں کوں ستایا نہ کرو

ملک ہرگز نہیں رہے آباد　　تخت سیں جس کے شہر یار گیا

باعث رسوائی عالم ولی　　مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

طمع مال کی سر بہ سر عیب ہے　　خیالات گنج جہاں سر سوں ٹال

ولی دکنی کے اسلوب سے شمالی ہند میں جہاں پہلے اردو شاعری کی کوئی قابل قدر روایت موجود نہ تھی وہاں ایک نئی، مضبوط اور مستحکم شعری روایت پروان چڑھانے میں مدد ملی۔ شمالی ہند میں ریختہ اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھا۔ اس علاقے کے شاعر یا تو خالص ہندی زبان میں دوہے کی تخلیق پر توجہ دیتے تھے یا ان کے اسلوب پر فارسی آمیز بھاشا کا غلبہ تھا۔ اس زمانے کے ادب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں سوائے امیر خسرو کے ریختہ، جعفر ٹلی اور خواجہ عطا کی شاعری کے اور کوئی قابل ذکر تخلیق موجود نہ تھی۔ جنوبی ہند سے آنے والے تازہ ہوا کے جھونکوں سے شمالی ہند کے گلشن ادب میں بہار کے امکاں روشن ہوئے۔ ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی کی کیفیت نے قارئین ادب کے دلوں کو مرکز مہر و فا کر دیا۔ ولی دکنی کی دہلی آمد سے پہلے جو ادبی فضا تھی وہ یکسر بدل گئی اور مرحلۂ شوق تھا کہ سب اس کی جانب رواں دواں تھے۔ ولی دکنی کے اسلوب کے اثر سے شمالی ہند کے ادب پر انمٹ نقوش مرتب ہوئے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو دکن سے شروع ہونیوالے علم و ادب کی روشنی کے سفر نے پورے برعظیم کو اپنی آب و تاب سے منور کر دیا۔ تاریخ ادب میں دکن میں فروغ اردو کی مساعی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آج بھی دکن سے اردو

زبان وادب کے لافانی تخلیق کار اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جس علاقے سے عزاحمد جیسا عظیم ناول نگار، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم جیسی ہفت اختر شخصیات کا تعلق ہو اس کے مردم خیز ہونے کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے۔ دکن میں اس لسانی عمل کو تہذیبی ارتقا کی ایک صورت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام اور ملل کا عروج اور جاہ جلال تو سیل زماں کے تھپیڑوں کی زد میں آکر خس وخاشاک کے مانند بہہ گیا مگر وہاں تہذیب کو کبھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ ہر عہد میں تعلیم و تربیت کے وسیلے سے نسل نو کو تہذیبی میراث کی منتقلی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دکن میں بھی اسی انداز میں تہذیبی ارتقا کو یقینی بنایا گیا۔ دکن کے تخلیق کاروں نے تہذیب وتمدن کے تحفظ، بالیدگی اور ارتقا میں گہری دلچسپی لی اور ادب وفنون لطیفہ کے شعبوں میں ہر چیلنج کا بڑی استقامت سے مقابلہ کیا۔ ان کی اس محنت لگن، استقامت اور جگر کاوی کے نتیجے میں اردو زبان وادب میں یہ استعداد پیدا ہوئی کہ وہ جہد البقا کے لیے اپنے وجود کا اثبات کر سکے اور اپنی بقا اور دوام کو یقینی بنا سکے۔

دکن میں اردو زبان وادب کے ارتقا سے معاشرے کی اجتماعی زندگی پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس لسانی عمل کو محض اتفاقی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہے جس نے زندہ الفاظ کو اس معجز نما قوت سے متمتع کر دیا جس نے افراد کی بصیرت، ذہانت، وجدانی اور روحانی کیفیت کو تاب وتواں عطا کی اور اظہار کے متعدد نئے پہلو سامنے آتے چلے گئے۔ بادی النظر میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دکن میں ہونے والے لسانی تجربات نے جہاں تہذیبی ارتقا کو یقینی بنایا وہاں حیات وکائنات کے اہم مسائل سے آگاہی کی صورت بھی سامنے آئی۔ تخلیق ادب کے وسیلے سے قارئین ادب کے شعور وبصیرت میں ایک انقلاب آ گیا جس کے ثمرات سے نئی نسل آج بھی مستفید ہو رہی ہے۔ تاریخ ادب میں اس لسانی وتہذیبی ارتقا کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ماخذ

۱ اشتیاق حسین قریشی ڈاکٹر : برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، جامعہ کراچی، اشاعت اول (اردو ترجمہ)، ۱۹۶۷ء صفحہ ۶۹

۲۔ حسن ریاض سید: پاکستان ناگزیر تھا، جامعہ کراچی، اشاعت سوم، ۱۹۸۲ء صفحہ ۴

۳ وحید قریشی ڈاکٹر: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، چھٹی جلد، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء صفحہ ۴۴۶

۴ ایضا صفحہ ۴۱۶

۵ غلام حسین ذوالفقار ڈاکٹر: اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۲۶

۶ عبداللہ ڈاکٹر سید: ولی سے اقبال تک، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، بار چہارم، ۱۹۷۶ء صفحہ ۴۹

۷ میر تقی میر، نکات الشعراء نظامی پریس، بدایوں، انجمن ترقی اردو، ہند اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء صفحہ ۹۴

۸ محمد حسین آزاد: آب حیات ، لاہور ۱۹۵۹ء صفحہ ۸۹

ترجمہ: محمد طارق علی

پروفیسر ڈاکٹر نسیم اے ہائنز (امریکہ)

گونجتی خاموشی

(سعادت حسن منٹو۔ایک لازوال افسانہ نگار)

سعادت حسن منٹو نے اپنی مختصر سی حیاتِ مستعار میں اردو ادب کے چند ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں اپنا ایک مقام بنایا۔ اُسے محض ایک عام سا افسانہ نگار نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ واقعی ایک عظیم افسانہ نگار تھا۔ اس کے تحریری نمونے افسانہ نگاری کی دنیا میں فن کی اعلیٰ مثالوں کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ وہ خداداد صلاحیتوں والا قلم کار تھا۔ وہ اپنی تحریر کسی خاص کاوش کے بغیر کاغذ پر وجود میں لے آنے پر قادر تھا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ منٹو اپنی زندگی کے جن جن مرحلوں سے گزر کر "منٹو" بنا اُن سب کی تمام تحریری یا دستاویزی تفاصیل موجود ہیں اور کوئی بھی شائق انھیں کتابی شکل میں یا برقی میڈیا پر دیکھ سکتا ہے یہ مرحلے کیا تھے؟ مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ منٹو نے بہ حیثیت طالب علم کیسا وقت گزارا، کن ہستیوں کے اثرات قبول کیے، وہ ترجمہ نگار کب بنا؟ اور کن بڑے غیر ملکی مصنفین جیسے وکٹر ہیوگو وغیرہ کے افسانوں کے ترجمے کیے، بہ حیثیت اوریجنل رائٹر اس نے اپنا پہلا افسانہ کب لکھا؟ دہلی کے پرنٹ اور ریڈیو میڈیا کے تحریری حلقوں کے علاوہ ترقی پسندوں سے منٹو کا تعلق، پھر ان حلقوں سے نکل کر اُس نے اُس وقت کے ہالی ووڈ سنیما سے کب اور کیسے تعلق جوڑا اور ایک کام یاب رائٹر بن کر اُس نے وہاں کے سیمیں اسکرین کے لیے کیا کچھ لکھا؟ تقسیم ہند کے بعد لاہور جانے کا اچانک فیصلہ کیوں کیا؟ لاہور میں بطور مصنف منٹو کی جدوجہد کی داستان اور اسی شہر میں منٹو کا ارتحال۔ وہ خود چل بسا لیکن اپنے فن کو لازوال کر گیا۔

کچھ ادب دوست ہستیوں کا خیال ہے کہ منٹو کا بمبئی چھوڑ کر لاہور آنے کا فیصلہ اس کی زندگی کا ایک بہت اہم موڑ ثابت ہوا۔ میرا سوال یہ ہے کہ منٹو نے واقعی از خود فیصلہ کیا اور کیا وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ ان دنوں وہ بمبئی میں اپنی اہلیہ اور تین چھوٹی بچیوں کے ساتھ رہ رہا تھا اور اُس وقت کے درپیش حالات کا قریبی جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد فسادات کے باعث شہر کے حالات سخت مخدوش اور خطرناک ہو گئے تھے ایک اور اہم مسئلہ بے روزگاری کا بھی تھا۔ اُسے فوری طور پر اپنی فیملی سمیت اپنے پسندیدہ شہر (بمبئی) کو چھوڑنا پڑا لیکن جب وہ لاہور پاکستان آیا تو کیا ملا؟ وہی بے روزگاری اور بھوک، پھر ماحول پر ''نیکوکاروں'' کا غلبہ۔ اس ماحول میں منٹو نے خود کو قطعی ناموزوں پایا۔ ان سب وجوہات نے اُسے ایک غیر اخلاقی کام، شراب نوشی پر مجبور کر دیا۔ تنگ دستی، کثرتِ شراب نوشی۔ ان سب وجوہات نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اُس کی زندگی قعرِ ذلت میں جا پڑی۔ وہ گرا اور گر کے کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔

سوراوَرائے، جو منٹو پر اتھارٹی مانا جاتا ہے، منٹو کی زندگی کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''لیکن بدقسمتی سے صرف لاہور ہی کو اس ادیب کی بربادی کا الزام نہیں دیا جا سکتا، بمبئی بھی برابر کا قصووار ہے۔ وہ اس شہر کی فلمی دنیا کے ایک معروف ادارے ''فلمستان'' میں بہ طور رائٹر کام کرتا تھا۔ اس ادارے کے کئی افراد (جیسے اس وقت کا مشہور ہیرو اشوک کمار) اس کے قریبی دوست تھے۔ ملک تقسیم ہوا تو حالات بگڑ گئے نفرت کی آگ ہر سُو پھیل گئی۔ منٹو کے خلاف ایک پُر حقارت تحریری مہم چلائی گئی۔ اشوک کمار پر مسلم نوازی کا الزام لگا کہ اس نے اسٹوڈیو میں مسلمان بھر دیے ہیں۔ منٹو کے بارے میں کہا گیا کہ وہ فرقہ پرست ہے، ایک ایسی بات اور کام جس کے خلاف وہ ساری عمر بڑے شدّ و مد سے لڑا۔ تاہم درپیش حالات میں وہ سر جھکائے، بڑی شرمساری کی کیفیت میں شہر چھوڑ گیا۔ اس گھونسے کی ضرب سے وہ ساری عمر نہ سنبھل سکا۔ اُس کی شخصیت کے دو ٹکڑے ہو کر رہ گئے ایک طرف تھا اصل سعادت حسن منٹو، شریف اور متحمل مزاج اور دوسری طرف ایک نڈھال، پریشان حال اور رقیق القلب منٹو۔''

منٹو کے دنیا سے چلے جانے کے بعد، سرحد کے دونوں جانب اس کی تحریروں پر کافی کام کیا گیا۔ برصغیر کی کئی ایسی سرکردہ شخصیات کے انٹرویوز پر مشتمل ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، جنھوں نے اپنی گفتگو میں ان کی کردار نگاری کی بات کی ہے جو منٹو کے افسانوں میں سانس لیتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ افسانے ایسے ہیں کہ جن کی اختتامیہ سطریں پڑھ کر قاری کا سانس نیچے کا نیچے اور اُوپر کا اُوپر رہ جاتا ہے۔ سُننے میں آیا ہے کہ خود منٹو نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی کہ ان کے خیال میں ان کے لکھے افسانوں کے سب سے اہم حصّے ان کے اختتامیہ پیراگرافس ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کو پُر اثر اور امر بنانے پر خاص توجہ اور وقت صرف کیا۔ کئی حوالوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ منٹو ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنے افسانوں کے انجام کو دیرپا اور پُر اثر بنانے کے لیے آخری جملوں کو بار بار دہراتے۔

انٹرنیٹ پر منٹو کی تحریریں برائے مطالعہ موجود رہتی ہیں۔ یہاں مَیں غیر ملکی ادب اور ثقافت کی معلمہ کی حیثیت سے یہ بات ضرور کہوں گی کہ ان تحریروں کا انٹرنیٹ کے ذریعے مطالعہ ایک مفید کام ہے، خصوصاً دوسری نسل سے تعلق رکھنے والے اردو بولنے والے اُن جوانوں کے لیے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو گھر میں مستعمل بنیادی اردو تو سمجھ لیتے ہیں لیکن اردو پڑھنے اور لکھنے سے نابلد ہوتے ہیں۔ وجہ ہے پڑھائی لکھائی کے مواقع کا نہ ملنا۔ مغرب اور افریقہ کے ممالک کے علاوہ نیوزی لینڈ ایسے دور دراز ملک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ انٹرنیٹ پر منٹو کی تحریریں اُن کے لیے ایک عمدہ ادبی خزانے کی یافت سے کم نہیں۔

سعادت حسن منٹو ایسے افسانہ نگار کے فن پر مضامین اور کتابیں لکھنے والوں کی کمی نہیں انھیں دو واضح قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ دو قسموں کے تجزیہ نگار مصنّف کے افسانوں پر دو مختلف طرح سے روشنی ڈالتے ہیں لیکن ایک بات جس پر سب ناقد پورے تیقّن سے متفق ہیں، یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں معاشرے کے پس ماندہ طبقے کے لوگوں کو اظہار اور نمائندگی ملتی ہے۔ تاہم

بنیادی طور پر تجزیہ نگاروں کے دو دبستان خیال نظر آتے ہیں مثال کے طور پر ایک مضمون میں یہ کہا گیا ''منٹو کی تمام تحریریں جو ہمارے اردگرد کے معاشرتی ماحول اور خود مصنّف کی معاشی جدوجہد سے برآمد ہوئی ہیں، واضح طور پر ظلمت کے خلاف ایک فطری انسانی بے حسی کو ظاہر کرتی ہیں۔''

دوسرے گروپ کا یہ کہنا ہے کہ منٹو کی کہانیاں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ پاگل پن کے انتہائی تاریک لمحات میں بھی ایک آدمی جس فطری اچھائی سے متصّف ہے، وہ اسے کبھی تنہا چھوڑ کر نہیں جاتی۔ عائشہ جلال، منٹو کی نواسی ایک جگہ لکھتی ہیں:

''منٹو حیران تھا کہ وہ لوگ جو کل تک آپس میں دوست تھے، پڑوسی اور ساتھی تھے اپنی انسانیت کو چھوڑ کر بالکل پاگل ہو گئے۔ وہ بھی ایک انسان تھا بالکل اُن جیسا جنھوں نے انسانیت کے ساتھ منھ کالا کیا، لوگوں کو قتل کیا، ان میں بھی وہ سبھی خامیاں اور خوبیاں تھیں جو اُن جیسے دوسرے انسانوں میں بھی تھیں۔'' تاہم انسانی برائیاں اور بداعمالیاں خواہ کتنی ہی پھیل جائیں، خواہ کتنی ہی شرم ناک ہوں، انسانیت کے احساس بالکل ختم نہیں کرسکتیں۔ بدقسمتی سے منٹو کو اس کے دوران حیات جن لوگوں نے نثر نگار قرار دیا اُن افراد سے زیادہ طاقت ور تھے جو منٹو کو ایک ذہین وفطین قلم کار سمجھتے تھے۔

ادبی سکالرز اس بات پر متفق ہیں کہ منٹو کے تین افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' ان کی بہترین کہانیوں میں شامل ہیں۔ میرا یہ مضمون اس کے دو افسانوں ''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' کا احاطہ کرتا ہے۔ دراصل ان دونوں بہت موثر افسانوں نے میرے دماغ پر گہرا اثر مرتب کیا۔ ان دونوں کے انجام بہت ہی اثر انگیز ہیں اور قاری کی حسیات کو جکڑ لیتے ہیں۔ افسانے پڑھنے کے بعد جب میں نے کتاب بند کی تو کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی، آنکھیں بند تھیں اور ذہن میں یہ سوال گردش کررہا تھا کہ ظلم کا جواز کیا ہے اور اس کا حساب کیوں لیا نہیں جاتا۔؟

''کھول دو'' عنوان رکھنے والی کہانی تقسیم ہند کے وقت درپیش ابتر حالات کا پس منظر لیے ہوئے ہے۔ اس کا آغاز سراج الدین نامی ایک کردار سے ہوتا ہے جو ایک مہاجر کیمپ میں موجود

ہے وہ گہرے صدمے کی حالت میں ہے۔ اسے وہ منظر یاد آتا ہے جب اس کی گھر والی اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ اس کا پیٹ چرا ہوا تھا۔ انتڑیاں باہر نکلی پڑی تھیں اور وہ مایوسی اور خوف کے عالم میں سراج سے التجا کر رہی تھی کہ وہ جواں بیٹی سکینہ کو لے کر فوراً گھر سے بھاگ جائے سراج حواس کھو بیٹھا جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے خو کو ایک مہاجر کیمپ میں پایا۔ وہ دیوانہ وار سکینہ کو تلاش کرنے لگا۔ اُسے یہ قطعی یاد نہ رہا کہ بھاگ نکلنے کے دوران دونوں کیوں کر جدا ہو گئے تھے۔ سراج بیٹی کی تلاش میں کیمپ کیمپ پھرتا رہا۔ آخر اُسے جیپ میں سوار آٹھ نوجوان رضا کاروں کا ایک گروپ ملا۔ اس نے سکینہ کو ڈھونڈنے میں ان سے مدد کی درخواست کی جو انھوں نے مان لی۔

رضا کاروں کو مظلوم سکینہ ایک کنویں کے پاس چھپی ہوئی ملی۔ انھوں نے اسے کھانا دیا اور ایک اوڑھنی بھی کہ وہ اپنے دونوں بازوؤں سے خود کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ایک رضا کار لڑکے نے اسے اپنی جیکٹ بھی دی۔ اور پھر اُسے جیپ میں بٹھا کر مہاجر کیمپ لے آئے۔ وہاں سراج نے جب اُن سے بات کرنی چاہی تو وہ اسے دھکا دے کر جیپ بھگا لے گئے۔ سراج پھر کیمپ کیمپ بیٹی کو ڈھونڈتا پھرنے لگا۔

ایک صبح سراج نے دیکھا کہ کیمپ کے اندر واقع کلینک میں سٹریچر پر ایک لاش لائی گئی کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ لڑکی کی لاش ہے جو ریلوے کی پٹڑی کے پاس سے ملی ہے۔ سراج جیسے مدہوشی کی سی کیفیت میں ایک اندھیرے کمرے میں رکھی لاش تک پہنچا اسی وقت ڈاکٹر اندر آیا اور اس نے کمرے کی بتّی روشن کر دی سراج نے پہچان لیا کہ سٹریچر پر موجود لاش کسی اور کی نہیں اس کی بیٹی سکینہ کی ہے۔ وہ چیخا "سکینہ زندہ ہے" ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنا چاہا تو اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے سراج سے کہا "کھول دو" اسی وقت بے حس پڑی لاش میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنی شلوار کا ازار بند کھول دیا۔ تب پتہ چلا کہ لڑکی زندہ ہے۔ ڈاکٹر ندامت اور پشیمانی سے پسینے پسینے ہو گیا۔

اور جمل کہانی کا آخری جملہ زبردست ہے۔ اس کا انگریزی میں کیا گیا ترجمہ اس کیفیت کو صحیح طرح واضح کرنے سے قاصر ہے جس سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر اس وقت دوچار ہوا جب لاش کا معائنہ کرنے سے پہلے اس نے دو لفظ ادا کئے "کھول دو" اور تب اُسے اچانک لاش میں پیدا ہونے والی حرکت سے پتہ چلا کہ لڑکی مردہ نہیں بلکہ زندہ تھی۔ متعدد بار ریپ کی وجہ سے وہ ہوش و حواس کھوئے ہوئے تھی۔ صرف دو لفظوں "کھول دو" نے اس کی ساری کیفیت عیاں کر دی اور ساتھ ہی ڈاکٹر کے احساسات بھی واضح ہو گئے کہانی کے اس انجام نے ثابت کر دیا کہ منٹو کفایت لفظی کا کتنا بڑا ماہر تھا۔

میری دوسری پسندیدہ کہانی "ٹھنڈا گوشت" بھی تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے بلاخیز اور سفاک ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کہانی ایک نوجوان ایشر سنگھ کے متعلق ہے۔ جو خود اپنے کہنے کے مطابق شہر جاتا اور وہاں بگڑے ہوئے حالات کا فائدہ اٹھا کر لوگوں سے قیمتی اشیاء چھینتا ہے۔ یہ اشیاءؤہ اپنی محبوبہ کلونت کور کو دے دیتا ہے جس سے وہ اکثر ملتا رہتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ کچھ وقت غائب رہنے کے بعد جب کلونت کور کے پاس آیا تو اس نے غائب رہنے کی وجہ پوچھی۔ ایشر سنگھ نے اسے صاف صاف کچھ نہ بتایا بلکہ اس سے نظریں ملانے سے بھی کترایا۔ کلونت کور نے اس پر بے وفائی کا الزام لگایا لیکن اس نے ایسی کسی بات سے انکار کیا۔ پھر دونوں باہم راز و نیاز میں مصروف ہوئے۔ لیکن ایشر جنسی طور پر اس کے قریب نہ جا سکا۔ کلونت نے پھر اس پر کسی اور عورت سے تعلق رکھنے کا الزام لگایا۔ اس پر دونوں میں کچھ بحث تکرار ہوئی۔ حسد اور غصّے کی آگ نے کلونت کور کو پاگل بنا دیا اور اس نے اپنی کرپان سے ایشر پر حملہ کر دیا۔ وہ بُری طرح زخمی ہوا۔ اس کی گھائل گردن سے خون پھوٹ کر بہہ نکلا اور زندگی تیزی سے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ نے لگی۔ اسی حالت میں اس نے کلونت کور کو بتایا کہ ایک بار جب وہ حسب معمول شہر گیا تو ایک جگہ اسے ایک ڈری سہمی خوب صورت لڑکی نظر آئی، وہ اسے کاندھے پر ڈال کر بھگ اُٹھا ایک ندی کے قریب اس نے لڑکی کو زمین پر رکھا تو اس وقت اُسے معلوم ہوا کہ در حقیقت وہ جس لڑکی کو اٹھا کر بھاگا تھا وہ تو کب کی مر کر یخ ہو چکی تھی جب کلونت نے ایشر کی کہانی کا انجام سنا تو اُس وقت تک

اُس کی آواز ڈوب چکی تھی اور اُس کے آخری الفاظ بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہوگئے تھے۔ کٹے ہوئے گلے سے خون بہہ کر اس کی جان ختم کر رہا تھا جسم مردہ تھا اور گوشت ٹھنڈا یخ۔

''ٹھنڈا گوشت'' پڑھتے ہوئے مجھے ایک اور ''بیڈروم المیہ'' والی کہانی یاد آ گئی جو منٹو کی کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں ایک مرد اپنی وفا شعار بیوی کو حسد اور شدید غصّے کی حالت میں قتل کر دیتا ہے۔ یہ کہانی کوئی اور نہیں شیکسپیئر کے معروف ڈرامے ''اوتھیلو'' کی ہے۔ یہاں ایک سوال میرے ذہن میں جیسے جم کر رہ گیا۔ اور وہ اس بات سے متعلق نہیں کہ ایا یہ ٹریجڈی اس لیے ظہور میں آئی کہ کہانی کے بڑے کردار اپنی فطرت اور جبلت کے سبب قتل ایسا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بلکہ میرے ذہن میں موجود سوال کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ کیسے حالات ہوتے ہیں جو اچھے بھلے انسانوں میں حیوانی جذبے کو ابھارتے اور ان سے جان لیوا تشدد کرواتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ تقابلی ادب کے عالم اور قاری حضرات اس مضمون میں مذکور تینوں کہانیوں کی چند باہم یکساں یا متضاد باتوں کو زیر بحث لانا پسند کریں جب کہ اصل بات یہ ہے کہ شیکسپیئر اور منٹو نے جو کچھ لکھا اُن سے مختلف تحریری رنگ ظاہر ہوتے ہیں۔ منٹو کے قطعی برعکس، شیکسپیئر کی تحریر کی وجہ شہرت الفاظ کا با کفائت استعمال نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس کے ڈرامے ''اوتھیلو'' ہی کو لے لیجیے اس میں اوتھیلو ایک لمبی خود کلامی کے دوران اپنی زندگی میں کیئے گئے کارناموں کا جائزہ پیش کرنے کے بعد اِس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ذاتی خوبیوں اور کارناموں کو یاد رکھا جائے۔ اس پوری اختتامی خود کلامی میں وُہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی ڈیسڈیمونا کی جان کیوں لی۔ اس کی بیان کردہ کہانیوں میں انسانی فطرت کا کوئی تجزیہ نہیں ملتا، نہ ہی کہیں متنوع رجحانات نظر آتے ہیں جن کا اظہار اُس وقت ہوتا ہے جب پُرآشوب حالات درپیش ہوں۔ آپ منٹو کی کہانیاں اٹھایئے تو اُن میں کہیں بھی کوئی کردار اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے محاسن یا منفی پہلو بیان کرنے کے لیے لمبی لمبی تقریریں کرتا نظر نہیں آتا۔ کس وقت کیا کرنا ہے کیا نہیں اس پر بھی کوئی کردار بحث مباحثہ کرتا نہیں ملتا نہ ہی کہیں کوئی نفسیاتی تجزیئے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی کہانیوں میں

منٹو الفاظ بہت احتیاط اور کفائت سے چن چن کر استعمال کرتا ہے بالکل اس طرح جیسے کوئی مجسمہ ساز اپنی ریتی کو استعمال کرتا ہے یا جیسے کوئی جوہری اپنے ہیرے موتیوں کو ٹانکتا ہے۔

اوپر مذکور منٹو کے دونوں افسانوں میں ایک بات نمایاں طور پر مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ چند ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں لامحدود طاقت اور اختیارات ہوتے ہیں جو اپنی نااہلی کے سبب انھیں صحیح طرح استعمال کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے میں یہ بات نظر آئی کہ اوتھیلو اپنی جسمانی طاقت کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنی معصوم بیوی کو گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے۔ جب کہ منٹو کے افسانے ''کھول دو'' میں رضا کار جو مہاجرین کو کیمپوں تک لانے کے کام پر مامور ہیں اپنے فرائض کے برعکس کام کرتے اور مہاجرین کو عذاب میں مبتلا کرتے ہیں۔ اسی طرح ''ٹھنڈا گوشت'' میں ایشر سنگھ جتنی ظالمانہ کاروائیاں کرتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ کلونت کور اپنے آشنا (ایشر) کو قتل کر دیتی ہے۔ سو کہنا یہ ہے کہ طاقت اور اختیارات کے غلط استعمال ہی سے المیے جنم لیتے ہیں۔ منٹو کے دونوں افسانوں میں یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ ان میں مرکزی کردار بہت بے خوفی سے غلط کام کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ انھیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ ادھر ''اوتھیلو'' میں بھی یہی دیکھنے میں آیا۔ کہ مرکزی کردار اوتھیلو خود کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔ وہ روائتی جنگوں کا ایک نام ور ماہر ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ گھر کی حدود کہاں ہیں اور میدان جنگ کی حدود کہاں۔ سو معاملات الٹ جاتے ہیں اور المیہ جنم لیتا ہے۔

منٹو کی کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جو اپنے انجام میں خاموش رہتی ہیں۔ افسانہ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہماری نظروں کے سامنے کوئی فلم چل رہی ہے ابھی روشن بھی ہے لیکن یکا یک اس کا انجام ہمیں جیسے ایک ہتھوڑے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ ٹھاہ کر کے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ''ٹھنڈا گوشت'' ہی کو لیتے ہیں۔ اس کا آغاز کلونت کور کی بھرپور جوانی اور اس کی جنسی اپیل کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہانی میں قاری اُس وقت کُھبتا ہے جب کلونت اپنے آشنا ایشر سے پوچھتی ہے کہ (چھیڑ چھاڑ بعد) اس کا رویہ کیوں بدل گیا اور یہ کہ وہ اتنے دن کہاں غائب رہا

اب جس طرح کلونت کور جواب کی منتظر ہے اسی طرح قاری کو بھی جواب چاہیئے۔ کہانی کے اس مقام پر مکالمے بڑے جاندار اور متحرک ہیں۔ تاہم جب کہانی اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہے تو اسی وقت ایشر زخمی ہو جاتا ہے اور خون نکلنے سے پہلے گر پڑتا ہے کچھ بولتا ہے لیکن پھر اس کی آواز ڈوب جاتی ہے۔ الفاظ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کہانی کلائمکس الفاظ کے سہارے کے بغیر رینگتی ہوئی قاری پر اثر چھوڑ جاتی ہے۔

دوسرے افسانے ''کھول دو'' کو سامنے لائیں تو اس کی چند اختتامیہ سطریں بڑی بھاری نظر آتی ہیں موقع کچھ یوں ہے کہ سراج لڑکھڑاتا ہوا سوچے سمجھے کلینک کے ایک کمرے میں چلا جاتا ہے، وہاں مکمل خاموشی ہے جو اس وقت ٹوٹتی ہے جب اچانک سراج چلاتا ہے: سکینہ زندہ ہے میں اس کا باپ ہوں'' اس کے بعد ڈاکٹر صرف دو لفظ بولتا ہے: کھول دو'' اسی وقت ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ سکینہ کن حالات سے گزری ہے اور بے بسی و شرم کی وجہ سے وہ خاموش ہے، کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اتنی گھمبیر کہ الفاظ وہاں بے معنی سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ خاموشی قاری کے رگ و پے میں اتر جاتی ہے۔ اور وہ دم بخود سا ہو کر عجیب سے جذبات کے تالاب میں غوطے کھانے لگتا ہے۔

منٹو قریباً ساٹھ سال پہلے مر گیا تھا اور ہم خود سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آج بھی اس کی کہانیاں ہمارے موجودہ دور سے کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔ ہمیں اثبات میں جواب ملتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہر جا مطلق العنان طاقت کا راج ہے اور آج بھی کوئی اُسے پوچھنے والا نہیں، تو یوں منٹو آج بھی ہماری ضرورت ہے۔ ہمارے ارد گرد گونجتی خاموشی ہمیں یہی بتاتی ہے۔

*****

محمد فیصل مقبول عجز

داغ دہلوی اور نظام شاہ رام پوری

نواب مرزا داغ دہلوی نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال دہلی میں گزارے بالخصوص وہ چند سال جو قلعہ معلیٰ میں عیش وعشرت میں بسر کیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔اس دور مین اُن کی تعلیم وتربیت استاد ذوق سے اُن کا تلمذ اور شادی کے واقعات اہم تھے۔۱۸۵۴ء میں ذوق انتقال کر گئے تو داغ غالب کی صحبت سے فیض یاب ہونے لگے گو کہ انہوں نے شاگردی اختیار نہ کی لیکن غالب کی زمینوں میں بھر پور غزلیں لکھ کر اُن سے داد سخن حاصل کی۔

قلعہء معلیٰ میں داغ کا قیام ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ سے ۱۸۵۴ء تک رہا۔۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان کا دیوان بھی تلف ہوا جس کا افسوس انہیں ساری زندگی رہا۔قلعے سے نکلنے کے آٹھ نو ماہ بعد ہی یہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔چوں کہ داغ دہلی میں ہی تھے لہٰذا وہ ان واقعات کے چشم دید گواہ بھی تھے۔اس عرصے میں داغ اپنی خالہ کے پاس رہے یا والدہ کے ساتھ رہتے رہے۔اس پُر آشوب دور اور دہلی پر ٹوٹنے والی قیامت کو انہوں نے اپنے ”شہر آشوب دلی“ میں بیان کیا۔بائیس بند کا یہ ’شہر آشوب‘ اس دور کی دلی کی یاد تازہ کر دیتا ہے اس میں داغ کا رنگِ سخن ایک نئے انداز میں سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ اس شہر آشوب کو ”داغ کا اشکِ غم“ (۱) لکھتے ہیں۔

رام پور میں چھوٹی بیگم والدہ داغ کی بہن عمدہ بیگم جو نواب یوسف علی خاں (۲) سے منسلک تھیں ان کا واحد سہارا تھا لہٰذا داغ نے رام پور کا رُخ کیا۔داغ اس سے قبل بھی رام پور میں قیام کر چکے تھے شمس الدین خاں کی پھانسی ۱۸۳۵ء کے بعد خالہ نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا تھا اس وقت اُن کی عمر تقریباً ۴ سال ۴ ماہ تھی۔۱۸۴۰ء میں داغ اپنی خالہ کے ساتھ رام پور پہنچے مولوی غیاث الدین صاحب (صاحب غیاث اللغات) سے فارسی پڑھی۔نواب یوسف علی خاں نے ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی۔قلعہ معلیٰ پہنچنے سے پہلے داغ رام پور میں ہی تھے۔۱۸۵۷ء میں رام پور

میں مستقلاً قیام کے بعد داغ نے آٹھ نو سال بڑے مزے میں بسر کیے آخر کار ۱۸۶۶ء میں اُن کا مستقلاً تقرر ہوا۔ اصطبل اور دیگر کارخانہ جات کی نگرانی ان کے سپرد تھی۔

جب اہلِ رام پور کو حضرتِ داغ کے افسرِ اصطبل ہونے کی اطلاع ہوئی تو رنگ کی سیاہی اور اصطبل کی رعایت سے کسی ستم ظریف نے ایک شعر لکھ کر اصطبل کے دروازے پر لگا دیا جو آج تک بچے بچے کی زبان پر ہے۔

شہرِ دہلی سے آیا اک مُشکی ۔۔۔ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

جب مرزا داغ کی نظر اس پر پڑی تو شعر کی رعایتوں کی داد دی اور اعلان کر دیا کہ میں اس شاعر سے ملاقات کا آرزومند ہوں۔ وہ بے خوف ہو کر مجھ سے ملیں میں ان کی قدر کروں گا لیکن اس شاعر کا پتہ آج تک نہ چلا۔ حالیہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ شعر میر احمد رسا رام پوری شاگرد شیخ بخش بیمار نے لکھا تھا اور کسی شاگرد کے ذریعہ اصطبل کے دروازے پر چسپاں کرا دیا تھا۔"(۳)

نواب یوسف علی خاں ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء میں تخت نشیں ہوئے اس دور میں انہوں نے ادبا٬ علما اور شعرا کی پذیرائی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ شعرا اور اہلِ علم وفن نے رام پور کا رُخ کیا منشی امیر اللہ تسلیم شاگرد نسیم دہلوی٬ ۱۸۵۸ء میں، مرزا رحیم الدین حیا شاگرد نصیر ۱۸۵۵ء میں، سید ظہیر الدین ظہیر شاگردِ ذوق آخر ۱۸۵۷ء میں اور سید شجاع الدین عرف مرزا انور ۱۸۵۸ء میں رام پور پہنچے۔

نواب کلب علی خاں ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۵ء سے ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء تک رام پور کے فرماں روا رہے۔ اس دور میں بھی اہلِ علم وفن نے رام پور کو گوشۂ جنت نظیر بنائے رکھا اور یہاں ادبی محفلوں اور مشاعروں کا قیام عمل میں آتا رہا۔ اس دور میں میر محمد ذکی بلگرامی شاگرد دبیر ۱۸۶۵ء٬۱۲۸۲ھ میں مرزا محسن علی عرف مرزا اجہ ہندی شاگرد مصحفی ۱۸۶۸ء٬۱۲۵۵ھ میں رام پور پہنچے۔ مزید براں سید محمد اسمٰعیل حسین منیر شاگرد ناسخ واشک ۱۸۷۰ء/ ۱۲۸۷ھ میں منشی احمد حسن خاں عروج شاگرد ناسخ واشک ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ھ میں شیخ امداد علی بحر شاگردِ ناسخ ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۳ء میں، منشی امیر اللہ تسلیم

شاگرد نسیم دہلوی، ۱۸۷۳ء/ ۱۲۹۰ھ میں، گوبندلال حیا ۱۸۷۵ء/ ۱۲۹۲ھ میں اور حسین علی خاں شاداں شاگردِ غالب ۱۸۸۰ء/ ۱۲۸۲ھ میں رام پور پہنچے۔ ان شعرا کے علاوہ یہاں کے مقامی شعرا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو دہلوی مزاجِ سخن سے بہ خوبی آشنا تھی۔

''شعرا میں شیخ مہدی علی ذکی مرادآبادی شاگرد ناسخ ۱۸۴۱ء میں آئے۔ مرزا معین حیدر غمگین شاگرد میرزا کلب حسین خاں نوازش تلمیذ سوز آخر ۱۸۴۰ء میں برائے تعلیم صاحب زادہ محمد کاظم علی خاں طلب ہوئے۔ میر حسین تسکین شاگردِ رشیدِ مومن اور میر عبداللہ غمگین پسرِ تسکین دہلی سے آکر باریاب ہوئے۔ شیخ علی بخش بیمار شاگرد غفلت رام پور آنولہ سے آکر داخل ملازمت ہوئے ابھی غفلت اور طالب وغیرہ شاگردانِ شوق زندہ تھے اور نو مشقوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔'' (۴)

شیخ علی بخش بیمار (۵) جو مصحفی کے شاگرد تھے، نے اپنی غزلوں کو پُر سوز بنانے میں میر، حسرت اور جرأت کے رنگ سے فائدہ اُٹھایا اور نئے انداز سے زمزمہ سنجی کی۔ بیمار، آتش، ناسخ، وزیر، مومن، ذوق اور غالب کے ہم عصر تھے۔ ان کا کلام ایک انداز کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس میں نہ صرف میر کی جھلک تھی بلکہ حسرت اور جرأت سے بھی اکتساب فیض کیا تھا۔ سید نظام شاہ نظام (۶) اور سید احمد علی رسا رام پوری (۷) اس طرز کو نبھانے کی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ کلامِ نظام کو مقامی قبولیتِ عامہ کی سند حاصل ہوئی۔ ان کا کلام نوابانِ رام پور کے دربار تک بھی پہنچا لیکن انہوں نے باہر نکل کر اپنے رنگِ سخن کو دیگر ادبی مراکز میں پھیلانے کی سعی نہیں کی بلکہ اسی پر قناعت کر بیٹھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں شاعر حکومت کی سرپرستی سے محروم تھے۔

بہر حال رام پور میں سید نظام شاہ نظام اور سید احمد علی رسا کے رنگ کو پسند کیا جاتا تھا وہ اساتذہ دہلی کا رنگ سخن لیے تھے لہٰذا رام پوری شعرا خارجیت کے مقابلے میں داخلیت، رعایت لفظی اور صنعت گری سے زیادہ سلاستِ زبان و بیان کو پسند کرتے تھے۔ داغ جب تک دہلی میں رہے انہوں نے اساتذہ دلی و لکھنؤ و رام پور کی زمینوں پر طبع آزمائی کی اور اپنی پہچان بنانے کے

لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے جس شعری ماحول میں پرورش پائی تھی اوہ اس میں گھر کر گئے۔ رام پور میں داغ نے جس شاعر کی زمینوں پر طرحی غزلیں لکھیں اور جن کا رنگ اختیار کیا وہ نظام شاہ نظام رام پوری تھے۔

''نظام اپنے معاصرین میں منفرد حیثیت کا مالک ہے اور جو رنگ داغ کو معاصرین سے ممتاز کر گیا ہے اس کا بانی نظام رام پوری ہے۔'' (۸)

نظام ۲۰ سال کی عمر میں پیرو مرشد میاں احمد علی شاہ سے بیعت ہوئے اور انہیں سے شعروشاعری میں بھی استفادہ کیا۔ یہ ۱۸۳۰ء کا واقعہ ہے۔ بعدازاں انہوں نے شیخ علی بخش بیمار کی شاگردی اختیار کی۔ داغ بچپن میں چند سال (۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۴ء تک/ ۹ سال سے ۱۳ سال تک) رام پور میں رہ کر فارسی کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ بعدازاں رام پور میں مستقلاً قیام کے بعد داغ نے مشاعروں میں دادِ سخن حاصل کی۔ نواب یوسف علی خاں تخلص ناظم بھی رام پور میں عوام الناس کے مزاج سے بہ خوبی واقف تھے۔ بہت ممکن ہے مرزا غالب یا یوسف علی خاں نے ہی داغ کو نظام رام پوری کے رنگِ سخن کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو یا داغ نے ذاتی تجربات کی بنا پر عملی جامعہ پہنایا ہو۔

''خاص طور پر نواب عبداللہ خاں جو نواب محمد سعید علی خاں کے بڑے بھائی تھے ان سے غالب کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے علاوہ دتی میں نواب یوسف علی خاں کے استادوں میں منشی صدرالدین خاں آرزو، مولوی فضل حق خیر آبادی کے ساتھ مرزا غالب بھی ان کے فارسی کے استاد تھے۔ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں ریاست رام پور کے رو بہ رو ہوئے تو مولانا فضل حق خیر آبادی کی کوششوں سے مرزا غالب کے نواب یوسف علی خاں سے تعلقات کی تجدید ہوئی۔ مولانا کی ترغیب پر مرزا غالب نے ۲۸ جنوری ۵۷ء کو پہلا خط نواب یوسف خاں کو لکھا۔ جواب میں نواب یوسف خان نے ۵ فروری ۵۷ء کو اپنے اشعار بہ غرض اصلاح مرزا غالب کی خدمت میں بھیجے۔ ۱۲ فروری ۵۷ء کو مرزا غالب نے غزل

موصول ہونے کی اطلاع دی۔ ۱۵ فروری ۷۵ء کو اصلاح شدہ غزل واپس کی اور تخلص کے لیے چند نام تجویز کیے۔ جواب میں نواب صاحب نے ناظم تخلص پسند کرنے کا خط بھیجا۔" (۹)

خطوط غالب مرتبہ خلیق انجم سے غالب کے گیارہ رام پوری تلامذہ کا ذکر ملتا ہے لہٰذا اپنے تلامذہ سے ملنے کی خواہش بھی یقیناً اُن کے دل میں تھی۔ ایسی صورت حال میں غالب رام پور پہنچنے کو بے تاب تھے۔ غالب پہلی بار جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں کے مہمان ہوئے۔ مارچ ۶۰ء میں دلی کے لیے روانہ ہوئے۔ بقول مولفِ "حالاتِ مشائخ" سردار شاہ خاں: غالب نے رام پور سے روانہ ہونے سے قبل دریافت کیا کہ کوئی صاحب کمال ایسا تو نہیں رہا جس سے میری ملاقات نہ ہوئی ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ جلیل القدر شاعر و بزرگ حضرت شاہ احمد علی خاں صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہو سکی اور وجہ یہ بتائی کہ وہ گوشہ نشیں شخصیت ہیں۔ اب ایسے شخص کی تلاش تھی جو غالب کی ملاقات اُن سے کروا سکے۔ حضرت کے شاگردِ رشید سید نظام شاہ نظام سے رابطہ کیا گیا اور انہوں نے اس ملاقات کا اہتمام کیا۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا غالب رام پور کے عمائدین سے بہ خوبی واقف تھے۔ اس واقعہ کے وقت نظام کی عمر ۴۱ سال تھی اور رام پور پر اُن کا رنگِ سخن چھایا ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ غالب کے رام پوری تلامذہ میں کوئی بھی اُن کے مخصوص رنگ کو اپنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری بار غالب نواب کلب علی خاں کی تاج پوشی کے موقع پر رام پور گئے۔ یہ نومبر ۱۸۶۵ء کا واقعہ تھا۔ دسمبر ۱۸۶۵ء میں دلی واپس چلے گئے۔ (۱۰)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ غالب نے رام پور کے شعری ماحول پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ نظام نے بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ غالب سے استفادہ کیا۔ "نظام رام پوری کے دیوان پر جو غالب کی اصلاحیں ہیں اس کا عکس شبیر علی خاں شکیب نے اپنی کتاب 'رام پور کا دبستانِ شاعری' میں پیش کیا ہے۔" (۱۱)

نواب یوسف علی خاں ناظم کی صحبت میں داغ بھی رام پور کے عوام الناس کے شعری مزاج کو جان چکے تھے لہٰذا انہوں نے بھی نظام رام پوری کی بہت سی غزلوں پر ہم طرح غزلیں لکھیں۔

(۱۲) ناقدین رام پور میں داغ کی شہرت کی وجوہات ڈھونڈتے ہوئے نظام کی شاعری کے حوالے سے یہ بات بھی کہتے نظر آتے ہیں۔

''ان شعرا (بیرونی اساتذہ رام پور) سے نظام کس حد تک متاثر ہوئے اور انہیں کہاں تک متاثر کیا؟ اس کا ثبوت کلیاتِ نظام دیتا ہے۔ لکھنوی شعرا کو داغ نے متاثر کیا یا تسکین دہلوی اور شیخ علی بخش بیمار اور ان کے شاگردوں نے؟'' (۱۳)

''داغ نے جس جدید رنگ کی بدولت رام پور میں مقبولت حاصل کی تھی اور جس نے امیر اور جلال کو متاثر کیا تھا۔ اُن کا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ اختیار کردہ تھا اور یہ رام پور کے ماحولِ شعر و سخن کی دین تھا۔'' (۱۴)

نظام رام پوری کی ولادت ۱۸۱۹ء میں ہوئی جب داغ کی تاریخ ولادت ۱۸۳۱ء تھی۔ یعنی نظام عمر میں داغ سے تقریباً ۱۲ سال بڑے تھے۔ داغ جب پہلی بار (۱۸۴۰ء) رام پور آئے تو اُن کی عمر ۹ سال تھی اور نظام ابھی ۲۱ سال کے نوجوان شاعر تھے۔ لیکن داغ جب دوسری بار رام پور آخر ۱۸۵۷ء میں پہنچے تو نظام زندگی کی ۳۸ بہاریں دیکھ چکے تھے اور اُن کا رنگِ سخن رام پور میں قبولیت عامہ حاصل کر چکا تھا۔

داغ شاعری میں دہلی کی روزمرہ محاوراتی زبان کو ہی برتتے تھے۔ داغ کی شاعری پر نظام کے رنگِ سخن نے کیا اثرات مرتب کیے نظام کی زمینوں پر داغ کی لکھی ہوئی غزلیات اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

غزلیاتِ نظام (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب، لاہور	دیوانِ اوّل (گلزارِ داغ)
یہ اپنا حال کیا ایسا انتظار کیا یہ کیا کیا ترے کہنے پہ اعتبار کیا کل اشعار: ۱۲۔۔ص: ۱۱۔۔غزل نمبر ۹	غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا کل اشعار: ۲۹۔۔غزل نمبر: ۳۷
کیا درد میرے دل کا خدایا نہ جائے گا اُس بت کو تجھ سے راہ پہ لایا نہ جائے گا کل اشعار: ۱۱۔۔ص: ۱۵۔۔غزل نمبر ۱۳	اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا میں جاؤں گا اگر مرا سایا نہ جائے گا کل اشعار: ۹۔۔غزل نمبر ۱۰

وہ نہیں آتا گر نہیں آتا
جا کے کیوں نامہ بر نہیں آتا
کل اشعار:۱۱۔۔ص:۱۹۔۔غزل نمبر۱۵

وہ زمانہ نظر نہیں آتا
کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا
کل اشعار:۱۱۔۔گلزار داغ ۴۴

مرنے کا لطف زیست سے مجھ کو سوا ہوا
گھبرا کے اس کا کہنا کہ "ہے ہے یہ کیا ہوا"
کل اشعار:۱۷۔۔ص:۳۶۔۔غزل نمبر۳۰

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا
کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا
کل اشعار:۹۔۔غزل نمبر:۳۳

مجھ سے کیوں کہتے ہو مضموں غیر کی تحریر کا
جانتا ہوں مدّعا میں آپ کی تقریر کا
کل اشعار:۱۴۔۔ص:۳۹۔۔غزل نمبر۳۲

سرخی لب نے کیا ہے خون اس نخچیر کا
تیز ہے پیکاں سے بھی سوفار اس کے تیر کا
کل اشعار:۱۲۔۔غزل نمبر:۳۶

یہ تو مانا کہ وفا آپ کا وعدہ ہوگا
یہ تو فرمایئے کب ہوگا؟ کب ایسا ہوگا
کل اشعار:۱۵۔۔ص:۵۳۔۔غزل نمبر۴۵

کیوں کر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا
زہر دی اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا
کل اشعار:۹۔۔(قافیہ تبدیل) غزل نمبر:۳۹

اعدا کی شوخیاں تھیں حسد کا ظہور تھا
اب کہیے تم جو روٹھے تھے کس کا قصور تھا
کل اشعار:۱۰۔۔ص:۵۷۔۔غزل نمبر۴۹

جب تک کسی کی چاہ نہ تھی کیا سرور تھا
میرا ہی دل بغل میں مری رشکِ حور تھا
کل اشعار:۱۵۔۔غزل نمبر:۸۲

☆ غالب کی غزل اس زمین میں یوں ہے۔ یہ غزل ۱۸۲۱ء کی ہے

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش، در بھی دور تھا
اک، گھر میں، مختصر سا بیاباں ضرور تھا

راضی جو وصل پر بت پیماں شکن ہوا
وہ بدگماں ہوں اور بھی رنج و محن ہوا
کل اشعار:۱۷۔۔ص:۶۷۔۔غزل نمبر:۳۶

کن بے کسوں کا پردہ یہ چرخِ کہن ہوا
جیتوں کا پیرہن نہ مردوں کا کفن ہوا[1]
کل اشعار:۲۳۔۔غزل نمبر:۴۹

ہم کو شب وصال بھی رنج و محن ہوا
قسمت، خلافِ طبع ہوا جو سخن ہوا
کل اشعار:۱۴۔۔ص:۶۹۔۔غزل نمبر:۵۹

ایضاً

---

[1] شعر تصحیح طلب ہے (ادارہ)

تصور ہے ہمیں ہر دم تمہارے روئے تاباں کا
رہا کرتا ہے ہم کو ہر گھڑی اب ورد قرآں کا

کل اشعار:۴۔ (ص ۸۰۔ غزل نمبر:۷۰

کب بھلا مجھ کو قضا نے مارا
مجھے تو تیری جفا نے مارا

کل اشعار:۷۔ص ۸۷۔غزل نمبر:۸۰

حال دل سن کر نہ دینا اس ستم گر کا جواب
اک خموشی ہو گئی دفتر کے دفتر کا جواب

کل اشعار:۲۲۔ص ۹۴۔غزل نمبر: ۸۸

جب میں کہتا ہوں کب ملیں گے آپ
ہنس کے کہتے ہیں جب ملیں گے آپ

کل اشعار:۲۱۔ص ۹۷۔غزل نمبر:۹۰

خوشی کیا جو وصلت کی آئے گی رات
سحر کو بھی ہمراہ لائے گی رات

کل اشعار:۲۱۔ص ۱۰۱۔غزل نمبر:۹۳

نہ کہتا پھر کہ مری تیغ کی بچائی چوٹ
لو اب تو خوش ہوئے دل پر ہی ہم نے کھائی چوٹ

کل اشعار:۲۱۔ص ۱۰۶۔غزل نمبر:۹۶

دل ہاتھوں میں تھامے ہوئے وہ آئیں ادھر آج
اے جذب محبت مجھے دکھلا دے اثر آج

کل اشعار:۲۹۔ص ۱۱۳۔غزل نمبر:۹۹

بنا کس دن تن مجنوں میں یہ رشتہ رگِ جاں کا
جنوں تیرے ہی سر سہرا رہا تار گریباں کا

کل اشعار:۲۱۔۔۔غزل نمبر: ۲۲

☆غالب کی غزل اس زمین میں ہے۔ یہ غزل بعد از ۱۸۲۶ء کی ہے۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

جال زلفِ سیاہ نے مارا
تیر کافر نگاہ نے مارا

کل اشعار:۹۔۔۔غزل نمبر:۳۲

نامہ بر کہتا ہے اب لاتا ہوں دلبر کا جواب
سن چکا میں چار دن آگے مقدر کا جواب

کل اشعار:۹۔۔۔غزل نمبر:۹۴

مہرباں ہو کے جب ملیں گے آپ
جو نہ ملتے تھے سب ملیں گے آپ

کل اشعار:۱۱۔۔۔غزل نمبر۔۔۹۷

گئی ہے نہ فرقت کی جائے گی رات
سحر کو بھی دھبہ لگائے گی رات

کل اشعار:۱۳۔۔۔غزل نمبر:۱۰۱

نگاہِ یار نے اس شوق سے لگائی چوٹ
کہ جس طرح سے دل آتا ہے دل پہ آئی چوٹ

کل اشعار:۱۷۔۔۔غزل نمبر۔۔۱۰۳

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج
یہ برقِ بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

کل اشعار:۳۰۔۔۔غزل نمبر۔۔۱۰۵

☆غزل کے مطلع پر استاد ذوق کی اصلاح موجود ہے۔ داغ کی غزل کا مصرع دوم تھا۔

یہ برق ادا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

میں تو دامن کھینچوں تُو شمشیر کھینچ
پھر گلے پر میرے بے تقصیر کھینچ

کل اشعار ۱۲۔ (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب ص ۱۲۱) غزل ۱۰۲

تم پہ کیا جان نہ دے گا کوئی اچھا ہو کر
اتنا بیمار سے پرہیز مسیحا ہو کر

کل اشعار ۱۴۔ (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب ص ۱۳۳) غزل ۱۱۲

وہ غیر ہوگا جو شب بھر رہا ترے در پر
وہ منصفی ہے اب الزام ہے مرے سر پر

کل اشعار ۱۲۔ (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب ص ۱۳۵) غزل ۱۱۳

ستم کی ہے فلکِ روسیاہ کی گردش
اثر پذیر ہو کیا دودِ آہ کی گردش

کل اشعار ۱۱۔ (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب ص ۱۴۰) غزل ۱۱۸

وہ آنکھ اُٹھا کے ذرا بھی جدھر کو دیکھتے ہیں
تو کیا ہی پاس سے ہم اُس نظر کو دیکھتے ہیں

کل اشعار ۱۱۔ (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب ص ۱۹۸) غزل ۱۷۱

کچھ مجھ سے مقصد آپ کا ہوتا اگر نہیں
تو مجھ کو تم ستاتے کبھی اس قدر نہیں

کل اشعار ۲۵۔ (کلیاتِ نظام، مجلس ترقی ادب ص ۱۹۹) غزل ۱۷۲

یوں مصور یار کی تصویر کھینچ
کچھ ادا کچھ ناز کچھ تقریر کھینچ

کل اشعار: ۱۵۔۔۔غزل نمبر۔۔۱۰۸

حیف شرمندہ نہیں تو ستم آرا ہو کر
ہم پہ کرتا ہے ستم یار ہمارا ہو کر

کل اشعار: ۹۔۔۔غزل نمبر۔۔۱۲۸

مرے ہی واسطے بیٹھا ہے پاسباں در پر
ملے جو راہ میں کہتے ہیں آیئے گھر پر

کل اشعار: ۱۹۔۔۔غزل نمبر۔۔۱۳۲

وہ سمجھے کیا فلکِ کینہ خواہ کی گردش
اُٹھائی جس نے تمہاری نگاہ کی گردش

کل اشعار: ۲۱۔۔۔غزل نمبر۔۔۱۳۹

پھرا ہوا جو کسی کی نظر کو دیکھتے ہیں
لگا کے تیر ہم اپنے جگر کو دیکھتے ہیں

کل اشعار: ۱۷۔۔۔غزل نمبر۔۔۲۰۲

☆ غالب کی غزل اس زمیں میں موجود ہے۔ یہ ۱۸۳۳ء کی غزل ہے۔

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

☆ ذوق کی غزل بھی اس زمیں میں موجود ہے

گہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے ہیں جو مبصر بشر کو دیکھتے ہیں

کیوں نا امید ہوں وہ خدا ہے بشر نہیں
فردوس واعظو! کوئی قاروں کا گھر نہیں

کل اشعار: ۱۱۔۔۔غزل نمبر۔۔۲۱۲

جب تو میں ہوں آہ میں ایسا اثر پیدا کروں
اے ستم گر! تیرے دل میں اپنا گھر پیدا کروں

کل اشعار ۱۵۔ (کلیاتِ نظام مجلس ترقی ادب ص ۲۲۱) غزل ۱۹۳

خاک میں مل، اے دل گر مدعا پیدا کروں
جب مٹا لوں ایک کو تو دوسرا پیدا کروں

کل اشعار: ۱۱ ۔۔۔ غزل نمبر ۔۔ ۲۱۰

یاد ہے چاہتے تھے یوں ہی کبھی تم مجھ کو
غیر کے حال پہ آتا ہے ترحم مجھ کو

کل اشعار ۲۰۔ (کلیاتِ نظام مجلس ترقی ادب ص ۲۲۲) غزل ۱۹۸

کیا ڈبوئے گا ترے عشق کا قلزم مجھ کو
موج ساحل ہے سفینہ ہے طلاطم مجھ کو

کل اشعار ۲۰ ۔۔۔ غزل نمبر ۔۔ ۲۲۷

اس کا گلہ نہیں نہ ہو وعدہ وفا نہ ہو
اتنا تو ہو کہ رشک مجھے غیر کا نہ ہو

کل اشعار ۲۰۔ ص ۲۲۲۔ غزل ۲۱۱

پوشیدہ جب ہو راز نہ منہ میں زباں نہ ہو
ہم بات بھی کریں تو بغیر از فغاں نہ ہو

کل اشعار: ۱۵۔ (قافیہ تبدیل) ۔۔۔ غزل نمبر ۔۔ ۲۲۶

☆مومن کی غزل اس زمین میں موجود ہے

خالی ہوائے فتنہ سے خالی جہاں نہ ہو
اس دم قیامت آئے اگر آسماں نہ ہو
ایضاً

سو جھگڑے وصل میں بھی ہوں کچھ مدعا نہ ہو
کتنا ہی وعدہ ہو مگر اُس پر وفا نہ ہو

کل اشعار ۲۲۔ ص ۲۴۳۔ غزل ۲۲۲

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

کل اشعار ۱۲۔ ص: ۲۶۳۔ غزل ۲۲۸

یاں تو نبھا ہے جاتے ہیں عشق بتاں کے ساتھ
زاہد نبیڑ لیں گے وہاں کی وہاں کے ساتھ

کل اشعار: ۱۳۔ (قافیہ و ردیف تبدیل) ۔۔۔ غزل نمبر ۔ ۲۳۵

تکلیف روز سہنی شب انتظار کی
یہ ساری خوبیاں ہیں مرے اعتبار کی

کل اشعار ۱۹۔ ص: ۲۷۹۔ غزل ۲۳۱

اُڑتی ہے خاک جب کہ ترے خاکسار کی
مشتِ غبار پھر نہیں سنتا سوار کی

کل اشعار: ۹ ۔۔۔ غزل نمبر ۔۔ ۲۷۵

مجھ پہ یہ کچھ جو اذیت ہو گی
غیر کو تم سے ندامت ہو گی

کل اشعار ۱۰۔ ص: ۳۰۵۔ غزل ۲۶۲

مجھ کو جنت میں نہ راحت ہو گی
گر یہی دل یہی قسمت ہو گی

کل اشعار: ۹ ۔۔۔ غزل نمبر ۔۔ ۲۲۹

دوستو اُس سے نہ ملنا چاہیے
پر مرے دل سے تو پوچھا چاہیے

کل اشعار ۱۰۔ ص: ۳۳۳۔ غزل ۲۹۰

قول تیرا شوق میرا چاہیے
جھوٹ سچ کے واسطے کیا چاہیے

کل اشعار: ۱۳۔۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۳۲۳

☆ غالب کی غزل اس زمین میں موجود ہے۔ یہ غزل بعد از ۱۸۲۱ء کی ہے۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

محفل میں آتے جاتے ہیں انساں نئے نئے
اب تو چلن لیے ہیں مری جاں نئے نئے

کل اشعار ۱۲۔ ص: ۳۴۰۔ غزل ۲۹۷

لائے گی پیچ زلفِ پریشاں نئے نئے
یہ سادگی دکھائیں گے ساماں نئے نئے

کل اشعار: ۱۱۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۳۷۴

مزا کیا جو یوں ہی سحر ہو گئی!
نہیں بھی پہر دو پہر ہو گئی

کل اشعار ۲۳۔ ص: ۳۴۳۔ غزل ۲۹۹

جہاں لگ گئی کارگر ہو گئی
مری آہ تیری نظر ہو گئی

کل اشعار: ۱۲۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۳۲۲

روتے ہیں آگے مرے اُلفت جتانے کے لیے
یہ نئے انداز ہیں میرے ستانے کے لیے

کل اشعار ۱۳۔ ص: ۳۴۶۔ غزل ۳۰۰

اے فلک دے ہم کو پورا غم تو کھانے کے لیے
وہ بھی حصہ کر دیا سارے زمانے کے لیے

کل اشعار: ۱۷۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۲۷۵

بے وجہ تم کو میری طرف سے ملال ہے
یاں یاد بھی نہیں تمہیں وہ ہی خیال ہے

کل اشعار ۱۳۔ ص: ۳۵۱۔ غزل ۳۰۵

وہ قیامت توڑتے ہیں پوچھ کر کیا حال ہے
پرسشِ دل سے الٰہی پرسشِ اعمال ہے

کل اشعار: ۱۸۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۳۳۳

فکر یہی ہے ہر گھڑی، غم یہی صبح و شام ہے
گر نہ ملا وہ کچھ دنوں کام یہاں تمام ہے

کل اشعار ۱۲۔ ص: ۳۵۷۔ غزل ۳۰۹

ترے جلوے کو بت حلیہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے کبھی صبح ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

کل اشعار: ۸۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۳۲۸

یا رب! جو دل دیا ہے تو دل کو قرار دے
اور گر قرار دے تو شب انتظار دے

کل اشعار ۱۳۔ ص: ۳۷۵۔ غزل ۳۳۱

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

کل اشعار: ۱۱۔۔۔ غزل نمبر۔۔۔ ۳۲۹

لگاوٹ یاد ہے وہ ابتدا کی
وہ باتیں پیار کی قسمیں جفا کی

کل اشعار ۲۶۔ ص: ۳۴۳۔ غزل ۳۳۵

جفا کی ان بتوں نے یا وفا کی
دیا دل اب تو جو مرضی خدا کی

کل اشعار: ۱۴۔۔۔غزل نمبر۔۔۲۷۳

☆ مومن کی غزل اس زمین میں موجود ہے
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

سچ ہے بجا ہے مجھ سے شکایت جناب کی
سہہ سہہ کے میں نے ظلم، ہے عادت خراب کی

کل اشعار ۱۶۔ ص: ۳۹۰۔ غزل ۳۳۸

شوخی میں ان کی چھیڑ ہے کچھ اضطراب کی
گھر کر گئی وفا کسی خانہ خراب کی

کل اشعار: ۱۳۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۱۴

☆ ذوق کی غزل اس زمین میں موجود ہے
حالت کہتے ہیں دیکھنا اس بے حجاب کی[1]
پر ناز و ہر ادا میں ہے مستی شراب کی

آرزو دل کی بر نہیں آتی
جان رہتی نظر نہیں آتی

کل اشعار ۱۴۔ ص: ۴۰۰۔ غزل ۳۴۱

وہ نگہ راہ پر نہیں آتی
نظر آتی نظر نہیں آتی

کل اشعار: ۱۳۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۱۱

☆ غالب کی غزل اس زمین میں موجود ہے۔ یہ غزل ۱۸۴۷ء کی ہے
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

تنہا نہ اُس کی چاہ نے رسوا کیا مجھے
اپنی بھی آہ آہ نے رسوا کیا مجھے

کل اشعار ۹۔ ص: ۴۰۱۔ غزل ۳۴۲

بے وجہ اجتناب نے رسوا کیا مجھے
ظالم ترے حجاب نے رسوا کیا مجھے

کل اشعار: ۹۔ (قافیہ تبدیل)۔۔غزل نمبر۔۔۳۹۰

☆ غالب کی غزل اس زمیں میں موجود ہے۔ یہ غزل ۱۸۶۱ء کی ہے
ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

---

[1] مصرع تصحیح طلب ہے (ادارہ)

ع شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
غزل کے اس مصرع کو قافیہ وردیف بنایا گیا ہے۔(مصرع طرح)

دل رہائی کا یہی طرز تمہیں یاد رہے
کچھ دنوں لطف رہے کچھ دنوں بیداد رہے
کل اشعار۱۷۔ص:۴۰۲۔ غزل ۳۳۴

کون تسنیم کے چھینٹوں پہ عبث شاد رہے
کچھ کمی یاں بھی نہیں مے کدہ آباد رہے
کل اشعار:۱۰۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۳۵

ایضاً

یار کا پاسِ نزاکت دل ناشاد رہے
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے
کل اشعار:۱۳۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۳۶

جان پر اپنی وہ آساں ہے جو مشکل آئے
پر خدا سے یہ دعا ہے نہ کہیں دل آئے
کل اشعار۱۲۔ص:۴۰۵۔ غزل ۳۳۵

صبر کیا آئے مجھے سانس پہ مشکل آئے
تو تو انسان ہے پتھر پہ اگر دل آئے
کل اشعار:۹۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۲۸

پھر کہتے ہو ہم پاس کسی کا نہیں کرتے
کیوں وصل کی شب بھی مرا کہنا نہیں کرتے
کل اشعار۱۶۔ص:۴۱۱۔ غزل ۳۴۹

بے درد ہیں جو درد کسی کا نہیں رکھتے
ایسے بھی ہیں یا رب کہ تمنا نہیں رکھتے
کل اشعار:۹۔(ردیف تبدیل)۔غزل نمبر۔۳۱۶

دل دیا ہاں یہ کیا کیا میں نے
تمہیں دلبر بنا دیا میں نے
کل اشعار۱۳۔ص:۴۱۴۔ غزل ۳۵۱

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
کل اشعار:۲۱۔(ردیف تبدیل)۔غزل نمبر۔۲۸۳

☆ داغ نے یہ حمدیہ غزل ۱۸۷۲ء میں نواب حیدرآباد کے ساتھ حج بیت اللہ سے واپسی پر کہی

ذرا سمجھ تو ضد اُن کی ہزار باقی ہے
ابھی تو شب بھی دل بے قرار باقی ہے
کل اشعار۵۔ص:۴۲۸۔ غزل ۳۷۵

جنوں میں تن پہ لباس غرور باقی ہے
کب اپنے کفن کو بھی تار باقی ہے[۳]
کل اشعار:۱۷۔۔۔غزل نمبر۔۔۲۶۷

---

۳ مصرع تصحیح طلب ہے (ادارہ)

جو منہ سے کہا ہے وہی اب کر کے اُٹھیں گے
اب بیٹھ گئے در پہ ترے مر کے اُٹھیں گے

کل اشعار ۱۲۔ص:۴۳۹۔ غزل ۳۷۷

تھک تھک کے نہ بیٹھیں گے نہ مر مر کے اُٹھیں گے
اب ظلم نہ ہم سے دلِ مضطر کے اُٹھیں گے

کل اشعار:۹۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۷۲

گئے ہیں وہ ابھی یاں سے پتا نہیں ملتا
یہ کس نے بوسے مری طرح نقشِ پا کے لیے

کل اشعار ۱۲۔ص:۴۳۹۔ غزل ۳۷۸

کیا تھا جرمِ وفا لذتِ سزا کے لیے
ستم کے لطف اُٹھائے مزے جفا کے لیے

کل اشعار:۱۷۔۔۔غزل نمبر۔۔۳۴۵

ہزاروں وہم ہوئے گر ہوا وصال مجھے
ستائے بن نہیں رہتا ترا خیال مجھے

کل اشعار ۷۔ص:۴۴۰۔ غزل ۳۸۰

ہوا جو ان کی خموشی سے کچھ ملال مجھے
جواب دینے لگی طاقتِ سوال مجھے

کل اشعار ۱۳۔۔۔غزل ۳۸۲

گلزارِ داغ میں تقریباً ۴۹ غزلیات شاہ نظام کی زمینوں پر موجود ہیں۔ یہ رنگِ سخن رام پور میں سبھی شعرا نے اپنانے کی سعی کی۔ دہلوی شعرا کے اثرات رام پور پر بڑے دیرپا اور گہرے تھے۔ شاہ نظام نے بھی انھیں خصائصِ شعری کو اپنایا اور دیگر رام پوری شعرا پر اپنی دھاک بیٹھا دی۔

دیوانِ اوّل میں داغ نے اپنے دور کے اُن اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں لکھیں، جنھوں نے کسی نہ کسی حوالے سے شعرا کو متاثر کیا۔ ذوق کا اثر زبان و بیان کے حوالے سے مستند تھا اور وہ داغ کے استاد بھی تھے۔ مومن کے تغزل اور نازک خیالی وجدتِ ادا کو ہر شاعر نے اپنانے کی سعی کی۔ غالب کی پیروی اُس دور میں بھی ہر شاعر نے کی۔ داغ نے جہاں ذوق غالب اور مومن کی غزلوں پر طبع آزمائی کی۔ رام پور آنے کے بعد یہاں کے کامیاب شعرا کے رنگِ سخن کو بھی بہ خوبی نبھایا۔

''میاں نظام شاہ نظام جو رنگِ جرأت کے خاتم ہیں اُن کا رنگِ کلام اور قبولیتِ عام فصیح الملک کی صحیح رہبر تھی۔'' (۱۵)

غزلیاتِ نظام (کلیاتِ نظام مجلس ترقی ادب لاہور)

سوچ دیکھو یہی اب ہے یہ طریقا کیسا
میں کہوں حالِ دل اپنا، کہو تم ''کیا؟ کیسا؟''

کل اشعار۔۱۱۔ص:۷۷۔غزل۔۶۶

دیوانِ دوم (آفتابِ داغ)

ایک ہی رنگ ہے سب کا یہ تماشا کیسا
کوئی کیسا ہے کوئی چاہنے والا کیسا

کل اشعار۔۲۱۔غزل نمبر۔۷

صدمہ یہی رہا تو سحر تک بھی ہم نہیں
سچ ہے تمہارے ہجر کا کچھ ہم کو غم نہیں

کل اشعار۔۱۹۔ص:۱۷۱۔غزل۔۱۴۸

اُس کی شرارتیں بھی قیامت سے کم نہیں
دل تجھ سے بڑھ کے ہے کسی صورت سے کم نہیں

کل اشعار۔۱۲۔(قافیہ تبدیل) غزل نمبر۔۴۳

آج کہتے ہو مدّعا کہیے
اس تغافل کو کہیے کیا کہیے

کل اشعار۔۱۲۔ص:۳۰۱۔غزل۔۲۵۸

ناروا کہیے نا سزا کہیے
کہیے کہیے مجھے بُرا کہیے

کل اشعار۔۱۸۔غزل نمبر۔۱۱۴

میری بھی سی قاصد کو کہے جا مرے آگے
کچھ اور کہا ہو تو نہ کہنا مرے آگے

کل اشعار۔۱۷۔ص:۳۰۹۔غزل۔۲۶۶

آئے بھی وہ تو منہ کو چھپائے مرے آگے
اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے

کل اشعار۔۱۸۔(قافیہ تبدیل) غزل نمبر۔۵

غالب کی غزل اس زمین میں موجود ہے۔
یہ غزل ۱۸۵۳ء کی ہے
بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مزا کیا جو جو یوں ہی سحر ہو گئی
نہیں بھی پہر دو پہر ہو گئی

کل اشعار۔۲۲۔ص:۳۴۳۔غزل۔۲۹۹

شب وصل ضد میں بسر ہو گئی
نہیں ہوتے ہوتے سحر ہو گئی

کل اشعار۔۱۵۔غزل نمبر۔۷

جب سے اُس بت پہ طبع آئی ہے
دشمن جاں مری خدائی ہے

کل اشعار۔۷۔ص:۴۲۴۔غزل۔۳۶۰

اس کے در تک کسے رسائی ہے
وہ ہی جائے گا جس کی آئی ہے

کل اشعار۔۹۔غزل نمبر۔۸۴

'گلزارِ داغ' کی نسبت 'آفتابِ داغ' میں طرحی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایک غزل ایسی بھی ہے جو داغ اور نظام کی کلیات میں ملتی ہے خواجہ میر درد کی زمیں میں کہی تھی۔(۱۶)

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے　　یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کی کیا چلے

نظام اور داغ کی غزلوں کے مطلع یوں ہیں:

یہ چلتے وقت آپ مجھے کیا سنا چلے
ہم وہ نہیں کہ ہم پہ کسی کا کہا چلے
کل اشعار۔۱۰۔ص:۳۳۶۔غزل۔۳۶۲

یوں چلیے راہِ شوق کہ جیسے ہوا چلے
ہم بیٹھ بیٹھ کر جو چلے بھی تو کیا چلے
کل اشعار۔۹۔غزل نمبر۔۱۰۱

پہلے دو دیوانوں میں داغ نے اپنے رنگِ سخن کی آب یاری نہ صرف اساتذہ کی پیروی سے کی بلکہ اپنے لیے ایک ایسا منفرد رنگ سخن انتخاب کیا جس میں نہ پہلے کوئی اُن کا ثانی تھا اور نہ بعد میں کوئی اس کی تقلید کر سکا۔ ایک ایسا رنگ سخن جس میں صرف (اساتذۂ قدیم کی) تقلید نہیں تھی بلکہ زندگی کے شب و روز کا نچوڑ بھی شامل تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال ۱۸۸۷ء کے بعد رام پور کی رونقیں برقرار نہ رہیں۔ داغ کا دیوان دوم ''آفتابِ داغ'' ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا لہٰذا آخری تین یا چار سال کا کلام دیوانِ سوم ''مہتاب داغ'' (۱۷) میں شامل ہوا۔

غزلیات نظام (کلیاتِ نظام مجلس ترقی ادب لاہور)	دیوان سوم (مہتاب داغ)
یاں کسے غم ہے جو گریے نے اثر چھوڑ دیا ہم نے تو شغل بھی اے دیدۂ تر چھوڑ دیا کل اشعار۔۹۔ (کلیاتِ نظام مجلس ترقی ادب، ص۔۵۔ غزل:۳	دل کو تا کا تو مری جان! جگر چھوڑ دیا اس طرف بھی نہ کوئی تیرِ نظر چھوڑ دیا کل اشعار۔۱۲۔غزل نمبر۔۱۲
میں نے ہی کیوں شکوہ بے جا کیا آپ نے تو جو کیا اچھا کیا کل اشعار۔۱۰۔ص:۲۸۔غزل۔۲۳	آئینۂ دل نے تماشا کیا اپنی جگہ میں اُسے دیکھا کیا کل اشعار۔۲۲۔غزل نمبر۔۴۹
مرنے کا لطف زیست سے مجھ کو سوا ہوا گھبرا کے اُس کا کہنا کہ ''ہے ہے یہ کیا ہوا'' کل اشعار۔۱۷۔ص:۳۶۔غزل۔۳۰	کوئی پھرے نہ قول سے بس فیصلہ ہوا بوسہ ہمارا ، آج سے دل آپ کا ہوا کل اشعار۔۱۸۔غزل نمبر۔۵۲
یوں تو تھا دشمنِ جاں ایک زمانہ میرا آج کچھ بار ہوا تم پہ بھی آنا میرا کل اشعار۔۱۷۔ص:۴۰۔غزل۔۳۲	لے چلا جان مری روٹھ کے جانا تیرا ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا کل اشعار۔۱۵۔غزل نمبر۔۱۵
دل تجھ سے بے وفا کو دیا ہم نے کیا کیا آپ اپنی جاں پہ ظلم کیا ہم نے کیا کیا کل اشعار۔۷۶۔ص:۸۳۔غزل۔۷۶	غم اُس پر آشکار کیا ہم نے کیا کیا غافل کو ہوشیار کیا ہم نے کیا کیا کل اشعار۔۱۷۔غزل نمبر۔۳۶

اُدھر سے ناز اِدھر سے نیاز مندی ہے
وہ لیں نہ لیں ہمیں جھک کر سلام کر لینا
کل اشعار۔۱۔ص:۹۱۔غزل۔۱۔۸۵

اُدھر کی سُدھ بھی ذرا اے پیام بر لینا
خدا کے واسطے جلدی مری خبر لینا
کل اشعار۔۱۵۔غزل نمبر۔۳۶

حال اُس شوخ سے اظہار کروں یا نہ کروں
کروں اظہار تو تکرار کروں یا نہ کروں
کل اشعار۔۱۰۔ص:۱۶۸۔غزل۔۱۳۵

حالِ دل تجھ سے دل آزار کہوں یا نہ کہوں
خوف ہے مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
(ردیف تبدیل) کل اشعار۔۱۱۔غزل نمبر۔۱۴۰

ہر بات جو کرتے ہو صاحب نہیں نہیں
ہم نے تو دیکھی ایسی بھی عادت کہیں نہیں
کل اشعار۔۸۔ص:۳۳۴۔غزل۔۱۹۰

یہ تو نہیں کہ تم سا جہاں میں حسیں نہیں
اس دل کو کیا کروں کہ بہلتا کہیں نہیں
کل اشعار۔۲۰۔غزل نمبر۔۱۷۳

تصور آپ کا ہے اور میں ہوں
یہی اب مشغلہ ہے اور میں ہوں
کل اشعار۔۱۶۔ص:۱۹۳۔غزل۔۱۶۷

خدا کی گفتگو ہے اور میں ہوں
کل اے بے مہر تو ہے اور میں ہوں
کل اشعار۔۱۲۔غزل نمبر۔۱۴۰

نظام کی شاعری کے پس منظر میں رام پور کی چنو بنت سبا نامی طوائف کا نام لیا جاتا ہے۔ نظام کی شاعری میں جو لگی لپٹی اور محبوب سے چھیڑ چھاڑ کا انداز ملتا ہے اسی تعلق کی دین ہے۔ داغ نے زندگی کا ایک حصہ طوائفوں کی صحبت میں گزارا تھا اور اُن کی محبوبہ منی بائی حجاب بھی اس پیشہ سے تعلق رکھتی تھی۔ داغ کی شاعری کا سب سے بڑا محرک حسن پرستی تھا لہٰذا اس دور میں میلہ بے نظیر میں منی بائی حجاب سے اُن کی ملاقات اُن کی زندگی کا اہم واقعہ ثابت ہوا۔ اس کے بلانے پر کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں داغ دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد، پٹنہ بھی گئے۔ جہاں ان کی بہت پذیرائی ہوئی اور کئی ایک مشاعروں میں شرکت بھی کی۔ ایک مشاعرہ میں داغ کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی جس کا مقطع تھا۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اس غزل کی داد ان کے ہم عصر شاعر امیر مینائی لکھنوی نے اس شعر میں دی ہے۔

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
"بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں"

اس سفر سے واپسی پر داغ نے صرف دو دن میں ہی ۸۳۸ اشعار کی مثنوی بہ نام "فریاد داغ" لکھ ڈالی جو بعد ازاں داغ کے دیوانِ دوم بہ نام "مہتاب داغ" میں شائع ہوئی۔

یہ غزلیاتِ رام پور میں داغ کے رنگِ سخن کی بہترین عکاس اور وجہ شہرت قرار پائی تھیں۔ لکھنوی شعرا کوشش کے باوجود لفظی موشگافیوں اور لسانی الجھنوں سے دامن نہ بچا پائے۔ دہلوی شعرا میں داغ دہلوی رام پور میں نام پیدا کر سکے۔ رام پور میں لکھنوی شعرا کا اصل مقابلہ داغ سے نہیں بلکہ رام پوری شعرا (دوسرے لفظوں میں عوام الناس کے ذوقِ سخن) سے تھا۔ اس شعری تناظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر رام پوری شعرا اور لکھنوی شعرا مد مقابل تھے تو یقیناً انہوں نے ایک دوسرے کے رنگِ سخن میں تغیر پیدا کرنے کے اسباب بھی پیدا کر دیے ہوں گے۔

لکھنوی شعرا اُس رنگِ سخن کو نہ اپنا سکے جیسا داغ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ یقیناً دبستانِ لکھنو کے خصائص ان لکھنوی شعرا کے ہاں ایسے پختہ ہو چکے کہ وہ اس شعری ماحول میں بھی ان سے دامن نہ بچا سکے۔

"احمد علی رسا شاگردِ بیمار رام پور میں امیر مینائی کے مدمقابل تھے۔ انتخاب یادگار (تذکرۂ شعرائے رام پور) میں رسا اور امیر کے شاگردوں کی تعداد مساوی ہے۔ وہ لکھنؤ اسکول کے فریق مخالف اور رام پور اسکول کے ترجمان تھے۔ (جو دہلوی اسکول کی شاخ ہے) فصیح الملک نے اپنی علمی کمی کو مولوی ولی محمد خاں بسمل رام پوری سے پورا کیا تھا۔ دراصل رام پور میں مقابلہ داغ اور لکھنوی اساتذہ کا نہ تھا بلکہ مقابلہ لکھنؤ اسکول اور رام پور اسکول کا تھا۔" (۱۸)

داغ دہلوی نے لکھنوی شعرا سے بہت پہلے اس شعری مزاج کو اپنا لیا تھا۔ جب رام پور میں لکھنوی شعرا اور دہلوی شعرا کی محفل سجی تو داغ بہت جلد مشاعروں میں کامیاب ہوئے۔ داغ نے رام پور میں شعری ماحول کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا اور نظام کی شاعری سے بھی استفادہ کیا جن کا رنگِ سخن رام پور میں چھایا ہوا تھا۔ اس لیے جو خوبیِ کلام داغ میں زبان و بیان کے حوالے سے اُن کی پہچان بن گئی دیگر شعرا اس سے محروم رہے۔

داغ کی شاعری میں جو واقعیت اور سچائی ہے ان کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ نظام اور

داغ کی یہ شعری مماثلت اُن کی غزلوں میں اپنے اپنے مخصوص طرز بیان کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ داغ نے نظام کے شعری موضوعات کو نہ صرف اپنی جدّتِ ادا سے انفرادیت بخشی بلکہ دہلوی طرز بیان اور محاوراتی زبان سے چار چاند لگا دیے۔

''جہاں تک داغ کے اختیار کردہ طرز شاعری کا تعلق ہے تو نظام کی معاملہ بندی کی طرح یہ دبستانِ رام پور کے مجموعی رنگ کا ایک جزو تو کہی جا سکتی ہے، کُل پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ داغ کے رنگ کی مقبولیت رام پور اور باہر کے شعرا میں لطفِ زبان اور زود ہضم خیالات کی بنا پر ہوئی'' (١٩)

داغ نے رام پور کے شعری ماحول سے مطابقت پیدا کرنے یا مشاعروں میں سامعین کا دل جیتنے کے لیے یا پھر فرمائش پر نظام کی غزلوں پر طبع آزمائی کی۔ ان طرحی مشاعروں میں دہلوی اور لکھنوی شعرا کے ساتھ رام پوری شعرا بھی شریک ہوتے تھے۔ کئی مشاعروں میں داغ نے نظام کو مشاعرہ پڑھتے سُنا ہوگا یا پھر وہ ان مشاعروں میں خود شریک رہے ہوں گے۔ ایسے مشاعروں کا ثبوت تو نہیں ملتا لیکن غالب گمان یہی ہے کہ ایسے مشاعروں کے لیے داغ نے بہت سی طرحی غزلیں کہیں۔ داغ کو دہلوی زبان سے عشق تھا اور قلعہ معلّیٰ کے سحر انگیز ماحول نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ شاعری میں تغزّل اور زبان کی خوبی پر رام پوری شعرا بھی دل و جان سے فدا تھے۔ یہی وجہ تھی داغ کا کلام مشاعروں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور مشاعرے ختم ہونے کے بعد سامعین کی زبان پر داغ کے اشعار ہوتے تھے۔

داغ نے نظام کی زمینوں پر طرحی غزلیں ضرور لکھیں لیکن ان میں شوخی بیان اور جدت ادا نے جو پہچان انہیں عطا کی اُس میں کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہ قرار پا سکا۔ کلامِ داغ میں حسن و عشق کی کیفیات اور لب و لہجہ کامیاب و بامراد عاشق کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ نظام کی زبان پر رام پور کی مقامی زبانوں کا اثر بہت نمایاں ہے اور مزید برآں انہوں نے دہلوی و لکھنوی لسانی اثرات کو قبول نہیں کیا۔ نظام کے ہاں مناظرِ عشق کی عکاسی اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور وہ کیفیات حسن و

عشق کی صورت گری میں مہارت رکھتے تھے۔ داغ نے ان کیفیات کو اپنے ذاتی تجربات سے ایسی جاذبیت اور نفاست عطا کی جو اُس دور میں بہت کم شعرا کے حصے میں آئی۔ سلاستِ زبان اور شوخیِ بیان میں داغ کی شوخ طبیعت اور دہلوی زبان کا عمل دخل تھا لیکن یہاں کے شعری ماحول میں بالخصوص نظام رام پوری کے رنگِ سخن سے انہوں نے اپنا منفرد لب ولہجہ تخلیق کیا جس نے انہیں شہرت کی معراج پر پہنچا دیا۔

اسناد فہرستِ محولہ

۱۔ ''دلی سے اقبال تک'' مرتبہ: ڈاکٹر سید عبداللہ'' ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۲۔ نواب یوسف علی خان ۵ مارچ ۱۸۱٦ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا سلسلہ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی سے شروع ہوا اور مرزا غالب سے فارسی کے چند اسباق بھی پڑھے۔ بعد ازاں شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں رام پور میں تخت نشیں ہوئے اور ۱۸٦۵ء میں وفات پائی۔

۳۔ ''رام پور اور داغ'' از: محمد علی خاں اثر رام پوری، نگار لکھنؤ، جنوری فروری، ۱۹۵۳ء، صفحہ نمبر ۴٦

۴۔ ''رام پور کا ادبی مرکز'' از کلب علی خاں فائق رام پوری'' نگار لکھنؤ ۱۹۵۳ء مارچ، صفحہ 8

۵۔ شیخ علی بخش بیمار ۸۰۔۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں لکھنؤ گئے اور مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ نواب محمد سعید خاں والیِ رام پور کے عہد میں رام پور پہنچے۔ ان کے اہم تلامذہ میں نظام رام پوری، سید احمد علی رسا اور صاحب زادہ مہدی علی خاں قابل ذکر تھے۔ رام پور میں ہی ۱۸۵۴ء میں ٦۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

٦۔ سید نظام شاہ نظام رام پور میں ۱۸۱۹ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ نظام شاہ کے نام سے شہرت پائی۔ نظام تخلص تھا۔ ابتدا میں میاں احمد علی شاہ سے بیعت کی اور انہیں سے

اصلاح سخن بھی لی۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۰ سال تھی۔ نواب محمد سعید خاں والی رام پور کے عہد میں لکھنوی و دہلوی شعرا نے رام پور کا رُخ کیا تو نظام نے شیخ علی بخش بیمار کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۴۰ء میں نواب یوسف علی خاں ناظم (شاگرد مومن و غالب) رام پور پہنچے تو نظام نے ان سے تعلقات پیدا کیے۔ اس دور کی یادگار نظام اور ناظم کی طرحی غزلیات ہیں۔ نظام نے بیمار سے چودہ سال استفادہ کیا۔ جب غالب رام پور پہنچے تو یہاں نظام کا رنگ سخن چھایا ہوا تھا۔ جناب عتیق الرحمٰن خاں کلیم (تذکرۂ کلیم) اپنے بزرگوں کی روایت کو یوں نقل کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ مرزا نوشہ غالب رام پور آئے۔ نظام کا کلام سُنا تو فرمایا کہ رام پور میں بھی ایسے دماغ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو رام پور کے میر ہیں۔ نظام کی شاعری کے بارے میں ناقدین کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک نازک خیال اور منفرد لب و لہجہ کے شاعر تھے۔ نظام کا انتقال ۲۵ شعبان ۱۲۸۹ھ بہ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۲ء رام پور میں ہوا۔

۷۔ میر احمد علی رسا کے اسلاف ملتان سے رام پور آئے تھے۔ ان کا سنہ ولادت ۱۸۱۶ء ہے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور بنے تو رسا ۴۰ سال کے تھے۔ رسا علی بخش بیمار کے شاگرد تھے۔ نواب کلب علی خاں کے دور میں اساتذۂ رام پور میں شمار ہونے لگا تھا۔ آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۸۷۴ء میں وفات پائی۔

۸۔ ''حیاتِ نظام'' بہ شمولہ ''کلیاتِ نظام'' از کلب علی خاں فائق ناشر: مجلس ترقی ادب سال اشاعت ۱۸۶۵ء صفحہ ۸۸

۹۔ ''رضا لائبریری میں غالبیات کا ذخیرہ'' از ابو سعد اصلاحی، بہ شمولہ ''غالب اور رام پور'' مرتب: شاہد ماہلی، ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۲ سنہ اشاعت ۲۰۰۶ء، صفحہ نمبر: ۱۲۶-۱۲۵

۱۰ رام پوری شعرا پر دہلوی شعرا بالخصوص مومن دہلوی کے اثرات بڑے دیرپا تھے۔ رام پور میں مومن کے شاگرد میر حسین تسکین موجود تھے اور بہت سے مقامی شعرا اُن کے شاگرد تھے۔ خود نواب یوسف علی خاں جو قیام رام پور میں مومن کے شاگرد تھے رام پور آنے کے بعد تسکین (شاگرد مومن) سے اصلاح لینے لگے تھے۔ نواب سعید علی خاں کے بہت سے اہلِ خانہ رام پور میں قیام پذیر رہے اور اس دوران مومن کی شاگردی اختیار کی۔ بعد ازاں فروری ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہو گئے۔ غالب جب پہلی بار رام پور آئے بہت سے شعرا نے جو پہلے مومن کے شاگرد تھے اور اُن کی وفات کے بعد دیگر شعرا سے اکتسابِ فیض کر رہے تھے نے غالب کی شاگردی کو ترجیح دی۔ صاحب زادہ عباس علی خاں بے تاب اور صاحب زادہ عبدالوہاب خاں سروش پہلے مومن سے تلمذ تھے بعد ازاں مرزا غالب کے شاگرد ہو گئے۔

۱۱۔ ''رضا لائبریری میں غالبیات کا ذخیرہ'' از ابو سعد اصلاحی، بہ شمولہ ''غالب اور رام پور'' مرتب: شاہد ماہلی، ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲ سنہ اشاعت ۲۰۰۶ء صفحہ نمبر ۱۳۵

۱۲۔ نواب یوسف علی خاں جب دلّی سے رام پور واپس آئے تو لکھنؤ اور دہلی سے بعض نو وارد شعرا سے روابط بڑھے۔ مقامی باشندوں نے تجدیدِ تعلقات کی ضرورت سمجھی۔ نظام بھی ولی عہد کے دربار میں پہنچے۔ اس لیے نظام اور وہ ہم طرح غزلیں کہنے لگے۔'' فائق نے صرف ردیف الف میں ناظم اور نظام کی دس (۱۰) طرحی غزلوں کا ذکر کیا۔ ناظم اور نظام کی طرحی غزلیں یہ ہیں

طرحی غزلیں (کلیاتِ نظام) ناشر مجلس ترقی ادب لاہور　　　　اشعارِ ناظم

طولِ شب ہجر جانتا ہوں　　یوں غیر کا حال زار ہو گا

مرنا مجھے لاکھ بار ہو گا　　تم کو بھی اعتبار ہو گا؎

غزل: ۲۰۔ اشعار۔ ۱۰۔ صفحہ ۲۵

؎ مصرع تصحیح طلب ہے (ادارہ)

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا | بس تم سے ترکِ صحبتِ اغیار ہو چکا
اچھا غمِ فراق کا بیمار ہو چکا | ایسا معاملہ تو کئی بار ہو چکا

غزل: ۱۶۔اشعار۔۱۱۔صفحہ۲۰

شرم پھر مانعِ وصال ہوئی | ہائے دل اب وہ دوست دار ہوا
شکوے سے جب وہ شرمسار ہوا | کس کی باتوں کا اعتبار ہوا

غزل: ۲۵۔اشعار۔۱۳۔صفحہ۳۰

کیا قیامت کا دن بڑا ہو گا | غیر کا حال گر سنا ہو گا
کچھ شب ہجر سے سوا ہوگا | ذکر میرا بھی آ گیا ہو گا

غزل: ۱۳۔اشعار۔۲۲۔صفحہ۱۷

پرسش کو اگر ہونٹ تمہارے نہیں ہلتے | اس کوچے سے اب میں تو اٹھا نہیں اٹھتا
کیا قتل کو بھی ہاتھ تمہارا نہیں اٹھتا | کیا اُٹھوں قدم یاں سے تو اصلا نہیں اٹھتا

غزل: ۱۰۔اشعار۔۱۵۔صفحہ۱۲

☆ناظم کے شعر کا مصرع ''کیا قتل کو بھی ہاتھ تمہارا نہیں اٹھتا'' نظام کی اسی غزل کے ساتویں شعر کا مصرع دوم ہے یعنی یہ مصرع طرح تھا جس پر طبع آزمائی کی گئی۔

آنے کو اِدھر پاؤں نہ اُٹھتے تو نہ اُٹھتے
کیا قتل کو بھی ہاتھ تمہارا نہیں اُٹھتا

تم نہیں قول و قسم کے سچے | جی میں کچھ اپنے نہ شک لایئے گا
جھوٹ کہتا ہوں، قسم کھایئے گا | شوق سے آپ یہاں آیئے گا

غزل: ۵۵۔اشعار۔۱۲۔صفحہ۳۵

کر کے خوں ایک کا جا بیٹھے ہیں گھر میں اور پھر | سوچ دیکھو یہی اب ہے یہ طریقہ کیسا
پوچھتے ہیں کہ میرے در پہ ہے غوغا کیسا | میں کہوں حال دل اپنا کہو تم ''کیا؟ کیسا''

داغ کی غزل اس زمین میں موجود ہے۔

ایک ہی رنگ ہے سب کا یہ تماشا کیسا
کوئی کیسا ہے کوئی چاہنے والا کیسا

سامنے سے ترے آئینے اٹھالوں کہ مجھے
تیرے ناوک سے ہے منظور بچانا تیرا

یوں تو تھا دشمنِ جاں ایک زمانہ میرا
آج کچھ بار ہوا تم پہ بھی آنا میرا

داغ کی غزل اس زمین میں موجود ہے

لے چلا جان مری' روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

۱۳۔ ''حیاتِ نظام'' بہ شمولہ ''کلیاتِ نظام'' از کلب علی خاں فائق، ناشر: مجلس ترقی ادب سال اشاعت ۱۸۶۵ء، صفحہ: ۷۵

۱۴۔ ''داغ اور رام پور'' از: ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی، بہ شمولہ ''داغ'' ترتیب شاہد ماہلی، ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب، مارگ، نئی دہلی، سال اشاعت ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۱۶

۱۵۔ رام پور کا ادبی مرکز، از کلب علی خاں فائق، رام پوری نگار مارچ ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۵

۱۶۔ دیوانِ درد از خواجہ میر درد مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۰ء غزل نمبر ۵۵ کل اشعار ۴ صفحہ نمبر ۲۱۷

۱۷۔ داغ کا تیسرا دیوان بہ نام ''مہتابِ داغ'' ۳ جمادی الثانی ۱۳۱۰ھ بہ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۸۹۳ء کو مطبع عزیز دکن چھتہ بازار حیدر آباد میں چھپا۔ اس میں ۲۹۲ غزلیں ہیں جن کے کل ۴۱۷۶ شعر ہیں۔ رباعیات ۱۹ مخمس (۱۷ بند)، قصائد ۶ (۵۱۰ شعر) قطعات ۳۷ (۳۳۰ شعر) غیر تاریخی قطعات ۴ (۴۶ شعر) سہرے ۴ (۴۰ شعر) اور ۱۲۰ متفرق اشعار ہیں اس طرح کل اشعار کی تعداد ۵۲۱۸ بنتی ہے۔

۱۸۔ ''رام پور کا ادبی مرکز'' از کلب علی خاں فائق رام پوری مارچ نگار لکھنؤ ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۵

۱۹۔ ''داغ اور رام پور'' از ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی، بہ شمولہ ''داغ'' ترتیب شاہد ماہلی ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب، مارگ، نئی دہلی، سال اشاعت ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۲۱

سید نظام شاہ نظام کی زمینوں میں مرزا نواب داغ دہلوی کی غزلوں کا گوشوارہ (بہ لحاظ درجِ دیوان) یوں بنتا ہے۔

ردیف	گلزارِ داغ (دیوانِ اوّل)	آفتابِ داغ (دیوانِ دوم)	مہتابِ داغ (دیوانِ سوم)	کل تعداد
الف	۱۰	۱	۶	۱۷
بائے موحدہ	۱	۰	۰	۱
تائے فارسی	۱	۰	۰	۱
تائے فوقانی	۱	۰	۰	۱
تائے ہندی	۱	۰	۰	۱
جیم تازی	۱	۰	۰	۱
جیم فارسی	۱	۰	۰	۱
رائے مہملہ	۲	۰	۰	۲
شین معجمہ	۱	۰	۰	۱
نون	۳	۱	۳	۷
واؤ	۲	۰	۰	۲
ہائے ہند	۱	۰	۰	۱
یائے تحتانی	۲۲	۵	۰	۲۷
کل تعداد	۴۷	۷	۹	۶۳

ڈاکٹر محمد شارق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا)

دور حاضر میں خطوط شبلی کی معنویت

عہد حاضر میں خطوط شبلی کی معنویت کا جائزہ لینا قدرے مشکل کام ہے' چونکہ شبلی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے، شبلی نے جس زمانہ میں آنکھ کھو ٗ اس وقت کی تہذیب، معاشرہ، اور رسم ورواج کا اثر یقیناً ان کی زندگی پر بھی پڑا ہوگا لیکن اس کے باوجود شبلی نے اپنی عالمانہ صلاحیت، علمیت اور غیر معمولی ادبی ذوق کو بروئے کار لاکر تحریروں میں الگ رنگ پیدا کر دیا ہے جس کے سبب آج بھی ان کی تحریریں بامعنی اور قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ اور جب تک اردو زبان وادب زندہ ہے ان کی تحریروں سے استفادہ اور ان کی معنویت کا اندازہ کیا جاتا رہے گا۔ ان کی بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ ان کے مکاتیب کی بھی بالکل یہی نوعیت ہے۔

مولانا کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تدبر وتفکر کے عادی اور مسائل و معاملات میں اتنے دور اندیش تھے کہ ان کو ملک و وطن اور قوم وملت کے مستقبل کا چہرہ صاف دکھائی دیتا تھا، ان کی تصنیفات وتحقیقات میں ان کی اسی بصیرت کی جھلک صاف اور نمایاں ہے۔ مولانا چونکہ قدیم وجدید افکار وخیالات رکھنے والے علماء کے ہم نشین رہے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا، اس لیے انہیں قدیم اور جدید علوم اور رجحانات دونوں پر مساوی دسترس حاصل تھی۔ شبلی دینی اور عصری تعلیم سے بہرہ مند تھے اس لیے ان کے خیالات میں جدت تھی اور جس میدان میں انہوں نے قدم رکھا اس میں امتیازی شان پیدا کی۔

مولانا کے خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے بعد اگر کسی نے خطوط میں ندرت و لطافت پیدا کی ہے تو وہ شبلی ہیں، شبلی نے بھی آداب والقاب میں غالب کی طرح تکلف سے احتراز کیا ہے دیکھیے یہ خط جو وہ اپنے عزیز کو تحریر کرتے ہیں:

"لیجیے آپ کو بھی چپ لگ گئی، بھائی کوئی قصور نہیں ہوا، ناراض کیوں بیٹھے ہو وہ قصیدہ یہاں نہیں ملتا، وہیں لکھوالو، یا میں آؤں گا تو خود لکھ دوں گا۔" (۱)

شبلی فطری طور پر فن کار اور ذہین تھے جس کا اثر ان کی تحریروں میں موجود ہے ان کے یہاں بکثرت ایسے خطوط ملتے ہیں جس میں روشن خیالی اور فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ انشا پردازی کا حسن بھی موجود ہے، ایک خط میں بمبئی کی دلچسپیوں کا حال لکھتے ہیں:

"بمبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں، ۱۶ صفحے بھر گئے تو چھپنے کو دے دیئے، بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں لیکن حافظ تو کہتے ہیں "ہر گہ یاد روئے تو کردم جواں شدم" اور ایک پرانا تجربہ کار کہتا ہے "عشق در ہنگام پیری، چوں بسر با آتش است" کیا یہ فلسفہ صحیح ہے"؟ (۲)

اس خط کو پڑھنے سے ان کے بعض فلسفیانہ اندازِ گفتگو کی جھلک محسوس ہوتی ہے جو ہر زمانہ کے لیے بامعنی اور فکر انگیز ہے کہ انسان کے احساسات وخیالات کبھی بزرگ اور ضعیف نہیں ہوتے، جب بھی فضا ہموار ہوگی بہار کا موسم ہوگا اور زندگی پر لطف ہوگی تو ایسے ہی لطیف خیالات وجذبات، الفاظ یا جملے موسیقی کی طرح اپنی دلکشی بکھیرتے رہیں گے اور قارئین اس سے محظوظ ہوتے رہیں گے، اسے حسن وعشق کا مظہر قرار دیتے رہیں گے، دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تدبر وتفکر کے لیے بہترین فضا کا ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی گفتگو کو مدلل بنانے کے لیے استعارہ اور کنایہ کی اہمیت بھی مسلم ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ فلسفیانہ انداز بیان ناگریز ہے۔

شبلی کے خطوط میں ادبیت اور انشا پردازی کا اندازہ مہدی حسن کے اس خط سے بخوبی ہو جائے گا جو وہ مولانا کو لکھتے ہیں:

"آپ کے لائق ادب کارڈ بھی اس قدر جامع ومانع ہوتے ہیں جیسے چنے کی دال پر قُل ہو اللہ لکھی ہو۔۔۔ یعنی آپ دو سطریں بھی ایسی نہیں لکھ سکتے جن میں چشم سخن کسی نہ کسی لٹریری مسئلہ کی طرف اشارہ نہ کرتی جائے، اور یہ انشا پردازی کا کمال ہے آج ملک میں آپ کے سوا کون ہے جو کم سے کم میری توقعات کو پوری کر سکتا ہو۔" (۳)

دوسرا خط اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

''مکاتیب شبلی دراصل دیکھنے کی چیز ہے، سچ یہ ہے کہ اس علم کے پتلے کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی اس لیے سرسری اظہار خیال بھی اس پایہ کا ہو کہ انشا پردازی اس کی بلائیں لیتی ہو تو یہ بھی کمال کا ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔'' (۴)

شبلی کا اسلوب بھی ہمارے لیے اہمیت کا حامل ہے اس سلسلے میں احرار نقوی اپنے مضمون ''شبلی شخصیت اور خطوط'' میں رقم طراز ہیں کہ ''شبلی صاحب طرز تھے ان کا اپنا ایک اسلوب تھا، ان کے اسلوب سے نہ جانے کتنے اسلوب اور بنے، آج بھی شبلی کا پرتو مولانا آزاد، نیاز فتح پوری اور آل احمد سرور کے یہاں ملتا ہے شبلی کے انداز کی سب سے بڑی خصوصیت Directness مدعا نگاری مقصدیت اور اختصار ہے، شبلی الفاظ کے بہت بڑے کفایت شعار ہیں، وہ مافی الضمیر کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرتے ہیں ان کے یہاں ہر لفظ کی بڑی اہمیت ہے، خط میں ان کا یہ رنگ تو بھرپور نظر آتا ہے مگر (خط کے) فن کے توازن کا احترام نہیں، ان کے بعض خط دہن یار کی طرح مختصر، حد یہ ہے کہ بعض محض ایک فقرے، ایک شعر بلکہ کبھی محض ایک مصرع کا ہوتا ہے۔'' (۵)

زمانے کی تیز رفتاری، وقت کی قلت اور سائنٹفک نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جس طرح افسانے کو اہمیت دی گئی ہے اسی طرح شبلی کے خطوط کو دور حاضر کے لوگ زیادہ سود مند بنا سکتے ہیں کہ کس طرح کم سے کم الفاظ میں ہم اپنی بات کو دوسرے تک بآسانی پہنچا سکیں، ان کی اس اختصار پسندی کے باوجود مکتوب الیہ کاتب کے مافی الضمیر سے واقف ہو جاتا ہے۔

خطوط کے ذریعہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن متنوع تھا، زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کے یہاں انانیت اور خود پسندی بھی پائی جاتی تھی، ناز و نعم میں پرورش پانے کی

وجہ سے ان کی طبیعت میں لطافت اور شائستگی بھی تھی، رہی عملی زندگی کی بات تو کوئی بھی میدان ہو خواہ تدریس، انتظامیہ یا گھریلو مسائل رہے ہوں اس کو خوش اسلوبی سے نبھانے کا سلیقہ ان کے یہاں ایسا ملتا ہے جیسے اس میدان کے پرانے تجربہ کار ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بہت عمیق اور وسیع مطالعہ کیا تھا اور علم کے حصول کے لیے مختلف ملکوں کی سیر وسیاحت بھی کی تھی۔

ایک اچھے فن کار کے لیے ضروری ہے کہ نثر نگاری کے ساتھ اس کے یہاں شعری صلاحیت بھی ہو اور بصیرت اور تنقید سے واقفیت بھی ہو، یہ خوبیاں ایک ساتھ تلاش کرنی ہوں تو شبلی کی شخصیت کا مطالعہ ناگزیر ہے وہ غیر معمولی حیثیت کے مالک ہیں شبلی اپنی صلاحیت کا بیان اپنے خطوط میں اس طرح کرتے ہیں کہ اس کا ذکر اس خط کے تکمیل کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے اور مکتوب الیہ کے لیے تلذذ کے ساتھ تدبر و تفکر کا باعث بھی۔ شبلی اس پائے کے عالم تھے کہ انہوں نے یوروپین مصنف کا جواب ہندوستان میں رہ کر دیا جس کا جواب خود یورپ کے مسلمان بھی نہیں دے پائے، اس کا اندازہ شبلی کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے:

"میں نے اس کے کچھ پروف "المنار" کے ایڈیٹر سید رشید رضا کے پاس بھیج دیے تھے، انہوں نے بڑی شکرگزاری کی اور لکھا کہ میں نے علماء مصر کو آمادہ کرنا چاہا لیکن ان لوگوں نے ہمت نہ کی المنار میں یہ رسالہ بتدریج شائع ہوگا خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی مصر میں قائم رہی۔" (۶)

علامہ لڑکیوں کی تعلیم کے بھی قائل تھے لیکن انہیں اس طرح تعلیم دی جائے کہ ان کے اندر نسوانیت کے ساتھ قومی، سماجی اور مذہبی رکھ رکھاؤ باقی رہے، کیوں کہ عورت ہی وہ پہلی آغوش ہے جو بچوں کو بنیادی تعلیم و تربیت سے ہم کنار کرتی ہے اور وہی بچے کی پہلی استاد ہوتی ہے۔ اس لیے لڑکیاں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں تو استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا ماحول بنائے کہ انہیں سوال کرنے میں تردد اور دشواری نہ ہو۔

بقول خورشید الاسلام "شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمال نامہ ہے" انہوں نے ایسا اس لیے کہا کہ ان کی پوری زندگی ایثار اور قومی خدمت میں گزری، ان کی شخصیت ایسی جلیل القدر تھی وہ چاہتے تو اپنی ذات کے لیے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے کیوں کہ ان کے شاگرد ایسے منصب پر فائز تھے کہ محض اشاروں پر انہیں بہت کچھ عطا کر سکتے تھے لیکن اسے وہ ترجیح نہیں دیتے کیوں کہ ان پر قومیت غالب تھی ہمارے خیال کی تائید مولانا کے اس خط سے ہو جائے گی جو انہوں نے اپنے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی کو ارسال کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا فراہی کے لیے نظام کالج حیدر آباد کی پرنسپلی کے لیے کوشش کی جا رہی تھی، علامہ شبلی اس کے لیے فکر مند تو تھے اور کوشاں بھی، مولانا فراہی پرنسپل مقرر ہو جائیں لیکن وہ اس طرح کے منصب اور اعزازی خدمت پر ترجیح دینے کے قائل نہ تھے چنانچہ اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"آج ڈائریکٹر تعلیمات سے تمہارے متعلق فیصلہ کرانا ہے صرف یہی ایک زینہ رہ گیا ہے لیکن یہ فیصلہ موافق بھی ہو جائے تب بھی میں اس کو قومی خدمت پر ترجیح نہیں دیتا البتہ کچھ معاش کا سہارا ہونا چاہیے وہ بقدر کفالت کسی نہ کسی طرح ہوتا رہے گا، پرنسپلی اور قدر تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔" (۷)

مذکورہ بالا بحث سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی قوم کے لیے بہت کچھ سوچ رہے تھے اور اس قومی خدمت کے لیے اپنے مفادات کو قربان کر دیتے تھے اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی ذہنی تربیت کے بے تندرست، صالح اور دور اندیش نسل پیدا کرنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ شبلی کی فلسفیانہ اور منطقی گفتگو کی معنویت ہمیشہ باقی رہے گی۔

حواشی

۱۔ مکاتیب شبلی مکتوب ۱۳ بنام مولوی محمد سمیع، جلد اول، ص ۷۷، طبع جدید ۲۰۱۰ء دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۲۔ مکاتیب شبلی مکتوب ۴۴، بنام ایم۔ مہدی حسن، جلد دوم، ص ۸۴، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء

۳۔ مکاتیب مہدی، ص ۵ طبع ۱۹۳۸ء، آسی پریس گورکھپور۔

۴۔ مکاتیب مہدی، ص ۱۸۵، طبع ۱۹۳۸ء، آسی پریس گورکھپور

۵۔ رسالہ ادیب، شبلی نمبر، ص ۲۶۵۔۲۶۶، ستمبر ۱۹۶۰ء

۶۔ مکاتیب شبلی مکتوب ۱۸، بنام مولوی محمد ریاض حسن خاں، جلد دوم، ص ۱۶۲ طبع جدید ۲۰۱۲ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۷۔ مکاتیب شبلی مکتوب ۶۸، بنام مولانا حمید الدین جلد دوم، ص ۴۱ طبع جدید ۲۰۱۲ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

پروفیسر شارق جاوید

ڈاکٹر عاصی کرنالی ۔۔۔ ''آئینہ نعت''

خاک جب اُس پیکرِ نوری کا مدفن ہوگئی ساری دنیا کی زمیں اندر سے روشن ہوگئی

شعری مجموعوں ''مدحت'' ''نعتوں کے گلاب'' اور ''آوازِ دل'' میں جناب عاصی نے بالخصوص نعت کے حوالے سے عقیدت و منقبت کے دُرِ نایاب پروئے ہیں جو قدم قدم پر حضورِ پُر نور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری کا حسین مرقع ہیں۔

صدرِ نشینِ محفلِ قدرت سرتاجِ اقلیم نبوت نورِ ظہورِ گلشن ہستی، چشم و چراغ خانۂ آدم
مظہر انوارِ یزدانی، منزلِ معراجِ انسانی ذاتِ مطہر، عبدِ مقرب، پیکرِ اقدس، روحِ مکرم
آپ کی ہر گفتار و عمل میں تشریحِ احکام الٰہی آپ کی صورت آپ کی سیرت تفسیرِ قرآنِ معظم

حسرتِ حاضری اور حضوری کی کیفیات ان کی نعت میں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔

مری قسمت کہاں تھی میں مدینے کا سفر کرتا میں اُن کے در پہ حاضر ہوں مجھے کیونکر یقیں آئے

ہر لمحہ انہیں حضورِ اکرم کی نگاہ لطف کی طلب ہے ہر ثانیہ انہیں قربت کی آرزو ہے

جب مدینے کی ہوا آئی تو عاصی یوں لگا جیسے ان کا مغفرت نامہ مرے نام آگیا

وہ بارہا خود کو کعبے اور مدینے کی فضا میں پاتے ہیں اور ان کی کیفیات میں خضوع و خشوع بڑھتا جاتا ہے۔

کعبے سے چل پڑا ہوں مدینہ قریب ہے تُو اے نگاہِ شوق بہت خوش نصیب ہے
اے آنکھ سجدہ ریز ہو اے دلِ درود پڑھ اے روح سر جھکا یہ دیارِ حبیبؐ ہے

وہ وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی ہر وقت طلبی کے منتظر رہے نہ جانے کب بلاوا آ جائے اور خدا کرے لمحہ بھر تغافل نہ ہو

میں انؐ کے در پہ جاؤں وہ دن خدا دکھائے — دل کی مراد پاؤں وہ دن خدا دکھائے

۱۹۲۷ء میں کرنال میں پیدا ہوئے ہجرت کے بعد ملتان میں آ رہے اور تمام عمر عزیز اسی شہر میں بسر کی۔ انہوں نے کبھی واپس جانے کی آرزو نہ کی مگر مکے اور مدینے جانے کے طلبگار ہمیشہ رہے۔

اے شب ملتاں تو سلامت رہے — اب تو مدینے کی سحر چاہیے

ارمان ہے جاؤں میں مدینے کے سفر کو — پھر لوٹ کے آؤں نہ مدینے کے سفر سے

حج اور عمرے کی سعادت کے بعد دوبارہ اسی دیار پر سر سجود ہونے کی آرزو رہی۔

ملتاں میں پھر رہا ہوں بہ توفیقِ بندگی — اپنی جبیں کے ساتھ تیرا در لیئے ہوئے

میں کامیابِ دید تیرے شہر سے چلا — آنکھوں میں التجائے مکرر لیے ہوئے

گویا بدنِ خاکی تو ملتان آ گیا مگر روح کی بیقراری فزوں تر ہوتی گئی۔

اِک صبح مدینے کی طرف لے اڑی مجھ کو — میں بھی کوئی جھونکا تھا نسیمِ سحری کا

جناب حفیظ تائب، عاصی صاحب کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "عاصی کرنالی کا کمالِ نعت یہ ہے کہ انہوں نے ذاتِ رسالت مآبؐ سے اپنے تعلقِ خاطر کے اظہار کے لیے تغزل کو پابندِ ادب کر کے شاہکارِ نیاز بنا دیا ہے انہوں نے نعت میں شوق و شیفتگی کی ایک دنیا آباد کر دی ہے وفورِ شوق کی بدولت ان کی بیشتر نعتوں میں پُروا کی سی روانی پیدا ہو گئی ہے۔ فدویت فدائیت اور شوقِ دیدار کا عجب عالم ہے۔"

حضوری کے شوق نے ان کو سراپا انتظار کر دیا ہے۔

ان دنوں دھیان مدینے کا لگا رہتا ہے ۔۔۔ میں کہیں، ذہن کی پرواز کہیں ہوتی ہے

اور جب انتظار کی اس کیفیت میں طلبی کی اطلاع ہوتی ہے تو پھر

عاصی مجھے بھی اذنِ حضوری عطا ہوا ۔۔۔ یہ بات تھی کہاں مرے خواب و خیال میں

اب مدینہ اس کی پُر کیف فضائیں، انوار کا علم، دل کی خفتہ خواہشیں

جمالِ گنبد خضرا پہ پڑ رہی ہے نظر ۔۔۔ یہ لمحہ پھیل کے یارب دوام ہو جائے

یہ حرم یہ جادۂ شہرِ نبیؐ یہ کوئے دوست ۔۔۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں کا مقدر دیکھنا

ان کی منزل اب یہی مقام ہے جہاں کائنات دل متغیر ہوتی چلی جاتی ہے

اڑ کر فضائے طیبہ سے جاتا مگر کہاں ۔۔۔ اللہ تیرا شکر ہے ٹوٹے ہیں پر کہاں

عاصی کو اپنے شہر میں رکھ لیجئے حضورؐ ۔۔۔ اب آپؐ کے قدم کے سوا اس کا گھر کہاں

بارگاہِ اقدس میں ایک انسانی ذہنی، جسمانی، روحانی کیفیات کیا کیا ہو سکتی ہیں

میرا یہ مقدر کہ ترے در پہ کھڑا ہوں ۔۔۔ ہونٹوں پہ تبسم ہے تو آنکھوں میں نمی ہے

صدیوں کے ہجر و فراق کے بعد شاہِ دو عالم کے درِ پُر نور پر حاضری کی گونا گوں حالتوں کے بیان سے ذہن و دل قاصر ہوتے ہیں

صدیاں گزار دوں میں اسی نرم دھوپ میں ۔۔۔ طیبہ کا شہر مجھ پہ یوں ہی ضوفشاں رہے

جاؤں نہ تیرے عرشِ جلالت کو چھوڑ کر ۔۔۔ لپٹا ہوا جبیں سے یہی آستاں رہے

یہ طیبہ ہے یہ روضہ ہے یہ گنبد ہے یہ جالی ہے ۔۔۔ ٹھہر جا اے دلِ مضطر ٹھہرنے کا مقام آیا

تمنائے دل حدود وقیود سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہزار دل روکے مگر بالآخر واپسی کا سفر ناگزیر ہے مگر

مدینے سے ہمارا قافلہ چلنے کا وقت آیا الٰہی قافلہ چلنے میں کچھ تاخیر ہو جائے

عاصیؔ کرنالی کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے جناب رشید قیصرانی لکھتے ہیں کہ "عاصی کرنالی کے نعتیہ کلام میں زبان و بیان کی خوبیاں، ندرتِ فکر، جذبے کا خلوص اور دوسرے وہ تمام شعری اور فنی محاسن پائے جاتے ہیں جو ان کے دوسرے کلام کا حصّہ ہیں۔ جہاں انہوں نے حضورؐ سے محبت و عقیدت کا اظہار بھرپور انداز میں کیا ہے وہاں آپؐ کے ابدی فیضان کا تذکرہ اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو پوری فنی پختگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور اس ساری فنی کاوش میں فنی اقدار اور شعری محاسن کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ مدحت کے سب اشعار غزل کے انداز میں کہے گئے ہیں جن میں غزل کا روایتی رچاؤ اور اس کے متعلق زبان و بیان سازی کی ساری نزاکتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے"۔ عاصیؔ کرنالی بخوبی جانتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ والا صفات کس قدر اعلیٰ و ارفع ہے۔

عاصی! میں وہ درگاہِ جلالت کبھی دیکھوں صد عظمتِ جبریل جہاں خاک بہ سر ہے

عاصیٔ بے چارہ اس کوچے میں کیا رکھے قدم پاؤں تھرائے جہاں صد رومیؒ و عطارؒ کا

شہرِ مدینہ سے لوٹ آنے والے حاجیوں کو بھی سعادتِ عظیم سے فیض یاب ہونے پر ان کے لیے عاصی کے دل میں کیسے ارمان ہیں کہ

ہمیں اے حاجیو! باتیں سناؤ شہرِ دلبر کی تمہارا عمر بھر احسان مانیں گے دعا دیں گے

ہمیں وہ ہاتھ چھونے دو جو اس جالی کو چھوتے تھے رسول اللہؐ تمہیں اس خاص نیکی کی جزا دیں گے

دلگدازی کی یہ حسرت آمیز کیفیت کس قدر پُرسوز ہے کہ بار بار استدعا پیش کرتے ہیں کہ

پہنچوں درِ سرکار پہ، چاہا تو یہی ہے آگے مری تقدیر، تمنا تو یہی ہے

یہ اُن کی رضا ہے مجھے بھیجیں، مجھے روکیں واپس میں نہیں آؤں گا سوچا تو یہی ہے

وہ نہایت عاجزی اور مسکنت کے ساتھ استفسار کرتے ہیں

تری بستی ترا در، تیرے در کی خاک کے ذرے انہی ذروں میں مل جانے کی عزت کیوں نہیں ملتی

ادب سے صرف اتنا پوچھتا ہوں یارسولؐ اللہ مجھے طیبہ میں آنے کی اجازت کیوں نہیں ملتی

ایک طرف کتنی بڑی دنیا ہے جہاں ہزاروں لوگ بستے ہیں، سینکڑوں شہر آباد ہیں مگر پوری کائنات میں مدینہ صرف ایک وہ مقام اعلیٰ ہے جہاں انوارِ الٰہی ہر دم پرتو افگن ہیں بے شمار ملائک اسی شہرِ عالم پناہ پر صبح و مسا اترتے ہیں۔ کُل ملائک ہر لحۂ ہر پل' ہر ثانیہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے ہیں

یارب درِ حبیبؐ پہ جانے کا اذن دے مولا ! فراقِ دوست عذابِ الیم ہے

اور پھر خواہش دل بارگاہِ الٰہی سے مستجاب ہو جائے اور اذن حضوری مل جائے

ان کے روضے کی پہلی جھلک دیکھ کر سارے آلام کا رخ بدلنے لگا

آہ رکنے لگی، اشک تھمنے لگے جی بہلنے لگا ، دل سنبھلنے لگا

کیوں نہ اس شہر میں مجھ کو موت آ گئی، میں یہ آواز سننے کو زندہ رہا

ساتھیو جلد رختِ سفر باندھ لو ، قافلہ شہرِ طیبہ سے چلنے لگا

عاصی کرنالی اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے بعنوان ''اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' میں نعت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ''نعت میں مضامین و افکار و مسائل کی کوئی حد نہیں ہے حضور علیہ السلام باعثِ تکوینِ عالم ہیں، رحمت اللعالمین ہیں افضل الانبیاء ہیں، شفیع روز جزا ہیں نورِ محمدی کا اظہار، بعثتِ نبویؐ، احوال مبارکہ از ولادت تا رحلت شمائل وسیرؐ، واقعہ معراج، معجزات، غزوات، تعلیماتِ رسالتؐ، التجا و اعانت طلبی، محبت و اطاعت کے والہانہ جذبات مہجوری و مشتاقی و حضوری

ڈاکٹر عاصی کرنالی۔۔۔ ''آئینہ نعت''

کا بیان، زیارت مدینہ کی تمنا، اجتماعی آشوبِ امت کا ذکر، شفاعت طلبی، الغرض تنوع و کثرت مضامین کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان احوال و کیفیات کو مختلف صورتوں میں نمودار کیا جاتا ہے۔ نورنامے، مولودنامے، وفات نامے، معراج نامے، معجزات نامے 'شمائل نامے' اور منظوم سیرتیں شعری تخلیقات کی حسین صورتیں اور خوب صورت پیکر ہی تو ہیں۔"

اُس دیارِ قدس کی گلیوں میں جب پہنچوں گا میں — دل بچھاتا جاؤں گا، آنکھیں بچھاتا جاؤں گا
بس اُسی ماحول میں تحلیل ہونا ہے مجھے — بس اُسی خاکِ منور میں سماتا جاؤں گا

جب تک اذن نہ ہو، اس مقدس مقام تک رسائی ممکن ہی نہیں

کیسے جاؤں اس طرف سے جب بلاوا ہی نہ ہو — بارہا خواہش ہوئی اور سالہا کوشش ہوئی
میں غبارِ راہ یوں پہنچا درِ سرکارؐ تک — جب بھی کوئی قافلہ گزرا مجھے جنبش ہوئی

سفرِ طویل کی جتنی بھی اور جیسی بھی صعوبتیں، پریشانیاں، الجھنیں اور روکاوٹیں ہوں وہ اس لمحے کافور ہوجاتی ہیں جب یہ خبر کانوں میں رس گھولنے لگے کہ اے قافلے والو محتاط و بیدار ہو جاؤ کیونکہ مدینہ قریب ہے اور تب

یوں محویتِ شوق میں طیبہ کو چلے ہم — صحرا نظر آیا نہ سمندر نظر آیا
اے عشق مبارک! سفرِ دشت ہوا طے — اے بخت خوشا! شہرِ پیمبرؐ نظر آیا

زر و مال و جواہر کی بہتات ہو یا صرف آسودہ حالی مدینہ جانے کی طلب اور تڑپ، ہر دل کے نصیب میں نہیں ہوتی، مگر جہاں شوق فزوں تر، اور مالی اسباب کی شدید کمی ہو، وہاں بے قراری و بے چینی فزوں تر ہوتی رہتی ہے۔

کبھی مجھے بھی ملے گی سعادتِ پرواز — کبھی مجھے بھی عطا ہوں گے بال و پر آقا
سُنا ہے حج کے مصارف ہیں کوئی تیس ہزار — کہاں سے لاؤں یہ دولت، یہ مال و زر آقا

میں اہل ہوں کہ نہیں ہوں مجھے نہیں معلوم مجھے بھی اذن ملے قصہ مختصر آقا

وہ احباب واقربا وہ خوش نصیب افراد جو طیبہ طلب کر لیے جاتے ہیں وہ دیدۂ بینار کھنے و
اسلے اُن لمحات کی خوشی وسعادت کو کیا بیان کر سکتے ہیں

پھر نبیؐ کے شہر میں پل پل مبارک ساعتیں آنکھ بحرِ نور میں جل تھل مبارک ساعتیں
کاش موت آئے اسی کیفِ حضوری میں مجھے منزلِ طیبہ درِ مرسل مبارک ساعتیں

قرب نبیؐ کے بعد اور اس وجد آفریں لمحے کے اتصال کے بعد دل واپسی کی خواہش سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔

کیا بعید ان کے کرم سے ان کے شہر نور میں ہو مری خاکِ پریشاں کو کوئی گوشہ عطا

الٰہی ارضِ مدینہ میں ہو قیام نصیب وہاں کی صبح میسر وہاں کی شام نصیب
الٰہی ان کا میں جاروب کش رہوں تا عمر مجھے ہو مسجدِ سرکارؐ میں یہ کام نصیب

بس ایک گزر گاہ ازل سے ہو ابد تک بس ایک سفر ہو وُہ مدینے کا سفر ہو
ہر شخص کہے جائے، کہے جائے، کہے جائے مکہ مرا مرکز ہو، مدینہ مرا گھر ہو

کر رہا ہوں سفر مدینے کا دم بہ دم جلوے، گام گام نقوش
یوں ہوئے ان کے شہر سے رخصت دل میں لے آئے ہم تمام نقوش

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی "مدحت" کے حوالے سے کہتے ہیں کہ "عاصی کی ذات مدحت کے جس جس شعر میں شامل ہے نعت کا حق بڑے ہی اچھوتے انداز میں ادا ہوا ہے۔ انہوں نے سید البشرؐ اور ان کے پیغام کی اہمیت کو آج کے دور سے ہم آہنگ کر کے دیکھا اور دکھایا ہے۔

''نعتوں کے گلاب'' میں عاصی کے شعر جب سوالوں کے روپ دھارتے ہیں تو خوشگوار تحیر اور بصیرت افروز سوچ کو راہ ملتی ہے شاعر نے ممدوحِ خدا کی نعت و مدحت کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ حیاتِ طیبہ اور دورِ نبوت کا احاطہ ایک سیرت نگار اور تاریخ داں کی حیثیت سے کیا ہے۔

''حرف شیریں'' میں عاصی نے رسولِ خدا کی قرارگاہ کی عظمت کو کئی زاویوں سے دیکھا ہے۔ طیبہ کی فضا کو صبحِ مسلسل سے تعبیر کیا تو کبھی مدینے کے دیوار و در کو موجودِ محبت سے تشبیہ دی''۔

لائی ہے میرے لیے برکت بھرے دن حاضری — میرا ظاہر حاضری ہے، میرا باطن حاضری

شہرِ طیبہ میں ہے ہر موجِ ہوا آبِ حیات — زندگی کے حق میں ہے کتنی معاون حاضری

بے زری، دیوار حائل، ناتوانی، سنگِ راہ — وہ اگر چاہیں تو پل بھر میں ہو ممکن حاضری

میرا ویزہ ہو قیامِ چند روزہ کے لیے — اور مجھے کردے مدینے ہی میں ساکن، حاضری

بہت ہی دلنشیں سفر بہت ہی جاں فزا سماں — نبی کے شہر کا ہے رخ قدم قدم نیا سماں

دل میں گداز، آنکھ میں آنسو زباں پہ نعت — یوں بڑھ رہا ہوں جانبِ طیبہ قدم قدم

ہجر سرکارؐ میں اشکباری بہت — آہ و زاری بہت بیقراری بہت

دوستو! مجھ پہ اتنا سا احساں کرو — لے چلو ان کے شہرِ دل آرام تک

حاضری کا شرف مجھ گنہگار کو — لیجیے میں چل دیا ان کے دیدار کو

لیجیے میں آگیا رحمتِ عام تک — انؐ کے انعام تک انؐ کے اکرام تک

الغرض جس مجبوری کے زمانے کی دلگداز کیفیت دورانِ سفر اضطراب مدینہ کے در و بام کے اثرات اور روضۂ حضورؐ میں حاضری کے پُر اثر احساسات جس جذباتی کیفیت کے ساتھ شاعرِ

موصوف نے بیان کیے ہیں وہ تمام تر واردات قلبی کے مظاہر ہیں

میں کہیں ہوں گنبدِ خضرا ہی آتا ہے نظر — اس طرح رچ بس گئیں آنکھوں کے اندر رفعتیں
ہم جو مکّے سے چلے ان کے مدینے کی طرف — سامنے آنے لگیں منظر بہ منظر رفعتیں

انھی کی سمت رواں ہوں، وہی مری منزل — نہ دوسرا کوئی رستہ، نہ دوسری منزل
وہاں سے لوٹ کے بھی میں نہیں فضاؤں میں ہوں — وہی مدینہ وہی ان کا در وہی منزل

یہ کیفِ تصور ہے وہ فیضانِ حضوری — گھر میرا مدینے میں مدینہ مرے گھر میں

میں خطا کار میں عاصی میں گنہگار کرم — میرے آقا، مرے مولا، مرے سرکار کرم
فکرِ دنیا ہے نہ اندیشۂ عقبیٰ عاصی — میرا مونس، مرا یاور، مرا غم خوار کرم

عاصی کرنالی بخوبی جانتے ہیں کہ سرکارؐ کی مدح سرائی نہایت احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔ اور جب بذاتِ خود ان کے در پر حاضری سے شرف یاب ہوں تو پھر کس قدر محتاط روش ضروری و ناگزیر ہے۔

میں اب شہرِ ادب کی حد میں داخل ہونے والا ہوں — خرد محتاط ہو جائے جنوں ہوشیار ہو جائے
ترا دیدار ہو جائے اور آنکھیں بند کر لوں میں — میں آنکھیں بند کر لوں اور ترا دیدار ہو جائے

اور پھر یہی مجبور و مضطرب و بے قرار عاصی کرنالی ۲۰ جنوری ۲۰۱۱ء کو اپنی ظاہری آنکھیں بند کر کے ہم سے رخصت ہوئے اور حضورِ اکرم کی قربت میں ہمیشہ کے لیے جا بسے۔

*****

ڈاکٹر گل ناز بانو

ادب اور زندگی میں نقد و انتقاد کا ناگزیر عمل

تنقید سے مراد "نقد و انتقاد" ہے۔ جس کے معنی پرکھنے اور جانچنے کے ہیں۔ گویا کہ اچھے اور بُرے کی قدر و قیمت کا تعین کر کے تجزیہ اور تشریح سے فیصلہ صادر کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ اور جو شخص اس کی قدر و قیمت کا صحیح اور واضح تجزیہ یا اندازہ کرتا ہے۔ اسے "نقاد" کہتے ہیں

جب انسان کا شعور یہ سمجھ لیتا ہے کہ جو اشیاء زندگی میں موجود ہیں۔ ان میں تھوڑا بہت تصرّف اور تبدّل کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ دلکش اور خوبصورت بنا کر انسانیت اور زندگی کی تعمیر و ترقی کی جا سکتی ہے۔ تو وہ ان شیاء کی خامیوں کو دور کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اسی کوشش، احساس اور جذبے کو ہم تنقید سے تعبیر کرتے ہیں۔

اچھی تنقید انسان کے جذبات کو پختہ، لطیف اور مہذب احساس کا نکھار عطا کرتی ہے۔ اس لیے محض خامیوں یا کوتاہیوں کا ذکر نہیں کرتی اگر ایسا ہے تو وہ تنقید نہیں بلکہ تنقیص ہے۔

تنقید اس وقت تک نامکمل ہوتی ہے۔ جب تک وہ کسی فن پارے یا زندگی کی مکمل تشریح اور تجزیہ نہ کرے۔ اس لیے کہ زندگی بھی ایک فن پارہ ہے۔ لیکن بعض لوگ تنقید کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نقاد ادب کے جسم پر کوڑھ ہے۔ کسی کے نزدیک تنقید شہد کی مکھی ہے جو بَل میں چلتی ہوئی بیلوں کو روک لیتی ہے۔ اور کوئی تو تنقید کو ادب کے گیسوؤں میں جُو سے تشبیہ دیتا ہے۔

لیکن تنقید سے بدگمانی ان لوگوں کو ہوتی ہے۔ جو ادب اور زندگی کو گہری نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ وہ ادب میں محض تفریح اور سطحی لذت ڈھونڈتے ہیں۔ اگر وہ سطحی فرق کو نظر انداز کر دیں اور غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور خاص کر تخلیقی ادب کی زندگی کے لیے تنقید کا وجود ناگزیر ہے۔

ایک مغربی نقاد کے بقول:

''تنقید دراصل جستجو اور کاوش کا ایک شعبہ ہے تقریباً اُن شعبوں کی طرح ، جن کی تحریک انسان کے فطری ذوقِ جستجو ، عجیب اور نئی باتوں کی دریافت ، چیزوں کا علم حاصل کرنے اور اس کو بیان کرنے کے جذبے سے ہوتی ہے ۔ یہ جستجو اور انکشاف کا عمل ہے ا ۔ ر اس میں محاکے اور درجہ بندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔'' (بحوالہ اشارات تنقید از ڈاکٹر سید عبدا ۔ صفحہ ۵)

آئی ۔ اے ۔ رچرڈز کے نزدیک:

''تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ ، اس کی مدلل توضیح اور اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے ۔'' (ایضاً ص ۶)

تنقید کا کام فیصلہ کرنا ہے ۔ سچی اور کھری تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہے ۔ تنقید وضاحت ہے ۔ صراحت ہے ، ترجمانی ہے ، تفسیر ہے ، تشریح ہے ، تحلیل ہے ، تجزیہ ہے ۔ تنقید قدر ہی متعین نہیں کرتی بلکہ ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ اور کسوٹی عطا کرتی ہے ۔ تنقید انصاف کرتی ہے ۔ ادنیٰ اور اعلیٰ ، جھوٹ اور سچ اور پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے ۔

تنقید ادب میں محفوظ رکھنے اور ایجاد کرنے کا بیش بہا کارنامہ انجام دیتی ہے ۔ وہ بت شکن بھی ہے اور بت گر بھی ۔ بغیر تنقید کے ادب اور زندگی ایک ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت تو ہے ۔ لیکن موزونیت اور قرینے کا سخت فقدان ہے ۔ گویا تنقید کانٹ چھانٹ کرتی ہے ۔ کھرے اور کھوٹے کو پرکھتی ہے ۔ کھوٹے کو مٹا دیتی ہے اور کھرے کو حیات دوام بخشتی ہے ۔

تنقید کا راستہ بال سے بھی زیادہ باریک ہے ۔ گویا یہ ایک مشکل اور صبر آزما فن ہے ۔ اس باریک اور تنگ راستے پر چلنے کے لیے غیر جانبداری اور عدل وانصاف بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اچھی اور مکمل تنقید وہ ہے جو غیر نبداری کے ساتھ تخلیقی ادب کی طرف مائل کرے ۔ سچی تنقید قاری کے ذہن کو وسعت اور کشادگی بخشتی ہے ۔ اس کی تربیت اور رہنمائی کرتی ہے ۔ تنقید تخلیق پر عمل جراحی کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اسے پاک کرتی ہے صاف کرتی ہے ۔

بقول آل احمد سرور:

"تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے۔" (تنقید کیا ہے؟ از آل احمد سرور ص ۲۰۵)

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے تنقید کو ہماری زندگی کے لیے سانس کی طرح اہم قرار دیا ہے۔ اس قول پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی تنقید بھی سانس، قوت گویائی اور قوت بینائی کی طرح ایک فطری اور گراں قدر نعمت ہے۔ مگر جس طرح سانس، بینائی اور گویائی کی ہمارے ہاں کوئی پہچان نہیں اسی طرح تنقید کی طبعی اور فطری جبلت کو ہم نہیں پہچانتے ہیں۔ حالانکہ تنقید کی غیر موجودگی میں زندگی اسی طرح ناممکن ہے۔ جس طرح سانس کے بغیر جینا۔

زندگی کی طرح ادب پر بھی تنقید کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ ادب زندگی ہی کا ترجمان ہے۔ اور جس چیز کا زندگی پر اطلاق ہوتا ہے۔ ادب پر بھی اُس کا لاگو ہونا انتہائی ضروری ہے۔ جس طرح زندگی بغیر تنقید کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتی اسی طرح ادب بھی تنقید کی راہنمائی اور رفاقت کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔

تنقید کی اہمیت کے پیش نظر میتھیو آرنلڈ نے تنقید کا مقصد یہ بتایا ہے۔ کہ دنیا میں جو بہترین باتیں معلوم کی گئی ہیں۔ جو کچھ دنیا میں بہتر سے بہتر سوچا گیا ہے۔ تنقید کا کام ان کو جانچنا، معلوم کرنا اور پتہ لگانا ہے۔ اور ان کو معلوم کرنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا ہے۔ تنقید کا یہ مقصد یقیناً ایک بلند مقصد ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ تنقید بُرا بھلا کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد میں سراسر تعمیر کے عناصر موجود ہیں۔

تنقید ہی کسی فن پارے کی عظمت کا صحیح اندازہ لگانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تاریخ ادب کا مطالعہ شاہد ہے۔ کہ اگر تنقید نہ کی جاتی تو بعض ادبی شاہکار بہت جلد مفقود ہو جاتے۔ تنقید ہی تصنیفات کو لوگوں میں مانوس کرتی ہے۔ ان کے ناقابل فہم حصوں کو تنقید نگار سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ادب میں ترویج و ترقی کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔

تنقید ہی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ کونسی چیز اچھی ہے اور کونسی بری۔ اس طرح ہمارا بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔ اور دماغی محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ ورنہ کسی مصنف کے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے اس کی جملہ تصنیفات کو پڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن ہماری زندگی بہت ہی محدود ہے۔ موجودہ دور میں انسان کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنے پسندیدہ ادیب، یا شاعر کے کردار، ماحول، تصنیفات، اخلاق و عادات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ادب کا مکمل مطالعہ کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ دوسروں کی رائے کا محتاج ہوتا ہے۔ جو تنقید نگاروں کی سخت عرق ریزیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ گویا تنقید کا مقصد یہ ہے کہ کم وقت میں اپنے پسندیدہ شاعر یا ادیب کے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں۔

تنقید مصنف کی طرف متوجہ کر کے اس کا جائز مقام دلاتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ زمانے کی قدر ناشناسی یا کوئی اور وجہ اچھے ادیبوں کو بھی عوام سے روشناس ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ اور اس طرح ادیب کے اصلی جوہر ظاہر ہونے نہیں پاتے۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی جیسی شخصیت زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں وہ مقام و منزلت حاصل نہ کر سکے تھے جو اُن کا حق تھا مگر جب موجودہ دور کے تنقید نگاروں نے ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ تو آج وہی نظیر اکبر آبادی ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہوئے۔ یہاں تک کہ آج انہیں عوامی شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تنقید ادب کی محافظ و نگہبان ہے۔ وہ ادبی مذاق کی ترتیب و تنظیم کرتی ہے۔ ادب کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ تخلیق کار کو یہ سکھاتی ہے۔ کہ اسے عوام کے سامنے کس حیثیت سے آنا چاہیے۔ بعض اوقات تخلیق کار کسی نہ کسی وجہ سے غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام پر بھی بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر تنقید کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مصنف کی صحیح راہنمائی کر کے اس کی گمراہ قوتوں کو صحیح راستے پر ڈال دے۔ عام طور پر تنقید کی دو اقسام ہیں: ۱۔ نظری تنقید ۲۔ عملی تنقید

نظری تنقید میں ادب کی اہمیت و افادیت، اس کی ضرورت اور اس کے مقاصد سے متعلق بحثیں ہوتی ہیں۔ جب کہ عملی تنقید میں وضع کردہ قواعد وضوابط کی روشنی میں ادبی تخلیقات کے محاسن ومعائب کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

شعر وادب کی ہر صنف کے لیے تخلیق کار کے ساتھ ساتھ نقاد کا ہونا ضروری ہے۔ کہ وہ ادب کی معلومات اور اس کے متفرق شعبوں کی خصوصیات سے واقف ہو۔ وہ ہمیشہ غیر جانبدار رہے۔ کسی تصنیف پر تنقید کرنے سے پہلے اپنے دماغ کو شخصی تعلقات اور ذاتی خیالات کی گرد سے بالکل پاک کرلے۔ اصناف سخن کی اصطلاحات کے معانی پر اس کو کافی عبور ہونا چاہیے۔ اس کی تاریخ پر گہری نظر ہونی چاہیے۔ ماضی کے تمام ادبی مراحل کی نشوونما اور عروج وزوال سے اس کو واقفیت ہو۔ نقاد کی فنی واقفیت وسیع ہونی چاہیے۔، وہ جس صنف پر بھی فیصلہ دے۔ اس سے متعلق تمام ضروری اصطلاحات سے آشنائی ضرور رکھے۔ وہ کسی دوسرے کے فیصلے پر اپنا فیصلہ صادر نہ کرے۔ اس کی ذات میں تضاد نہ ہو۔ وہ تنقید کے تمام دبستانوں کا بخوبی علم رکھتا ہو۔ وہ کسی بھی فن پارے کے متعلق حتمی رائے نہ دے۔ چونکہ قطعیت کے ساتھ ادب میں کوئی بات بھی نہیں کہی جاسکتی ہے۔

تنقید کے اصول

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں جانچنے یا پرکھنے کے لیے کوئی پیمانہ نہ ہو۔ جس طرح پیمانے کے بغیر کوئی پیمائش ممکن نہیں ہوتی اسی طرح تنقیدی اصولوں کی عدم موجودگی میں تنقید کرنا ممکن نہیں۔ انہی اصولوں کی پابندی اور پاسداری ہمارے ذوق کی رہنمائی کرتی ہے۔ ان اصولوں کی واقفیت ادب کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اور اس کی رہنمائی میں ہم خود ان چیزوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں جو ادب کی حامل ہیں۔ اور ان مادی اشیاء سے بھی جن کا عکس ادب میں پیش کیا گیا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے۔ کہ تنقیدی اصول کب بنے؟ کس نے بنائے؟ آخر وہ کون سا آلہ ہے کہ جس کے استعمال کے بعد کسی فن پارے کے بارے میں اچھا یا برا ہونے کا تاثر ملتا

ہے۔تو اس ضمن میں کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی ہے۔تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تنقیدی اصول اسی دن وجود میں آگئے تھے جس دن سب سے پہلی تخلیق سامنے آئی۔

ہر دور میں تخلیق کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔آج سے کئی برس پہلے کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس کا بیشتر حصہ شاعری یا ڈرامے پر مشتمل ہے۔اس سلسلے میں میں ارسطو کی کتاب ''بوطیقا'' کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ارسطو نے بوطیقا میں جو شعری اصول پیش کیے ان ہی کی روشنی میں قدیم فن پاروں پر تنقیدی مواد ملتا ہے۔بعد کے ادوار میں مختلف اصناف سخن زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی گئیں۔اردو ادب ہی کو لیجیے شروع کے دور میں داستانوں کو عروج حاصل تھا۔اس کے ساتھ ساتھ غزل اور قصیدہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی گئی۔اس کے بعد ناول نگاری کا دور شروع ہوا۔موجودہ صدی میں افسانہ، سفرنامہ، انشائیہ، رپوتاژ وغیرہ جیسی اصناف ابھر کر سامنے آئیں۔جس طرح ہر دور میں اصناف سخن چولا بدلتی رہی ہیں اور نئی نئی اصناف وجود میں آتی رہی ہیں۔اسی طرح ہر دور میں تنقیدی اصول بھی بدلتے رہے ہیں اور نئے نئے اصول جنم لیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانے اصولوں میں یا تو تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔یا پھر متروک قرار پاتے رہے ہیں۔مثلاً غزل اور نظم اگرچہ دونوں شاعری کی اصناف ہیں۔لیکن دونوں کے کچھ اپنے اپنے اصول ہیں۔نظم پر تنقید کرنے میں غزل کے اصول کارآمد نہیں ہوسکتے کیونکہ غزل اور نظم میں صرف بحر یا وزن ہی ایک قدر مشترک ہوسکتی ہے یا پھر خیال، ورنہ دیگر ہر لحاظ سے دونوں علیحدہ ہیں۔ غزل کے ہر شعر میں الگ خیال ہوتا ہے۔جب کہ نظم میں شروع سے آخر تک ایک ہی خیال پیش کیا جاتا ہے۔اسی طرح ان دونوں میں اور بھی بہت سا فرق ہے چنانچہ نظم کے لیے غزل سے الگ اصول بنیں گے۔اور اصول اسی وقت بن سکتے ہیں۔جب کوئی صنفِ شعروادب وجود میں آئی ہو۔

جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں وقت کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔اور مختلف اصول معرض وجود میں آتے رہتے ہیں۔اسی طرح ادب میں بھی تبدیلی ناگزیر عمل ہے۔کیونکہ ادب کا تعلق بھی معاشرے ہی سے ہے۔ادب اپنا مواد اسی معاشرے سے اخذ کرتا

ہے۔اس میں بھی ہر دور میں مختلف اصناف سخن میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ہر بڑا فن پارہ اپنے ساتھ نئے اصول لے کر آتا ہے۔ چنانچہ زمانے کے ساتھ ساتھ تنقیدی اصول بھی بدلتے رہتے ہیں۔آج سے ایک صدی پہلے فارم یا ہیئت، کو اولیت حاصل تھی۔لیکن اب خیال اور سوچ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر دور میں تنقید کے مختلف اصول رہے ہیں۔

شارب ردولوی کے بقول:

''ادبی تنقید کا کوئی ایسا ہمہ گیر اصول پیش کرنا یا بنانا جو ہر دور کے ادب یا ہر صنف شعر و ادب پر یکساں طور پر منطبق کیا جا سکے ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ایسی کوشش میکانکی ہوگی۔ادب کا کردار ذوق، مزاج، وقت، زمانہ، ماحول تاریخی و جغرافیائی حالات میں اس کے مطالعے کے لیے کبھی مواد میں ہوتی ہے کبھی ہیئت میں کبھی اظہار میں اس کے مطالعے کے لیے کسی ایک اصول کی تلاش درست نہیں ہے۔ اور نہ اپنے اصول سے ہر شخص کو آسودگی مل سکتی ہے۔'' (جدید اردو تنقید اصول و نظریات از شارب ردولوی ص ۴۸۳)

ہر دور میں نئی نئی تخلیقات وجود میں آئیں تو انہوں نے اپنے ساتھ نئے نئے اصول بھی وضع کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں تنقید کے متعدد دبستان سامنے آئے۔انہوں نے اپنے اپنے طور سے تنقیدی خیالات اور تنقیدی نظریات کو پیش کیا۔اور اپنے اپنے ادوار میں پذیرائی حاصل کی۔ان تحریکوں کے علمبرداروں نے ادب پر تنقید اپنے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ کسی نے ادب اور آرٹ کے جمالیاتی پہلوؤں پر زور دیا تو کسی نے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔اسی طرح ایک گروہ نے ادب کے تاریخی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا تو دوسرے گروہ نے زندگی اور اس کے مسائل کے بیان کو ادب کا مقصد قرار دیا۔اگرچہ یہ ادبی چپقلش و آویزش بڑی پرانی ہے لیکن ان کی نگارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بحث کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔یعنی ان کے مباحث میں ایک قسم کی تازگی پائی جاتی ہے۔اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اگرچہ یہ مباحث پیچیدہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔فنِ نقد کے اصولوں پر بحث کرنے سے پہلے ان تنقیدی دبستانوں کے وضع کردہ اصولوں کا مختصر سا خاکہ پیش خدمت ہے۔

جمالیاتی وتاثراتی دبستان کا بنیادی اصول فن پارے میں مسرت، شگفتگی، حسن اور لذت کے پہلوؤں کی تلاش کرنا ہے۔ ان دبستانوں کے علمبرداروں کا اساسی نظریہ ہی یہ ہے کہ ادب خواہ کسی قسم کا بھی ہو ادیب کے احساسات، جذبات اور تاثرات سے ہی معرض وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ایسا ادب جو قاری کو مسرت، لذت اور شگفتگی دے وہی صحیح معنوں میں ادب کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ ناقدین فن برائے فن اور شاعری برائے شاعری کے قائل رہے ہیں۔ انہوں نے فن پارے کے ظاہری حسن، اسلوب و بیاں اور اس کی ساخت وہیئت کو اہمیت دی اور نہ ہی اصولوں کو مدنظر رکھ کر فن پارے کی پرکھ کی۔ ان کے نزدیک وہ کوئی سماجی فعل ہے۔ یہ حضرات ادب اور آرٹ کو سوائے ادب اور آرٹ کے کسی دوسری چیز سے وابستہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی اس کی فلسفیانہ اہمیت کے قائل ہیں اور نہ زندگی سے ہم آہنگی کے۔ حالانکہ ادب صرف تفنن طبع کا ذریعہ ہی نہیں۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ زیادہ وسعت اور ہمہ گیری کا حامل ہے۔ اس میں انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کا عمل دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر بہت اعتراضات ہوئے۔ اور ان کے خلاف بہت جلد ردعمل مرتب ہوا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

"آج تنقید کا یہ دبستان فعال نہیں رہا بلکہ اب محض ایک ردعمل کی حیثیت سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کے جو کچھ اثرات ہوں گے۔ وقتی ثابت ہوں گے۔ (دبستان تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۸۳)

سائنٹفک تنقید کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ناقد علمی انداز نظر اپنا کر کسی سائنسدان ایسی غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے ذاتی پسند ناپسند اور نجی تعصبات سے ماورا ہو کر تخلیق کی چھان پھٹک کرے۔ اس دبستان تنقید کے مطابق اصولِ انتقاد ہر ادب پارے کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ جن کی روشنی میں اسے جانچا جا سکتا ہے۔ خارج سے عائد کردہ یا کسی دوسرے ادب پارے سے اخذ کردہ قوانین کے ذریعے ادب پارے کو پرکھنا صحیح طریق تنقید نہیں ہے۔ اس تنقید نے نقاد کے لیے غیر جانبداری، مکمل معروضیت پوری تحقیق اور علمی ذمہ داری کو بنیاد ٹھہرایا۔

مارکسی ناقد ''ادب برائے ادب'' کی بجائے ''ادب برائے زندگی'' کے قائل ہیں۔ مارکسی تنقید میں سماجی حیثیت اور مادی اسباب کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کے نزدیک تمام کائنات مادی اسباب کے سہارے چل رہی ہے۔ اور مادہ ہی حیات کی اولین اور اساسی حقیقت ہے۔ کیونکہ ادب کا تعلق اسی معاشرے سے ہے۔ اور ادب کیونکہ فرد اور معاشرے کی باہمی آویزش، مطابقت اور طبقاتی کشمکش کی عکاسی اور ترجمانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک وہی تخلیات قابل قبول ہیں۔ جو زندگی اور اس کے مسائل کو بیان کریں۔ مارکسی دبستان کا یہی بنیادی اصول رہا ہے۔

نفسیاتی تنقید میں تخلیق کا تعلق تخلیق کار کے لاشعوری محرکات سے جوڑا جاتا ہے۔ فن پارے میں فنکار کی نفسیاتی الجھنوں کو تلاش کیا جاتا ہے۔ گویا اس تنقید کا بنیادی اصول فن پارے کی نفسیاتی تشریح کرنا اور تخلیق کار کی ذہنی ونفسیاتی ساخت کا تعین کر کے اس کی روشنی میں فن پارے کا جائزہ لینا ہے۔

تاریخی دبستان کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ کسی بھی فن پارے کا تجزیہ اس کے اپنے عہد اور ماحول کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر ادیب اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ ایک خاص نوعیت کے سماج میں جنم لیتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی خاص مقام اور تاریخی لمحہ کے مخصوص اثرات مل جل کر اس کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور اس کے ادبی شعور اور تخلیقی استعداد کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دبستان کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کیونکہ اس نے پہلی مرتبہ اُن سماجی عوامل، تاریخی محرکات اور نسلی اثرات کی اہمیت کو واضح کیا ہے کہ جو ادیب کی شخصیت کی تعمیر میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے تخلیقی شعور کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں۔

تجرباتی تنقید میں فن پارے کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کی اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس تنقید میں ان خیالات وتصورات کو معلوم کیا جاتا ہے کہ جن کی وجہ سے کوئی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ تنقید میں

فن پارے کے مخفی مفاہیم و مطالب کی تشریح و توجیح کی جاتی ہے۔ جب کہ تقابلی تنقید کا بنیادی اصول یہ رہا ہے۔ کہ نقاد غیر جانبداری کے ساتھ فن پاروں کا تقابلی جائزہ کر کے ان پر فیصلہ صادر کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ تنقید کے ہر دبستان کے کچھ اپنے اصول و قوانین رہے ہیں۔ کہ جن کی حدود میں کسی بھی فن پارے کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ یہ اصول اگرچہ انفرادی طور پر اپنی اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن اچھی تنقید اسی وقت معرض وجود میں آتی ہے کہ جب ان تمام اصولوں کو یکجا کر کے کسی بھی تخلیق کا تجزیہ کیا جائے۔

تاہم کسی بھی ادبی فن پارے کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے درجہ ذیل بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ یہی وہ بنیادی اور جامع اصول ہیں کہ جن کو اپنا کر ایک بہتر تنقیدی رائے دی جاسکتی ہے۔

۱۔ غیر جانبداری

۲۔ زیرِ تنقید تصنیف کی ظاہری و باطنی خصوصیات کی پرکھ۔

۳۔ موضوع و بیان میں ربط و ہم آہنگی

۴۔ مصنف کے عہد و ماحول سے واقفیت

۵۔ اسلوب بیان کیسا ہے؟

۶۔ تصنیف کے پوشیدہ، مطالب اور مخفی مفاہیم کو آشکار کرنا۔

۷۔ فنکار کے قول و فعل سے مطابقت۔

۸۔ زیرِ تنقید تصنیف کے حقائق کو معلوم کرنا۔

۹۔ وسعت مطالعہ اور مختلف علوم و فنون سے واقفیت

۱۰۔ محققانہ طریق کار کو مدنظر رکھنا

۱۱۔ ہمدردانہ و مخلصانہ رویہ اختیار کرنا

۱۲۔ قاری کے ذوق اور مذاق ادب میں اضافہ کرنا

۱۳۔ ذاتی پسند و ناپسند کو بالائے طاق رکھنا۔

تنقید کا اہم و بنیادی اصول غیر جانبداری ہے۔ جب ناقد انتقاد کے اس اساسی اصول کو مدنظر رکھ کر کسی بھی زیر تنقید ادبی تصنیف کا تجزیہ کرے گا تو اس کی تنقید زیادہ قابل قبول، وزن دار، مستند اور قابل تحسین ہوگی۔ تنقید ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ نقاد کا کام تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ مشکل مرحلہ اسی وقت آسانی کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے۔ کہ جب ناقد حق و باطل کے فرق کو واضح کرنے کے لیے تصنیف کا مطالعہ انتہائی عمیق نظر سے کرے۔ اور پھر نتائج اخذ کرے۔ وہ کسی کے عہدے، مرتبے اور ذات سے مرعوب ہو کر تنقید نہ کرے۔ اور نہ کسی کی قائم کردہ رائے پر اپنی رائے صادر کرے۔ اسی طرح وہ سنی سنائی بات پر کسی تصنیف کے بارے میں حتمی رائے نہ دے۔ بلکہ نقاد کو چاہیے کہ وہ پوری صداقت اور دیانت کے ساتھ فن پارے کا مطالعہ کرے۔ فن پارے کے مصائب ومحاسن کو غیر جانبداری کے ساتھ بیان کرے۔

اردو میں بعض ناقد ایسے ہیں کہ جنہوں نے تنقید کے اس بنیادی اصول کو پیش نظر نہ رکھتے ہوئے تنقیدی آراء پیش کی ہیں۔ ان کی یہ تنقیدی آراء جذباتی وتاثراتی نوعیت کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ مثلاً محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کے مقابلے میں ذوق کو بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ اسی طرح کلیم الدین احمد نے اپنے والد عظیم الدین احمد کو بڑا شاعر کہا ہے۔ یہ تنقیدی آراء جانبداری پر مبنی ہیں۔ اور یک طرفہ تنقید کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔

ہر ادبی تصنیف میں خارجی اور داخلی دونوں قسم کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ نقاد کو چاہیے کہ وہ زیر تنقید فن پارے کا بغور مطالعہ کرے۔ تصنیف کے خارجی عناصر میں تصنیف کی ظاہری حالت، کتابت وطباعت، کاغذ، ابتدائیہ، حوالے وحواشی، اشاریہ، نیز موضوع کے لحاظ سے صنف کا انتخاب اور موزونیت جیسے ظاہری عناصر کو مدنظر رکھ کر تنقید کی جاتی ہے۔ جب کہ داخلی عناصر میں نقاد کو یہ دیکھنا پڑتا ہے۔ کہ زیر تنقید تصنیف کے موضوع اور بیان میں کس حد تک ربط تسلسل اور ہم

آہنگی پائی جاتی ہے۔ مصنف نے موضوع پر بیان کس انداز میں کیا ہے۔ موضوع کے انتخاب میں مصنف نے غلطی تو نہیں کی۔ کیونکہ صرف موضوع ہی کسی فن پارے کی عظمت و اہمیت کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ سب سے بڑی بات تو یہ ہوتی ہے کہ موضوع کو کس خوبی و کامیابی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ خیال و بیان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ خیالات الفاظ ہی کا سہارا لے کر جنم لیتے ہیں۔ الفاظ ہی کی مدد سے مصنف اپنے خیالات کو واضح کرتا ہے۔ لہٰذا انقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کو پیش نظر رکھ کر تنقید کرے کہ مصنف کے موضوع اور بیان میں کس حد تک ربط، تسلسل، ہم آہنگی اور یگانگت پائی جاتی ہے۔

ہر تخلیق اپنے خالق کی ذات کا عکس ہوتی ہے۔ ادیب یا شاعر کی تخلیق میں اس کی شخصیت اور عہد و ماحول کی نمایاں اور واضح جھلک موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں نقاد کو سب سے پہلے مصنف کے سوانح حیات پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ اس کے وطن کا جغرافیائی وقوع و ماحول کیسا تھا۔ وہ کس قوم وقبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ کن لوگوں میں اس نے تربیت پائی۔ اس کا خاندان غریب تھا یا دولت مند۔ اس کا لڑکپن اور شباب کن افکار و مشاغل میں بسر ہوا۔ زمانہ اس کے موافق تھا یا مخالف اس نے تحصیل علوم کہاں کی کن لوگوں سے استفادہ کیا۔ اس کی زندگی کس طرح بسر ہوئی۔ زندگی میں اسے کیا کیا تجربات حاصل ہوئے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا رہا۔ اس کی دماغی و جسمانی حالت کیسی تھی۔ اس کی تخلیق کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما تھے۔ اس کی تخلیق کا مقصد کیا تھا۔ الغرض کسی شاعر یا مصنف کے احوال و آثار پر مبنی کتب کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت نقادان تمام اصولوں کو مدنظر رکھ کر اس کی اہمیت اور اس کا مقام متعین کرے گا۔ اس قسم کے جائزے کو تاریخی تجزیہ کا اصول کہا جاتا ہے۔

غیر جانبداری، زبان و بیان کے تجزیے، موضوع اور خیال میں ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کا احاطہ کرنا بھی انتقاد کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔ تنقید کرتے وقت نقاد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ مصنف نے کس طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ کیا مصنف کے اسلوب میں

مصنوعی پن پایا جاتا ہے یا فطری، سادہ یا سلیس انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ صاحب طرز ادیب اسے کہا جاتا ہے کہ جس کے ہاں فطری سادگی و شگفتگی پائی جائے جس کے ہاں نفس مضمون خشک اور بوجھل نہ ہو۔ جس کے ہاں اختصار اور کفایتِ لفظی کا خیال رکھا جائے۔ تحریر میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مافی الضمیر پیش کرتے وقت سلیس سادہ فقرات استعمال کیے جائیں تاکہ قاری بہ آسانی مطلب اخذ کر سکے۔ نقاد کو تنقید کرتے وقت اسلوب سے متعلق ان تمام باتوں کا احاطہ کرنا چاہیے۔

تنقید کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم و بنیادی اصول تصنیف کے پوشیدہ مطالب اور مفاہیم کو آشکارا کرنا بھی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ایک نقاد میں تشریح و توضیح کرنے والے، پرکھ کرنے والے، سمجھنے اور سمجھانے والے مصنف و محتسب کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ وہ تخلیقات میں ڈوب کر تخلیق کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے یہاں تک کہ وہ تخلیق کرنیوالے کا درجہ حاصل کرلے وہ تخلیق کار کی سوچ اور فکر اس کے وجدان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کون سے محرکات و عوامل تھے کہ جن کی بنا پر مصنف نے تخلیق کو عملی جامعہ پہنایا۔ تخلیق سے قبل فنکار کی ذہنی حالت کیا تھی۔ اس کے ذہن میں مواد کا کس قسم کا ہیولہ موجود تھا۔ گویا اس طرح نقاد، فنکار کے تجربے کو پالینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمل سے نقاد ایک طرف تخلیقی عمل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف تخلیق سے اخذ کردہ حقائق پیش کر کے وہ تخلیق کی تفہیم و تحسین کا سامان فراہم کرتا ہے۔

زیر تنقید تصنیف کا جائزہ لیتے وقت نقاد کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ تخلیق کار کے قول و فعل میں کس حد تک مطابقت و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک بیان اس کے دوسرے بیان کی تکذیب تو نہیں کرتا۔ اس نے کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر بات کی ہے یا یونہی صفحے پر صفحے بھرتا گیا ہے۔ نقاد کو چاہیے کہ وہ تخلیق کار کے پوشیدہ مقاصد کو عیاں کرے۔ اس طرح تخلیق کار کا مقصدِ تحریر

کھل کر سامنے آجائے گا۔ اس اصول سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ نقاد محض نقاد ہی نہیں رہتا بلکہ فرد اور معاشرہ کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اس کا رشتہ ادب سے ہو کر معاشرے سے جڑ جاتا ہے۔

نقاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زیر تنقید تصنیف کے حقائق کو معلوم کرے۔ حقائق کی دریافت ہر نقاد کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے وسیع مطالعے، ذہانت اور فطانت درکار رہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو نقاد ان باتوں کا خیال رکھ کر تنقید کرتا ہے۔ وہی بھرپور اور جامع تنقید کر سکتا ہے۔ اس کی تنقید انصاف کے تقاضوں پر مبنی ہوگی۔

تنقید کے لازمی اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ نقاد کا مطالعہ وسیع ہو مختلف علوم و فنون سے اس کی واقفیت ہو۔ نقاد کو چاہیے کہ وہ زیر تنقید کتاب پر نقد کرتے وقت اس کے موضوع اور مضامین پر نگاہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ علم وادب کی تاریخ میں اس کا کیا درجہ ہے۔ اس کے مضامین کو موضوع سے کہاں تک مناسبت ہے۔ عصر حاضر سے اس کا کیا تعلق ہے۔ تصنیف کو مصنف اور اس کے ماحول سے کیا مناسبت ہے۔ ان تمام باتوں کو بطریق احسن ایک نقاد اسی وقت پیش کر سکتا ہے۔ کہ جب اس کا مطالعہ وسیع ہوگا۔ وہ مختلف ادوار میں تخلیق کیے گئے ادب سے واقف ہوگا۔ وہ ادب کی تمام اصناف سے کماحقہ معلومات رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ وہ دیگر علوم و فنون سے بھی آگاہی رکھتا ہو۔ اسی طرح اردو ادب کے علاوہ وہ فارسی، عربی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کیے ہوئے ہو۔ بقول شارب ردولوی:

"ادبی تنقید کے لیے بنیادی اصول یہی ہے کہ تمام علوم، تہذیبی کشمکش، تغیرات وتبدّل اور زندگی کی فنی و جمالیاتی قدروں کو سامنے رکھنے کے بعد کسی فن پارے پر تنقید کی جائے اور ایسی ہی تنقید صحت مند تنقید یا سائنٹفک کہلانے کی مستحق قرار دی جاسکتی ہے۔" (جدید اردو تنقید اصول ونظریات از ڈاکٹر شارب ردولوی ص ۳۸۳)

تنقید کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ نقاد کسی بھی فن پارے کا جائزہ لیتے وقت محققانہ انداز نظر

سے کام لے۔ اگرچہ نقاد محقق نہیں ہوتا لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنقید و تحقیق دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ دونوں کا آپس میں گہرا ربط اور تعلق ہے۔ نقاد اور محقق دونوں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقاد کا کام تخلیق کا تجزیہ کرنا اور محقق کا کام تخلیق کا عہد دریافت کرنا ہوتا ہے۔ گویا تحقیق اور تنقید دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ نقاد کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ خود محقق ہو لیکن اس کو دوسروں کی تحقیق شدہ آراء کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ بغیر تحقیق کے تنقیدی آراء محض خیالی و تصوراتی بن کے رہ جائیں گی۔ اگر نقاد کسی فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت صرف سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے تنقید کرے گا۔ تو گمان غالب ہے کہ اس کی تنقید غلط ثابت ہو جائے۔ پس یہ بات واضح ہے۔ کہ نقاد میں تحقیقی بصیرت کا ہونا ازبس ضروری امر ہے۔

تنقید کا کام تخریب نہیں بلکہ تنظیم و تربیت انتخاب اور تعمیر ہے۔ لہٰذا تنقید کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے۔ کہ نقاد کو تنقید کرتے وقت ہمدردانہ اور مخلصانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ اس کی شخصیت بغض، عناد اور کینہ جیسے منفی عناصر سے پاک ہو۔ وہ خواہ مخواہ تخلیق کی برائیوں کو بیان نہ کرے۔ کیونکہ تنقید کا کام محض نکتہ چینی کرنا اور کیڑے نکالنا نہیں ہے۔ بلکہ زیر تنقید تصنیف میں اگر کچھ خامیاں یا کوتاہیاں پائی بھی جائیں تو نقاد کا یہ کام ہونا چاہیے کہ وہ نہایت مخلصانہ اور ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ان کی اس طرح نشاندہی کردے کہ تخلیق کار آئندہ ان معائب کو نہ دہرائے اور اپنی تخلیق کو بہتر سے بہتر طریقے سے پیش کر سکے۔

اسی طرح نقاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے کا جائزہ لیتے وقت اس کی تشریح و توضیح اس طرح کرے کہ جس کی بدولت قاری کے ذوق اور مذاق ادب میں اضافہ ہو۔ وہ فن پارے کے تمام مضمرات اور مخفی مطالب کو اس طریقے سے منکشف کرے کہ جو قاری کے ذوق کے لیے آسودگی کا باعث بنے۔ ادب کی طرف اس کا لگاؤ بڑھے وہ آسانی کے ساتھ تخلیق کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکے۔ اس کی ذہنی و فکری صلاحیتوں میں اضافہ ہو۔ اس کے ذوق کی تربیت اور نشوونما ہو۔ گویا قاری کے ذوق ادب کی نگہداشت اور تربیت کرنا بھی تنقید کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اس

اصول کی وضاحت شارب ردولوی نے اس طرح سے کی کہ:

"نقاد کا کام صرف فنکار کی الجھنوں یا فن پارے کے تاثرات کی از سر نو تشکیل ہی نہیں بلکہ وہ قاری اور فنی تخلیق کے درمیان ایک اہم لڑی یا پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے کسی فنی تخلیق سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے اس کی تہذیبی و سماجی اہمیت کو سمجھنے اس کے فنی اقدار اور معیار حسن، مواد، ہیئت اور اسلوب و بیان کے تضاد و تناقص یا محاسن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔۔۔ اس کا کام فنکار میں اپنے فن کو بہتر بنانے اور سنوارنے کی خواہش پیدا کرنا اور قاری میں جو کہ اس کا اصل مخاطب ہے بلند نگاہی، تنقیدی شعور اور ادبی بصیرت پیدا کرنا ہے۔ تا کہ وہ ادبی مطالعہ سے صحیح لذت زندگی کا ادراک حاصل کر سکے۔" جدید اُردو تنقید اصول و نظریات از ڈاکٹر شارب ردولوی ص ۲۸۲)

ذاتی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر تنقید کرنا بھی تنقید کا ایک بنیادی اصول ہے۔ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تنقید کو انسانی مفاد کے کام میں لائے کیونکہ انفرادی پسندیدگی پر تنقید کی بنیاد رکھ کر اصول بنانا غیر حکیمانہ فعل ہے اسی لیے نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ انفرادی پسندیدگی پر اجتماعی پسندیدگی کو ترجیح دے تا کہ وہ اپنی تنقید سے انسانیت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے۔ زیادہ سے زیادہ انسان ادب سے لطف اندوز ہوں۔ اس کی تنقید صالح ادب کی نمو کے لیے معین بن سکے۔ اس طرح نقاد میں سہل انگاری نہ ہو بلکہ اس کی تنقید میں فلسفیانہ ہم آہنگی اور یکسانیت کا پایا جانا ضروری ہو۔ نقاد کی تنقیدی آراء اسی وقت قابل تحسین اور اثر پذیر ہوں گی۔ کہ جب وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند اور نجی تعصبات کو بلائے طاق رکھ کر کسی بھی تخلیق کا تجزیہ کرے گا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ تنقید کے فن کے بعض ایسے اصول ہیں کہ جن میں وقت کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدیلی ناگزیر ہے۔ تاہم بعض اصول جامع اور بنیادی ہیں۔ کہ جن کی پیروی ہر دور کے ناقد کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بہترین نقاد وہی ہے۔ کہ جو ان تمام اصولوں کو اپنی تنقید میں بروئے کار لائے کہ جو مختلف دبستانوں میں

انفرادی طور پر پائے جاتے ہیں۔ نیز ایک آزاد نقاد کے لیے بہترین طریقہ تنقید یہی ہوگا۔ کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی اصول کا پیرو کار نہ سمجھے۔ اور خود اپنی قوت تمیز سے کام لے کر کسی بھی ادبی تخلیق کے حسن و قبح کا فیصلہ کرے تو یقیناً اس طرز پر کی گئی تنقید زیادہ جامع، واضح، قابل تحسین اور قابل اعتماد ہوگی۔ کیونکہ بقول شارب ردولوی:

"ادبی تنقید کے اصول یا ادب کے مطالعہ کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ تاریخ، تہذیب اور سماج کی ہمہ گیر قوتوں کے ساتھ ادبی روایات اور نفسیاتی و جمالیاتی عوامل کے پیش نظر ادب کا مطالعہ کیا جائے جب کسی تخلیق کا مطالعہ ان بنیادوں پر کیا جائیگا تو اس میں حقیقی مسرت بھی ملے گی لذت آفرینی بھی، عصری آگہی، تاریخ کے تسلسل اور مادی جدلیت کے احساس میں فکری تہذیبی اثرات بھی ہونگے جذباتی محرکات اور آفاقی اقدار بھی۔ انہی پر کیے جانے والے ادبی و تنقیدی مطالعہ کو میں نے سائنٹفیک تنقید کا نام دیا ہے۔ جسے مطالعے کے سلسلے میں ایک معتبر اور قابل اعتماد راہنما سمجھتا ہوں۔" (جدید اردو تنقید اصول و نظریات از ڈاکٹر شارب ردولوی ص ۴۸۴)

کتابیات

۱۔ آل احمد سرور، تنقیدی اشارے اردو اکیڈمی سندھ کراچی، اشاعت اول ۱۹۶۳ء

۲۔ احتشام حسین، تنقیدی نظریات لاہور اکیڈمی بار اول ۱۹۶۸ء

۳۔ احسان الحق (پروفیسر)، اصول تنقید، علمی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور

۴۔ سید عبداللہ (ڈاکٹر) اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۵۔ سلیم اختر (ڈاکٹر) تنقیدی دبستان مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور۔

۶۔ شارب ردولوی (ڈاکٹر) جدید اردو تنقید اصول و نظریات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، چوتھا ایڈیشن، ۱۹۸۳ء

۷۔ عبادت بریلوی (ڈاکٹر) اردو تنقید کا ارتقاء انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۱ء

۸۔ نعیم تقوی (پروفیسر ڈاکٹر) تنقید و تجزیہ غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ۱۹۷۵ء

عامر سہیل

ہندکو ادب میں معاشرے کے تعمیری عناصر

ہندکو کا شمار دُنیا کی قدیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے اور سنسکرت زبان میں ہندکو الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ زمانہ قدیم میں ان کے باہمی رشتے خاصے مضبوط رہے ہیں۔ یہ زبان ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں میں ہندکو چھٹے نمبر پر آتی ہے۔ اگر جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ زبان پاک و ہند کے ایک وسیع رقبے پر اپنی فعال صورت میں موجود ہے۔ ان میں وادیٔ کشمیر کے درجنوں مضافات اور شہری علاقے شامل ہیں ہزارہ ڈویژن کی بھی بڑی زبان یہی ہے جب کہ دریائے سندھ کے مغربی علاقے مثلاً پشاور، نوشہرہ، اکوڑہ خٹک، کوہاٹ، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازی خان وغیرہ میں بھی یہ زبان عام حلقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پنجاب اور سندھ میں یہ زبان اپنے مخصوص لسانی تغیرات کے ساتھ موجود ہے۔ اس زبان میں جہاں دیگر لسانی عوامل تاریخ کے دھاروں پر رنگ بدلتے نظر آتے ہیں وہاں اس کا رسم الخط بھی تغیراتی عمل کا شکار رہا ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کی بدولت ہندکو زبان کے چند ایسے نایاب نمونے دستیاب ہوئے ہیں جو خط خروشتی میں لکھے ہوئے ہیں جن کا مطالعہ کئی سوالوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ کئی نئے سوال بھی پیدا کرتا ہے۔ مقام تعجب ہے کہ جس زبان کی قدامت تین ہزار برسوں پر محیط ہے اس کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ پرانا نہیں۔ لیکن یہ موضوع الگ بحث کا متقاضی ہے۔ البتہ ہندکو زبان کا موجود سرمایہ بھی اس قابل ضرور ہے کہ ہم اس کی بنیاد پر بیشتر ادبی مباحث و موضوعات کا محاکمہ کر سکتے ہیں۔

ہندکو زبان کا موجود سرمایہ متموّل اور رنگا رنگ ہے۔ اصناف کی بوقلمونی لکھنے والوں کے مزاج اور رویّوں کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ اس زبان کی شعری اور نثری اصناف میں چاربیتہ، دوبیتہ، قینچی، بارہ ماسہ، غزل، ثلاثی، رباعی، کافی، حرفی، مکرنی، ٹپہ، ماہیا، دوہے، دوہڑے، ترکے

(سہ مصرعی نظم)، چوبولا، ہائیکو، افسانہ، ڈرامہ اور مضمون نگاری قابلِ ذکر ہیں۔ نثری تراجم کا رجحان بھی اہم ہے اس ضمن میں قرآن وحدیث اور سیرت کے دقیع ترجمے منظر عام پر آ چکے ہیں ہندکو لغت، لوک کہانیاں، محاورات اور ضرب الامثال بھی کتابی صورت میں محفوظ ہیں۔ ہندکو لکھنے والوں میں شعری میلان حاوی ہے جس کی وجہ سے آئے دن شعری مجموعے سامنے آرہے ہیں۔ ان تمام حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندکو ایک مکمل زبان ہے جس میں دنیا کے تمام موضوعات پیش کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

دنیائے ادب کی ہر بڑی زبان کی طرح ہندکو ادب میں بھی معاشرے کی تعمیر نو کے حوالے سے اہم اور نادر تصورات ملتے ہیں جن کا مطالعہ فکر ونظر کے در وا کرتا ہے۔ اس حوالے سے وہ اشعار خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جن میں فرد کی اخلاقیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندکو ادب میں اخلاقیات کا پہلو ہمیشہ حاوی رہا ہے۔ اس کی منطقی وجہ بظاہر یہی ہو سکتی ہے کہ ہندکو لکھاری شعوری سطح پر یہ محسوس کرتے تھے کہ فرد کی اصلاح یا تربیت ہی کسی معاشرے کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہندکو زبان وادب کے معروف صوفی شاعر سائیں احمد علی کہتے ہیں

تحمل سی عزت دانا پاندے ہزل گوئی وچ شہرت آفاق دی اے
ناقص قلب یوں شر انگیز ہوندا جیویں اگ پوشیدہ چقماق دی اے
لب کھولیاں جوہر سب کھل جاندے اندر چپ تاثیر تریاق دی اے
ہوندا اخلق سی اہل سلوک سائیاں خودسرائی طبیعت نفاق دی ہے (۱)

(ترجمہ) "دانش مند لوگ تحمل سے عزت حاصل کرتے ہیں، اگرچہ ہزل گوئی میں بھی آفاقی شہرت ملتی ہے۔ ناقص دل میں شر انگیزی اس طرح چھپی رہتی ہے جس طرح چقماق میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔ زبان کھولتے ہی انسان کے سب جوہر عیاں ہو جاتے ہیں چپ رہنا تریاق کی تاثیر رکھتا ہے۔ اچھے اخلاق سے انسان صوفی بن جاتا ہے اپنی تعریف کرنے سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔"

اخلاقیات کا تعلق فرد کی محکم شخصیت اور مستقل مزاجی کے ساتھ بھی ہے ۔ اس موضوع پر احمد علی سائیں کا کہنا ہے:

یقین آئینہ اے توڑ نہ توں بھاویں توڑ کوئی لکھ اقرار جاوے
جاوے سر بھی بول سی بدلیے نہ جیہڑا مونہہ سی نکل اکوار جاوے
نیچ اصل سی کسے ذات نائیں نیچ سو جو سخن سی ہار جاوے
لگدا دشمن دی تیغ سی تیز سائیاں سجن جان کے پھُل جے مار جاوے (۲)

(ترجمہ) یقین ایک آئینہ ہے اسے توڑنا نہیں چاہیے، بے شک کوئی شخص تم سے لاکھ وعدے بھی توڑ دے۔ اگر جان بھی چلی جائے پھر بھی اپنی زبان سے نکلے ہوئے قول سے نہیں پھرنا چاہیئے۔ نیچ ہونا کسی کی ذات نہیں، اصل میں نیچ وہ ہے جو اپنا قول ہار جائے۔ ایسا پھول تلوار سے زیادہ گہرا زخم لگاتا ہے جو دوست جان بوجھ کر مارتا ہے

سائیں احمد علی کی ان سی حرفیوں یا جو مصرعی ابیات میں جہاں انسان کی بے لوث سادگی اور محبت ملتی ہے وہاں معاشرے کی عمدہ روایات خواہشات کا بھرم بھی نظر آتا ہے۔ یہ شاعری سچے جذبوں کی عکاس ہے جو سماج کے تشکیلی پہلو میں تعمیر کا عنصر فعال رکھتی ہے۔ اس میں زندگی کی اونچ نیچ، جبر و استبداد، ذہنی ناآسودگی اور اخلاقی بحران کو حد درجہ تحمل اور بردباری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شاعر کا تخیل اور شعور سماج کی تہذیبی ضرورتوں سے واقف ہے۔ یہ شاعر معاشرے کے لیے اور معاشرہ شاعر کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ شاعر اپنی سماجی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہے اور اُس کا یہی طرزِ احساس معاشرے میں ذوق سلیم اور شائستگی دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ اس سارے عمل میں ایسا نہیں ہوا کہ شاعر نے اخلاقی پند ونصائح کے زعم میں شعر کی فنی قدروں کو فراموش کر دیا ہو، ان شعروں میں فنی لطافت کے تمام لوازم اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ محاورات اور تشبیہات کا برجستہ استعمال جذبے کی معنوی قدروں میں گہرائی پیدا کرتا ہے۔ زبان کا استعمال سلجھا ہوا ہے۔ ایجاز و اختصار کا قرینہ ہر مصرعے کا طرۂ امتیاز ہے۔

ہندکو زبان و ادب کا مطالعہ اس بات کی گواہی بھی دیتا ہے کہ یہاں ادب برائے ادب کا مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ادب برائے زندگی کی روایت ہی راست سمت میں پروان چڑھتی رہی ہے۔ یہ مباحث اگرچہ اب قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں لیکن ان کا حوالہ محض اس لیے دیا جا رہا ہے تاکہ ہندکو ادب کی سماجیت کو صحیح تناظر میں جانچا پرکھا جاسکے۔ اس فکری پختگی کا بڑا فائدہ یہ سامنے آیا کہ ہندکو ادیبوں نے سماج کے صرف جیتے جاگے موضوعات کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھی اور ہر قسم کی سماجی ناہمواری کو رد کر کے تعمیری قدروں کا راستہ ہموار کیا۔ اس کے طفیل ادب میں فکر و شعور کے وہ عناصر نمایاں رہے جو سماجی فلسفۂ حیات کی تشکیل کے لیے ضروری تھے۔ ہندکو ادب زندہ انسانی مسائل اور تعمیری قوت سے مالا مال ہے اور اس میں بسا اوقات ایسے نازک اور نزاعی مسائل بھی زیر بحث آجاتے ہیں جنھیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے: مثلاً ناصر بخت یار خان اپنے چار بیتے ''اے حق جھیاں دا کھانڑاں'' (بیٹیوں کا حق کھانا) میں اُس استحصالی رویے کی مذمت کر رہے ہیں جو معاشرے کی تعمیر نو میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس چار بیتے کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

سنڑ مرے شاگردا، لکھ حق تھیاں دا کھانڑاں
ہُو نہہ او کھا اے پچانڑاں، لکھ نکلے دانڑا دانڑاں
ایہہ حکم اے قرآنی، تُوں منن دا میریا جانی
نئیاں گئی آہ مسلمانی
ہِکرا حصہ بھنڑاں دا، دوسرا اے پراواں دا
اٹھواں حصہ ماواں دا
کے سچّا آں لُکا چھپانڑاں، کے بھنڑاں نُوں تھکانڑاں
کیوں رووے فر تھانڑاں؟

(ترجمہ) سن میرے شاگرد! بیٹیوں کا حق کھانا اور پھر اُسے ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ دانہ دانہ کر کے نکل جاتا ہے۔ میرے پیارے دوست تم اس بات کو مان لو کہ یہ قرآنی حکم ہے، ورنہ تم مسلمان نہیں رہو گے۔ ایک حصہ بہنوں کا، دگنا حصہ بھائیوں کا اور آٹھوں حصہ ماں کا ہوتا ہے۔ سچ کیوں چھپایا جائے، بہنوں کو کیوں تنگ کیا جائے۔ پھر نواسہ کیوں روئے؟

ادب کی ایک اپنی مابعد الطبیعیات ہے اور سماجی تعمیر نو کا عمل بھی دو مختلف دھاروں میں بہتے ہوئے اپنے مطلوبہ نتائج تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ

معاشرے کی تعمیر نو میں حصہ لینے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ادب میں ایسے مثبت تصورات عام کیے جائیں جو انسان دوستی اور شعور و آگہی کی نشو و نما کریں اور دوسری جانب اُن موجود منفی قوتوں کی مذمت بھی لازمی ہے جو اس نشو و نما کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، ہندکو ادب میں یہ دونوں دھارے متوازن ہم آہنگی کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ یہ سب اُسی صورت میں ممکن ہے جب ادیب اپنے منصب اور کمٹ منٹ سے بخوبی واقف ہو کیوں کہ ادیب کی یہ ذمہ داری نہیں بنتی کہ وہ محض حالاتِ حاضرہ کی پیش کش پر انحصار کرے بلکہ مثبت رُخ دینے کی کوشش کرنا بھی اُس کے اولین وظائف میں شامل ہے۔ بقول رضی عابدی:

''جس طرح سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کے حالات بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح ادب کو بھی حالات بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔۔۔سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی تحریروں کے تاثر کی ذمہ داری قبول کرتا ہے؟ '' (۴)

ہندکو ادب میں علاقائی اور ملکی مسائل و عوارض سے باہر نکل کر آفاقی حدوں کو چھونے کا وژن بھی نظر آتا ہے۔ یہ رویہ سماج کی مصنوعی حد بندیوں کو تسلیم نہیں کرتا اور انسانی برادری کو خلوص اور اپنائیت کی نگاہ سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ ہندکو لکھاری اس حقیقت سے واقف ہے کہ ہماری دنیا حسین ہے لیکن اسے حسین تر بنایا جا سکتا ہے۔ ایسی شاعری انسان کو انسان کے قریب لانے کی سعی کرتی ہے۔ اس حوالے سے جہاں کلاسیکی شاعری خوب صورت انسانی رشتوں سے مزین ہے وہاں جدید شاعری بھی روشنی مہیا کرتی ہے۔ فضل اکبر کمال کی نظم ''گلوبل ولیج'' (پوری دنیا یک گراں) کے تین شعر توجہ طلب ہیں:

ہوئی فرہک گراں دنیا خوشی سانجھی تے غم سانجھے
صلح سانجھی لڑائیاں سانجھیاں مُکل سانجھے بم سانجھے
پُر لدی اس زِمی تا پائڑیاں نال زندگی ساری
اِہ تھپ سانجھی اِہ چھنگ سانجھی تے بچ بندیاں دے دم سانجھے

سفر دنیا دا ہک موڑ ہک جیہے منزل بی ہک ای اے
مسافر آندے جلدن سانجھیاں ٹکراں قدم سانجھے (۲)

(ترجمہ) ''پوری دنیا پھر ایک گاؤں بن گئی، ہماری خوشیاں اور غم ایک ہو گئے ہیں۔ ہماری لڑائیاں، صلح، پھل اور بم مشترک ہیں۔ گردش کرتی اس زمین پر ہماری زندگی پانی کی مانند ہے۔ اس (زمین) کی دھوپ اور ہوا ایک ہے تمام انسانوں میں سانس بھی ایک جیسے ہیں۔ اس دنیا کا سفر ایک موڑ ایک اور منزل بھی ایک ہے۔ مسافر آتے جاتے رہتے ہیں، ان کا باہمی ٹکراؤ اور قدم ایک جیسے ہیں۔''

ہندکو ادب میں انسان دوستی اور انسانیت کو فروغ دینے والے عناصر کی کمی نہیں ہے۔ یہ اس ادب کا اساسی اور دائمی کردار رہا ہے کہ یہاں معاشرے کی تعمیری بُنت کو امن اور آشتی کے ساتھ جوڑ کر حالات کو بہتری کی جانب رواں رکھا گیا ہے۔ ہندکو لکھاری آفاقی مظاہرے کے علم بردار ہیں اور اُنھوں نے معاشرے کی وقتی اور ہنگامی قدروں کے بجائے مستقل انسانی اقدار کی نمائندگی کی ہے بدیں سبب پیار، محبت اور آدمیت ہندکو ادب کے بنیادی موضوعات بن گئے ہیں۔ بقول میر تقی میر:

خدا ساز تھا آذر بت تراش ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

معاشرے کی تعمیر میں جہاں زندہ لوگوں کے حوالے سے بات ہوتی ہے وہاں دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کے بارے میں بھی عمومی رویوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادب کا دھارا کس سمت بہہ رہا ہے۔ صحت مند ادب معاشرے کی ہر سرگرمی کو تخلیقی فعلیت بناتا ہے اور اُس کا رُخ ارفع مقاصد کی طرف موڑ دیتا ہے۔ ہندکو ادب میں اسی فکر کی عملی صورتیں ملتی ہیں، مثلاً شہدا کی یاد تازہ رکھنے کی خاطر نظم و نثر میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جس میں ایک طرف اس عظیم قربانی کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے تو دوسری جانب معاشرے میں ایک ایسے کردار کی تشکیل بھی ہو رہی ہوتی ہے جو عزم، ہمت اور خودداری کی نشوونما کرتا ہے۔

اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ صفوت غیور شہید کو داد شجاعت کا انداز دیکھیے:

لوگ کہندین کہ موت آئی تُسی ہو گئے ہو جدا
تواڈا وجود گم گیا، تُسی ہو گئے ہو فنا
ساڈیاں نظراں سی او دور، وس گئے ہو کدرے ہور
برے میں کہناواں، ہونڑ بی تُسی زندہ ہو
حسیات دی حداں سی، تُسی اوہ کوسوں دور
وجود تواڈے دا ادراک، ساڈے وس سی میلاں دور
محبتاں دی ڈور دے نال، فاصلے سب مٹ گئے ون
ہونڑبی اسی ملنے آں، گلاں باتاں کرنے آں
توانوں یاد کرنے آں، تواڈے جیا قومی جوان
ساڈے دے مشعل راہ (۶)

(ترجمہ) لوگ کہتے ہیں کہ آپ مرنے کے بعد فنا ہو گئے، میں کہتا ہوں کہ آپ ہمارے ادراک سے پرے ہیں لیکن زندہ ہیں۔ ہماری محبت کی وجہ سے تمام فاصلے مٹ چکے ہیں۔ ہم اب بھی آپ کے حوالے سے باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ جیسا قومی جوان ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

یہ ہے وہ خالص جذبۂ محبت جو انسان کی تکریم اس حد تک کرتا ہے کہ بعد از مرگ بھی اُس کی یاد سے سماجی تعمیر کا چراغ روشن رکھتا ہے۔

کسی ادب کی اصل قدر و قیمت اور اُس کی اصلیت کی تہہ میں پہنچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس ادب کی ضرب الامثال، حکایات، محاورات اور لوک کہانیوں کا تجزیہ بھی کیا جائے کیونکہ اس کی مدد سے عام انسانی رویوں کی جو جانکاری حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور ذریعے سے ممکن

نہیں۔ ان علمی خزانوں میں ہر گزرا عہد اپنی داستان چھوڑ جاتا ہے اور اُس زبان کے بولنے والوں کی اصل سائیکی سامنے آجاتی ہے۔ ہندکو ادب اس میدان بھی ہماری خاصی رہنمائی کرتا ہے۔ ہندکو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کا اصل سرمایہ مع لغات محفوظ ہوتا چلا آیا ہے۔ اگر صرف کہاوت یا ضرب الامثال کو ہی دیکھا جائے اس کے توسط سے بھی سماج کی مجموعی نفسیات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر لکھتے ہیں:

''تقریباً ہر کہاوت کسی نہ کسی تاریخی، تہذیبی، سماجی یا لسانی پس منظر کی حامل ہوتی ہے۔ یہ پس منظر عام طور پر زبان بولنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ بعض کہاوتیں اپنے اندر بڑے دل چسپ واقعات یا حکایات کو سموئے ہوتی ہیں جن کے سہارے ہم ماضی کے دریچوں میں جھانک کر قدیم سماجی و تاریخی حقائق کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ انسانی معاشرے کے فکری و اخلاقی ارتقا یا زوال کا اندازہ بھی کہاوتوں کے توسط سے لگایا جاسکتا ہے۔'' (۷)

ان حائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندکو زبان کی یہ ضرب الامثال دعوتِ فکر دے رہی ہیں:

۱۔ دل بچ کوٹھے تے نچ (دل میں سچ ہے تو گھر کی چھت پر چڑھ کر ناچ)

۲۔ دل سوڑا نہ ہوئے تے جا سوڑی نئیں ہوندی (دل میں تنگی نہ ہو تو جگہ تنگ نہیں ہوتی)

۳۔ جیہڑا گڑ دے نال مرے اُساں زہر کے دینڑا (جو گڑ سے مرے اُسے زہر کیا دینا)

۴۔ جیہڑا گل نال نئیں مردا اوہ سوٹے نال کے مَرسی (جو بات سے نہیں مرتا وہ سونٹے سے کیا مرے گا۔

۵۔ جس مزمان کولوں جان نہ چھٹے اُساں ہس کے بلاؤ (جس مہمان سے جان نہ چھوٹے اُسے ہنس کے بلانا چاہیے

۶۔ جے کُجھ جال دیکھدے اور کُجھ ماچھی دیخ کھنے تے پھٹ کے مرجلے (جو کچھ جال دیکھتا ہے، اگر ماہی دیکھے تو حیرت سے مرجائے)

۷۔ کھاوے ٹبر سوہڑے قبر (کھائے کنبہ حساب قبر لے) (۸)

درج بالا ہر ضرب المثل مخصوص سماجی سچائی کی مظہر ہے۔ اس میں سماجی نفسیات کے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔ ہندکو زبان میں ایسی سیکڑوں ضرب المثال موجود ہیں جو انسانی سماج کی انفرادی اور اجتماعی تعمیر و توسیع کا اشاریہ متعین کرتی ہیں۔ ہندکو زبان کی ہر ضرب المثال عقل و دانش پر مشتمل ہے، اگرچہ اس دانش کا مقابلہ فلسفہ و تفکر کے اعلا معیاروں سے تو نہیں کیا سکتا تاہم یہاں وہ فلسفہ ضرور موجود ہے جس کے ذریعے ایک متوازن اور خود دار زندگی بآسانی گزاری جا سکتی ہے۔ ہندکو ضرب الامثال نے مثالی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ ضرب الامثال روز مرہ زندگی کا ناگزیر حصہ ہیں اور ہر عمر کے لوگ حسب ضرورت اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندکو ضرب الامثال یا لوک ادب کے دیگر مظاہر سماجی اصلاح کے ایسے آلات ہیں جو ہندکو ادب کی عملی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان جمال پاروں میں سماج کے بنیادی رویے مثلاً محبت، نفرت، ہمدردی، دوستی، دشمنی، خوف، منافقت، لالچ، رحم دلی، شرم و حیا، سچائی اور بے حسی وغیرہ کو تمام تر فنی نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس اضافی وصف کی بدولت سماجی اصلاح کا تشکیلی فریضہ بخیر و خوبی ادا ہو رہا ہے۔ ان مختصر جملوں یا مصرعوں میں سماج کا چلتا پھرتا تصورِ حیات، اخلاقی کردار اور معاشرتی برتاؤ اور سبھاؤ کی بھرپور تصویر کشی موجود ہے۔ ان کی مدد سے سماجی رشتوں میں خیال انگیز معنویت پیدا ہوئی ہے۔ یہ ضرب الامثال اتنی ہمہ گیر اور ان سے حاصل شدہ تعلیمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اگر ہندکو ادب کی باقی شعری اور نثری اصناف کو ایک طرف رکھ کر صرف انھی سے معاشرے کے تعمیری اُصول اخذ کیے جائیں تو اُس کے لیے بھی دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ ہندکو ادب کی لوک کہانیوں میں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہندکو ادب میں انسان کو اُس کی کلیت میں رکھ کر فطرت، نفسیات اور جبلت کے حوالے سے پرکھا گیا ہے اور اُس کی اصل کامیابی کو خوشگوار انسانی تعلقات سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ ہندکو ادب بظاہر کسی مقصدیت اور اصلاح کا داعی نہیں ہے لیکن یہاں اظہار ادب کے تمام قرینے نام نہاد اخلاقیت کو رد کرتے نظر آتے ہیں۔ شریف حسین شاہ اپنے ایک قطعے میں کہتے ہیں:

نااہل آں کدے اہلیت دا مقام مل جلے　　فر اُسدی جان خطرے وچ اے نالے ایمان
میں آپڑے مخالف کولوں بہوں ڈرناتاں　　ہک تے اوہ گوانڈی اے، اُتوں بدزبان

(ترجمہ) ''نااہل آدمی کو اگر اہلیت کا مقام مل جائے تو پھر اُس کی جان خطرے میں ہے اور ساتھ ایمان بھی۔ میں اپنے مخالف سے اس لیے بہت ڈرتا ہوں، ایک تو وہ پڑوسی ہے اور دوسرا بدزبان بھی۔'' (۹)

ہندکو ادب میں معاشرتی خستہ حالی اور بحرانی کیفیت کو ختم کرنے کا رجحان عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر قسم کی بے چینی، گھٹن، سماجی تفریق تنگ نظری، اوہام پرستی اور ناانصافی پر سلجھا ہوا احتجاج ملتا ہے۔ عبدالوحید بسمل کے یہ تیور ملاحظہ ہوں: یہاں اظہارِ ادب کے تمام قرینے نام نہاد اخلاقیت کو رد کرتے نظر آتے ہیں۔ شریف حسین شاہ اپنے ایک قطعے میں کہتے ہیں:

بے قدراں دی یاری کولوں کلہ مکلہا رہنڑاں چنگا
مطلب دی غم خواری کولوں دکھ جانی تے سہنڑا چنگا
تنگ نظراں دی محفل کولوں لیف پلہیٹ کے سہنڑا چنگا
یارو ! دل آزاری کولوں چپ ای کر کے بہنڑاں چنگا (۱۰)

(ترجمہ): ''ایسے لوگ جو دوستی کی قدر نہیں جانتے اُن کی دوستی سے بہتر ہے کہ انسان اکیلا رہے۔ مطلب کی غم خواری سے اپنی جان پر دکھ سہہ لینا اچھا ہے۔ تنگ نظر لوگوں کی محفل سے بہتر ہے کہ انسان لحاف اوڑھ کر سو جائے۔ دوستو! کسی کی دل آزاری کرنے سے بہتر ہے کہ انسان خاموش بیٹھا رہے۔''

ان اشعار میں ذاتی تجربے اور مشاہدے کو سماج کے وسیع تناظر میں دیکھنے دکھانے کا رجحان ملتا ہے۔ ان میں در پردہ وہ عناصر بھی اپنی پوری توانائی اور رعنائی کے ساتھ جھلک دکھا رہے ہیں جن کا براہِ راست تعلق اصلیت، واقعیت، دردمندی، سوز اور تلخ حقائق کے ساتھ ہے۔ اس صحت

مند احتجاج کا واحد مقصد معاشرے میں زندہ وتابندہ سماجی قدروں کا فروغ ہے۔ شاعر جہاں ایک طرف اپنی ذات کا اثبات چاہتا ہے وہاں اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی تمام مثبت سماجی قدروں کے ساتھ مستحکم دیکھنا چاہتا ہے۔ ہندکو ادب میں معاشرے کا تعمیری حوالہ اس قدر حاوی ہے کہ جن ادیبوں نے دوسری زبانوں سے ہندکو میں تراجم کیے اُنھوں نے بھی اس روایت کا احترام ملحوظ رکھا ہے۔ اس سلسلے میں صوفی عبدالرشید کے اُن تراجم کا حوالہ دینا ضروری ہے جو اُنھوں نے عمر خیام کی فارسی رباعیات کا کیا ہے۔ یہ مثال دیکھئے:

فزری فزری مرا ساقی پیا نعرے لاوے   نیندراں نال نہ کجھ وی ترے ہتھے آوے
اٹھ جے نال اسی اپڑیں پیالے پھریے   اس توں پہلے جے پیالہ ساڈا پھر یا جاوے
(۱۱)

(ترجمہ) : ''صبح صبح میرا ساقی نعرے لگا رہا تھا، نیند سے تمھارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، اُٹھو! تا کہ شراب سے اپنے پیالے بھر لیں، اس سے پہلے کہ ہماری عمر کا پیالہ بھرا جائے۔''

ہندکو ادب میں تخلیقی اور فکری سرگرمی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہاں ذات کا سفر سماج کی طرف کچھ اس انداز سے طے ہوتا ہے شاعر اپنی واردات قلبی سے حظ اندوز بھی ہوتا ہے اور اپنے سماجی فریضے سے بھی غافل نہیں ہوتا۔

حوالہ جات

ا احمد علی سائیں، جوہر کمال (کلام)، تدوین و تصحیح از محراب خاور، گندھارا ہندکو بورڈ پاکستان، طبع ۲۰۱۰ء، ص ۶۳

۲۔ احمد علی سائیں، جوہر کمال (کلام)، تدوین و تصحیح از محراب خاور، گندھارا ہندکو بورڈ پاکستان، طبع ۲۰۱۰ء، ص ۹۰

۳۔ ناصر بخت یار خان، چھکے بچ پھل (شعری مجموعہ) مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع ۲۰۱۱ء ص ۶۶

۴۔ رضی عابدی، تیسری دنیا کا ادب، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، طبع (ندارد) ص ۱۲۹

۵۔ فضل اکبر کمال، تھل سیوا (شعری مجموعہ) مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۷

۶۔ اعجاز رحیم، بیادِ صفوت غیور، گندھارا ہندکو بورڈ پاکستان، طبع ۲۰۱۲ء، ص ۵۵

۷۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر، اردو کہاوتیں اور ان کے لسانی پہلو، نشریات، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۱۵

۸۔ یہ تمام ضرب الامثال مع تراجم سلطان سکون کی مرتب کردہ کتاب ''ہندکو ضرب الامثال'' سے لی گئیں ہیں۔ جو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۹ء میں طبع ہوئی تھی۔

۹۔ شریف حسین شاہ، سکے لاڈ (ہندکو قطعات) ناشر فیض الودود، ایبٹ آباد، طبع ۲۰۱۰ء، ص ۴۷

۱۰۔ عبدالوحید بسمل، کچے ڈالے پہنگاں (شعری مجموعہ) مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع ۲۰۱۳ء، ص ۹۴

۱۱۔ صوفی عبدالرشید، سوچاں دے سنگ (ہندکو مجموعہ) عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد، طبع ۲۰۱۴ء، ص ۸۰

محمد اویس جعفری (سیاٹل) امریکہ

اقبالؒ اور عشقِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

عشق حقیقی کی تعریف میں مولانا فرید الدین عطار لکھتے ہیں کہ ایک شب تمام عشاق پروانے ایک مرکز پر جمع ہوئے اور شمع کے سلسلہ میں اپنے تجسس کا اظہار اس طرح کیا کہ ہم میں سے کون ہے جو جا کر ہمارے معشوق کی خبر لا کر دے۔ یکے بعد دیگرے کچھ پروانے اس قلعہ کی طرف گئے جہاں شمع روشن تھی اور اپنے اپنے مشاہدہ کی روشنی میں 'مشتاقان دید' سے آ کر آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جو نا کافی بھی تھا اور شوق دید کے لیئے مہمیز بھی۔ ایک پروانہ شمع کے اس قدر قریب گیا کہ اس کی تپش اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ واپس آ کر اس نے اپنی سرگزشت بیان کی تو اسے سن کر ایک پروانہ جو نشۂ عشق کی کیفیت سے سرشار تھا، اڑا، طواف شمع کیا، اس سے ہمکنار ہوا، اس میں جذب اور "من تو شدم تو من شدی" کی عملی تصویر بن کر خود شمع کی روشنی بن گیا۔

ایک مستشرق مارگریٹ اسمتھ عشق کی تعریف یوں کرتی ہیں: "عشق شرابِ حیات ہے یہ وجد کی اس کیفیت کا نام ہے جو صرف قرب الٰہی سے میسر آتی ہے یہ عشقِ حقیقی تمام خودغرضانہ مقاصد سے پاک ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک عاشق سے کسی نے سوال کیا کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جارہا ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ اپنے محبوب کے پاس سے آیا ہے اور اس کے پاس واپس جارہا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تو کس کی تلاش میں ہے اور تو نے کیا زیب تن کیا ہوا ہے، تو جواب ملا مجھے محبوب کی تلاش ہے اور میرا جسم اسی کے لباس میں مستور ہے، مزید سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ میرا چہرہ اس کی جدائی میں زرد اور میری زبان پر اسی کے نام کا ورد ہے جو اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک میں اس کے چہرہ کی دید سے سرفراز اور اس کے وصل سے ہمکنار نہیں ہو جاتا۔"

یہی عشق وہ بادۂ صد آتشہ ہے جو اقبال کے کلام میں موجزن ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر دفاتر قلمبند کیئے جاسکتے ہیں۔ بالِ جبریل میں وہ عشق کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اولیں ہے عشق　　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق　　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق وہ واحد وصف ہے جو انسانی کارناموں کو حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔ عشق کی بے پناہ، عالم گیر اور غیر فانی قوتوں کا اندازہ ''مسجد قرطبہ'' کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ　　　عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک　　　عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود　　　عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کی مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　　عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

پروفیسر نغمہ زیدی عشق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں ''مردِ خدا کا خمیر عشق سے اٹھتا ہے، عشق اصلِ حیات ہے۔۔۔ عشق جاوداں ہوتا ہے۔۔۔ عشق ایک پاکیزہ روحانی بلکہ آسمانی جوہر ہے، عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ ہے۔ عشق کی عظمت، رفعت، طہارت اور روحانیت کے اظہار کے لیئے اقبالؒ نے عشق کو دو عظیم ہستیوں سے وابستہ کر دیا ہے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ اللہ تعالیٰ کے عشق کا مرکز ہے اور مصطفیٰؐ کا دل عشق الٰہی کا گہوارہ، عشق جبرئیل کا نفس، عشق خدا کا کلام ہے۔ اپنے محبوب سے عشق کی بدولت اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک نازل کیا، اور محبت کے اس مرکز کو رحمۃ اللعالمینؐ بنا کر بھیجا۔۔۔''

اقبال کی کشتِ جاں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی تخم ریزی بچپن کے ماحول اور تربیت کی مرہونِ منت ہے۔ والد شیخ نور محمد متقی و پرہیز گار اور صوفیاء کرام سے عقیدت رکھتے تھے، اور پھر نامور عالم مولانا سید میر حسن جیسے استاد نے ایک عبقری ذہن پر جو نقوش چھوڑے اس نے

اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو رسول اللہ کی محبت سے یہ کہہ کر ''قل اِن کنتم تحبّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ'' ۔۔۔''اے محبوب فرما دیجئے، اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو، اس طرح اللہ تم کو اپنا محبوب بنا لے گا'' مشروط فرما دیا۔

ایک حدیثِ قدسی ہے: ''لَو لَاکَ لَما خَلَقت الا فلاک '' یعنی (اے محبوب، اگر تو نہ ہوتا تو میں افلاک تخلیق نہ کرتا) یعنی حضورؐ ہی وجہ تخلیق عالمِ آب وگل ہیں۔ سرکارِ دوعالم نے ایک اور مرتبہ ارشاد فرمایا: ''اوّلَ ماخلَقَ اللّٰہ نوری و آدم بینِ المَاءِ والطین ''''سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا اور اس وقت آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھا'' اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اقبال حضورؐ کی شان میں یوں رطب اللساں ہوتے ہیں:

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے | غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر | وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قولِ گرامی ہے ''کان خلقہٗ القرآن'' کہ ''حضورؐ کی ذاتِ مجسم قرآن تھی۔''

یہ اشعار بھی اسی نگاہِ عشق و مستی کے فیضان کے ترجمان ہیں:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیر یاب تو | نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو
لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب | گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے وجود سے فروغ | ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود | فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام | میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے | عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

ایک جہاں جانتا ہے کہ اس منزل صفات الٰہی تک کون پہنچا ہے، کون ایسا راہنما، قائد و راہبر ''بندۂ مولیٰ صفات'' ہے جس کے نقش پا اس منزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار خود مالکِ ارض و سما نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ ''لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنہ'' تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ اقبال اسی ''انسان کامل'' بلادِ عرب کے کملی پوش، امّی لقب، بوریہ نشیں، شہِ عرب و عجم کی ذاتِ والا صفاتِ اقدس و اطہر کے عاشقِ صادق ہیں۔ حضورؐ ہی وہ منتہا ہیں جن کے دامن میں ازل و ابد سمائے ہوئے ہیں۔ جس کو عشقِ رسولؐ کی دولت مل گئی اس کے دامن میں دنیاوی و اخروی دولت سمٹ آئی۔

ہر کہ عشقِ مصطفیؐ سامانِ او ست　　دہر کُل در گوشۂ سامانِ اوست

ترجمہ: ''جس کسی نے عشقِ محمدؐ کو اپنا سامان بنالیا، تو پھر اس کے دامن کے گوشے میں بحر و بر آجاتے ہیں''

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

نظم ''فقر'' میں عشقِ مصطفےؐ کے فقدان کو ساری خرابیوں کا سبب قرار دیتے ہیں

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد　　می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد
عصرِ ما را خود ز ما بیگانہ کرد　　از جمالِ مصطفیؐ بیگانہ کرد
سوزِ او تا از میانِ سینہ رفت　　جوہر آئینہ از آئینہ رفت

ترجمہ: ''اے کہ تُو جو ذوق و شوق اور سوز و درد سے خالی ہے کیا تجھے علم ہے کہ ہمارے دور نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس دور نے ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس نے ہمیں جمالِ مصطفیؐ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ جب حضورؐ کا عشق سینے سے نکل گیا تو آئینہ کے اندر سے اس کا جوہر جاتا رہا۔''

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ　　　سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبالؒ کا عقیدۂ توحید پختہ تر ہوتا گیا اور تجسّس نیز شوق و تحقیق نے انھیں قبیلۂ موحدّین اور کاروانِ عشاقانِ سیدؐ الانبیاء کے ممتاز سالاروں کی صف میں ایک نمایاں اور اعلیٰ و ارفع مقام پر لا کھڑا کیا۔ ان کی فکر کا مرکز و محور ارشادِ خداوندی کے مطابق "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" یعنی انسان کائنات میں حسنِ تخلیق کا بلند ترین شاہکار ہے اور اسی لیئے خلاقِ عالم نے انسان کو "خلیفۃ الارض" (البقرہ: ۳۰) کا منصب عطا فرمایا ہے۔ بقول اقبالؒ:

حرفِ "انی جاعل" تقدیرِ او　　　از زمیں تا آسماں تسخیرِ او

اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ میں آدم کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہوں اور زمین سے آسمان تک ہر شے کی تسخیر اس کی تقدیر ہے۔ لیکن اس منصب کے حصول کے لیے انسان کو ایک حدیثِ مبارکہ کے مطابق "تخلقو باخلاق اللہ" یعنی انسان کو صفات حمیدہ کا حامل حسنِ اخلاق اور اعلیٰ سیرت و کردار کا مظہر ہونا بہ الفاظِ دیگر "انسان کامل" ہونا ضروری ہے، جس کی زندگی آئینِ الٰہی کی عملی تفسیر ہوتی ہو، جس کے فیضِ بے پایاں سے یہ 'انسانِ کامل' اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے چشم و گوش اور دست و پا بن جاتے ہیں۔ حدیث قدسی ہے"

"اور جب میں اس [بندہ مومن] سے محبت کرتا ہوں تو اس کی وہ سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی وہ بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔"

علماء کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صفات الٰہی کا مظہر تسلیم کرتے ہوئے قرآن پاک کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں: "مارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ" اے محبوب، جب تو نے (غزوۂ بدر) وہ کنکریاں پھینکیں تھیں تو تو نے انھیں نہیں پھینکا تھا، بلکہ اللہ نے وہ کنکریاں پھینکی تھیں۔ (آیت ۱۷: سورۂ انفال) اقبال کہتے ہیں:

اقبال کو بتدریج شاعر، ساحر، دانشور، مفکر اسلام، اور بزبانِ شعر ترجمانِ قرآن بنادیا۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ شعر اقبالؒ کے ہمعصر مولانا گرامیؒ جالندھری سے منسوب ہے۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال　　پیغامبری کر د و پیمبر نتواں گفت

مولانا فیض الحسن سہارنپوری بھی اقبالؒ کے استاد رہے۔ ایم اے فلسفہ کی تحصیلِ علم کے دوران پروفیسر سر تھامس آرنلڈ سے تعلق نے اقبالؒ کی علمی اور فکری زندگی کا حتمی رخ مقرر کر دیا۔ مشرق کی صہبا سے سرشار رہتے ہوئے، علم کی تشنگی انھیں دیارِ مغرب کے میخانوں کی جانب لے چلی۔ اولیاء اللہ سے اقبال کو ہمیشہ عقیدت رہی چنانچہ سفر سے پہلے آستانہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر حاضری دیتے وقت یوں نغمہ سرا ہوئے، چند اشعار:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں　　تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر　　تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے　　یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

مغرب میں تحصیل علم سے انھیں مزید خرد افروزی میسّر آئی، ذہنی افق کو وسعت ملی لیکن یہ عقدہ کھلا کہ عقل کو جب تک توحید کا نور میسّر نہ آئے وہ ''محوِ تماشائے لبِ بام'' ہی رہتی ہے۔ جب کہ عشق حقیقی نہ صرف ''آتش نمرود'' میں بے خطر کود پڑتا ہے، بلکہ وہ ''اِک جست میں قصہ تمام'' کرتے ہوئے ''اس زمین و آسماں'' کی بیکرانی کو طے کر لیتا ہے۔ مغرب سے واپسی پر اس حقیقت کا اظہار ہوا:

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ　　سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ترجمہ: ''یورپ کے دانشوروں کے درس نے میری عقل میں اضافہ کیا، لیکن میرے سینے کو اہلِ بصیرت نے روشنی عطا کی۔'' اور عشق نے وہ بصارت اور بصیرت عطا کی کہ:

اور اب یہ وجد آفریں اشعار ملاحظہ ہوں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیؐ است | آبروئے ما ز نامِ مصطفیؐ است
طور موجے از غبار خانہ اش | کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش | تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
در شبستانِ حِرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شب ہا چشمِ او محروم نوم | تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم
وقتِ ہیجا تیغ او آہن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمیں تیغ او | قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغ او
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد | مسندِ اقوام پیش در نورد
از کلید دیں در دنیا کشاد | ہم چو او بطنِ امِ گیتی نزاد
در نگاہِ ہر یکے بالا و پست | با غلام خویش بر یک خواں نشست

ترجمہ: ''ہماری آبرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ہی کی بدولت ہے۔ کوہِ طور آنحضرتؐ کے مسکن کی خاک اور کعبہ آپ کا کاشانہ ہے۔ وہ ذاتِ گرامیؐ جس نے خود بوریے پر لیٹ کر زندگی گزاری، مگر اپنی اُمت کو ایسا فروغ بخشا کہ تاجِ کسریٰ ان کے قدموں میں روندا گیا۔ آپ نے تاریکئ غار حرا میں راتیں بسر فرمائیں اور ایک نظام، ایک آئین، اور ایک مثالی حکومت قوم کو عطا فرمائی۔ آپ نے شب بیداری میں زندگی بسر کی تا کہ آپ کی اُمت تختِ خسروی پر جلوہ فرما ہو۔ میدان جنگ میں آپ کی تلوار فولاد کو پگھلا دیتی ہے۔ مگر نماز میں آپ کی ذاتِ اقدس اپنے معبود و مسجود کے سامنے آبدیدہ اور گریہ کناں ہے۔ آپ کی شمشیر اپنے جلو میں فتح و نصرت لیئے ملوکیت کی بیخ کنی کرتی ہے۔ آپ نے دنیا کو نیا نظام و آئین بخشا اور تمام پرانی قوموں کی بساط الٹ دی۔ آپ نے فرمایا کہ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولو تو راہِ راست پاؤ گے۔ آپ کی نظر میں بلند و پست سب انسان برابر ہیں۔ آپ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے ہیں۔''

عشقِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ اقبالؒ کی رگ و پے میں موجزن اور ان کی لبریز صراحی سے یہ بادۂ عشق ہمہ وقت چھلک رہی ہے۔ جب ان کی طویل نظم ''شکوہ'' شائع ہوئی تو نام نہاد ''دین ملائی سبیل اللہ فساد'' کے قبیل کے ناقدین نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر فرمادیا۔ حیرانی اس بات پر ہے کہ ان کے نکتہ چینوں میں بعض بہت ہی معتبر و معروف نام بھی شامل ہیں۔ حالانکہ بقول مفسر قرآن حضرت مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی ''شکوہ'' کا مفہوم و مطلب شکایت نہیں بلکہ اظہار رنج و غم ہے، وہ سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۱۶ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت بن یامین کے حاسد دروغ گو سوتیلے بھائیوں سے فرمایا: قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ، ''یعنی'' میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا۔'' اگر بالفرض شکوہ سے شکایت بھی مراد لی جائے تو بقول مولانا بندہ کا اپنے خالق سے شکایت کرنا محبوب، اور بندوں سے شکایت کرنا معیوب ہے۔ اگر ''زاہد تنگ نظر'' شکایت کے مفہوم سے نا آشنا ہے تو اقبالؒ نکتہ شناس نے ابتدا ہی میں یہ کہہ کر ''شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو'' معذرت خواہی کر لی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ آج بھی ایسے کج نہاد نکتہ چیں موجود ہیں جو اقبالؒ کی فکر اور زبان و بیان کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اسی ضمن میں اقبالؒ نے اپنے جذبہ صادق کا اظہار بحضور سرورِ کائنات یوں کیا:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بہ حرفم غیر قرآں مضمر است

تنگ کن رختِ حیات اندر برم   اہلِ ملت را نگہدار از شرم

روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

ترجمہ: یارسولؐ اللہ، اگر میرے دل کا آئینہ جوہر سے خالی ہے اور اگر میری بات میں قرآن کے علاوہ کچھ اور پوشیدہ ہے تو میرا جامۂ زندگی تنگ فرمادیجئے اور ملتِ اسلامیہ کے افراد کو میرے شر سے محفوظ رکھیے۔ میرے آقا آپ قیامت کے دن مجھے اس طرح ذلیل و رسوا کیجئے کہ مجھے اپنے پاؤں کے بوسہ سے بھی محروم فرمادیجئے۔''

ایک دوسرے مقام پر بارگاہِ خداوندی میں یوں عرض گزار ہوئے:

تُو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را بہ بینی ناگزیر　　از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

ترجمہ: ''اے رب العالمین آپ ہر دو جہاں سے غنی ہیں، روز محشر میرا عذر قبول فرما لیجئے، اگر نامۂ اعمال میں میرے گناہ ناقابلِ معافی ہیں تو یہ کرم کیجئے کہ انھیں نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی و پوشیدہ رکھیے۔''

اس رباعی میں بھی اسی استدعا کی تکرار بہ انداز دگر ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر　　شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا　　حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

ترجمہ: ''قیامت کے روز جب یہ جہانِ پیر اپنے انجام کو پہنچے اور ہر پوشیدہ تقدیر ظاہر ہو جائے۔ تو یا اللہ اس دن میرے آقا کے سامنے مجھے رسوا نہ کیجئے۔ میرا حساب لیجئے مگر حضور کی نگاہ سے پوشیدہ رکھیے۔''

ایک طویل نظم ''کلیمی'' میں فرماتے ہیں:

معنیٔ جبریل و قرآن است تو　　فطرت اللہ را نگہبان است تو
حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج　　بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج
صحبت او ہر خزف را دُر کند　　حکمتِ او ہر تہی را پُر کند

ترجمہ: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پیغامِ جبریل اور قرآن کا عملی نمونہ ہے۔ وہ فطرت اللہ دین اسلام کے نگہبان ہیں۔ وہ ایسے حکمران ہیں جو تخت و تاج سے بے نیاز، نہ کلاہ رکھتے ہیں، نہ سپاہ اور نہ کسی سے خراج وصول کرتے ہیں، ان کی صحبت ہر سنگریزے کو موتی بنا دیتی ہے اور آپ کی حکمت ہر تہی دست کا دامنِ مُراد بھر دیتی ہے۔''

جاوید نامہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کی یوں نشان دہی فرماتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفیؐ او را بہا است   یا ہنوز اندر تلاش مصطفیؐ است

ترجمہ: ''اس جہانِ رنگ و بو میں جس طرف بھی نظر کیجیے تو آپ دیکھیں گے'' کہ اس خاک سے جو بھی آرزو پیدا ہوتی ہے، وہ یا تو نور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضوفشاں ہو رہی ہے یا ابھی تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔''

اقبالؒ علیل تھے۔ خواب میں سر سید علی الرحمہ کو دیکھا جنھوں نے امام بوصیری رحمتہ اللہ علیہ کے معروف ''قصیدہ بردہ'' کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ امام بوصیری نے جان لیوا علالت میں عشق سے لبریز ایک غیر فانی نظم ''قصیدہ بردہ'' بارگاہِ رسالت مآب میں پیش کی۔ رحمتِ عالمؐ نے خواب میں امام بوصیری کو اپنی دید سے مشرف فرمایا اور انھیں اپنی چادر (بردہ) مبارک عطا فرمائی اور نتیجتاً بوصیری شفایاب ہوئے۔ اقبالؒ نے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے ایک نظم ''در حضور رسالت مآب'' بطور فریاد پیش کی، آپ لطف و کرم کے طالب ہوئے اور شفا پائی۔

گردِ تو گردد حریمِ کائنات   از تو خواہم یک نگاہِ التفات
چوں بصیری از تو میخواہم کشود   تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است   در خطا بخشی چو مہر مادر است
اے وجود تو جہاں را نو بہار   پرتو خود را دریغ از من مدار
گرچہ کشتِ عمر من بے حاصل است   چیزکے دارم کہ نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں   کز بسمِ شبدیز تو دارد نشاں

ترجمہ: (کائنات آپ کے حریم ناز کا طواف کرتی ہے، میں آپ کی ایک نگاہِ التفات کا بھکاری ہوں۔ میں بھی بوصیری کی طرح آپ سے شفا کا خواہاں ہوں تاکہ میرے صحت مندی کے دن لوٹ آئیں۔ گناہگاروں پر آپ کی شفقت زیادہ ہوتی ہے اور خطائیں معاف کرنے میں آپ کی

شفقت ماں کی شفقت کے مانند ہے۔ آپ کا وجود مبارک جہاں کے لیئے نو بہار ہے اپنے عکس جمال سے مجھے محروم نہ رکھیے۔ اگرچہ میری عمر کی کھیتی لا حاصل ہے، مگر میں ایک چھوٹی سی چیز دل نام کی رکھتا ہوں۔ میں نے اسے لوگوں کی نظر سے پنہاں اس لیئے رکھا ہے کہ اس پر آپ کے اسپِ مشکیں کے سم کا نشاں موجود ہے۔)

''اسرارِ خودی'' میں فرماتے ہیں:

ہست معشوقے نہاں اندر دلت	چشم اگر داری بیا بنما ئمت
دل ز عشقِ او توانا می شود	خاک ہمدوشِ ثریا می شود
خاکِ عالم از دو عالم خوشتر است	اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

ترجمہ: ''تیرے دل کے اندر ایک معشوق نہاں ہے، اگر تیرے پاس آنکھیں ہیں تو ادھر آ میں تجھے دکھادوں۔ اس کے عشق سے دل توانائی پاتا ہے اور خاک ثریا کی ہم مرتبہ بن جاتی ہے۔ مدینہ منورہ کی زمین دونوں جہانوں سے زیادہ محبوب ہے اس لیئے کی اس ٹھنڈے شہر مبارک میں اپنا دلبرؐ ہے۔''

اقبالؒ عشقِ رسالت مآبؐ میں اس قدر غرق تھے کہ جب بھی حضورؐ کا نام نامی سنتے آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ حالانکہ ان کے نزدیک:

معنیٔ دیدار آں آخر زماں	حکم او در خویشتن کردن رواں
در جہاں زی چوں رسولؐ انس و جاں	تاکہ تو باشی قبول انس و جاں
باز خود را بیں ہمیں دیدار اوست	سنت او سرّے از اسرار اوست

ترجمہ: ''اتباعِ رسولؐ اور تقلید نبوی کا نام دیدار رسولؐ ہے۔ دنیا میں ایسے بسر کرو جیسے رسولؐ پاک کا اسوۂ حسنہ تم کو تلقین کرتا ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم کو جن و انس سب میں قبولیت حاصل ہو جائے گی۔ آپؐ کی سنت کی پیروی میں ڈوب کر خود شناسی حاصل کرو، یہی آپؐ کا دیدار ہے۔ یاد رکھو کہ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی سنت آپ کے اسرار میں سے ہے۔''

اس کے باوجود بھی اقبال مدینۃ النبیؐ کی زیارت کے لیئے عمر بھر تڑپا کیے لیکن دل کی آنکھوں سے بارہا اس ٹھنڈے شہر کی دید و حاضری سے سرفراز ہوئے۔ چند رباعیاں اس عشق و سرور و مستی کی آئینہ دار، راکب و مرکب کی کیفیات اور راہ گزر کے حسین مناظر کا جذبۂ عشق کے ساتھ اتصال اور پھر ان کے اظہار میں کیف و سرور، شوق و مستی، آہنگ و نغمگی اور سوز و گداز، اقبال کی غیر فانی تخلیقی فن کارانہ صلاحیت کی عظمت کے شاہکار ہیں۔

بچشم من نگہ آوردۂ تست ‌‌ ‌ ‌ فروغ لا الہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبح امن ترانی ‌ ‌ ‌ شبم را تاب مہ آوردۂ تست

ترجمہ: ''میری آنکھ میں نگاہ آپ کی بدولت ہے اور میرے قلب میں لا الہ کا نور آپ کی عنایت سے ہے۔ آپ ہی نے میری رات کو چاندنی عطا فرمائی۔ اب مجھے اپنے مبارک دیدار کی صبح سے بھی مشرف فرمایئے۔''

بدن وامانده، جانم در تگ و پوست ‌ ‌ ‌ سوئے شہرے کہ بطحا در رہ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز ‌ ‌ ‌ کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

ترجمہ: ''میرا جسم تھک گیا اور میری روح اس شہر کی طرف بھاگ دوڑ کر رہی ہے، جس کے راستے میں بطحا یعنی مکہ آتا ہے۔ تو یہاں مکہ میں اپنے خاص بندوں کے سات مل بیٹھ، میں اپنے محبوب کی منزل (مدینہ) کی آرزو رکھتا ہوں۔''

در آں دریا کہ او را ساحلے نیست ‌ ‌ ‌ دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم ‌ ‌ ‌ وگرنہ جز تو ام را منزلے نیست

ترجمہ: ''عشق کا دریا وہ ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، وہاں دل کے سوا عاشقوں کا کوئی راہنما نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو مکہ مکرمہ چلا گیا، ورنہ آپؐ کے سوا میری اور کوئی منزل نہیں۔''

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم نواخواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کی در صحرا سرِ شام کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ترجمہ: ”میں نے سرورِ محبت میں نغمے الاپتے ہوئے اس بڑھاپے میں مدینہ منورہ کا راستہ اختیار کیا۔ اس پرندہ کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت آشیانہ کی فکر میں اپنے پر کھولتا ہے۔“

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی بپایش ریگ ایں صحرا حریر است

ترجمہ: ”میں نے صبح کے وقت اپنی اونٹنی سے کہا کی ذرا آہستہ چل، تیرا سوار تھکا ماندہ اور بیمار ہے۔ مگر اس نے (اسے ادراک تھا کہ اس کا رخ کاشانۂ رسولؐ کی جانب ہے) ایسے مستانہ وار قدم بڑھایا کہ کہنا پڑا کہ صحرا کی ریت اس کے پاؤں کے نیچے ریشم کی طرح نرم ہے۔“

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا درودے خواند و محمل را براند
بہ ریگِ گرم او آور سجودے جبیں را سوز، تا داغے بماند

ترجمہ: ”کیا ہی خوب ہے وہ صحرا جس میں قافلے درود شریف پڑھتے ہوئے سواریاں آگے بڑھا رہے ہیں تُو اس کی گرم ریت پر سجدہ کناں ہو کر اپنی پیشانی جلا دے تا کہ اس پر (سجدہ کا نشان) باقی رہ جائے۔“

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ چو ما ہر ذرۂ او درد مند است

ترجمہ: ”کیا خوب ہے صحرائے حجاز جس کی شام میں صبح کا تبسم ہے۔ اے مسافر ذرا اور آہستہ قدم رکھ، کیونکہ اس صحرا کا ہر ذرہ ہماری طرح دردمند ہے۔“

غمِ راہے نشاط آمیز تر کن فغانش راجنوں انگیز تر کن

بگیر اے سارباں راہِ درازے مرا سوز جدائی تیز تر کن

ترجمہ: ''اے سارباں، تو مسافر کے غم (عشق) کو اور زیادہ نشاط انگیز بنا، اس آہ و فغاں کو اور جنوں انگیز کر دے۔ کوئی طویل راستہ اختیار کر، اور اس طرح میرے سوز جدائی کو فزوں تر کر دے۔''

اقبالؒ کو جب دیارِ حبیبؐ کے منظر کا سامنا ہوا تو واردات عشق و عقیدت، تاثرات قلب اور سوز و گداز کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ یوں گہر افشاں ہوئے، کہ آپ اپنی تمام بیدار ظاہری اور باطنی حسوں کے ساتھ خود کو اقبالؒ کا ہمسفر پاتے ہیں اور ریگ زار عرب کا ہر ہر منظر آپ کو معرفت حسن بخشتا ہے۔ آیئے اقبالؒ کے ساتھ سرزمین انبیاء فلسطین چلتے ہیں اور مدینۃ النبیؐ کے گرد و نواح کے منظر سے مشامِ جاں کو معطر کرتے ہیں۔ ان اشعار میں عربی شاعری کی تلمیحات کی گھلاوٹ اور شیرینی بھی دامن دل کھینچتی ہے۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود دل کے لیئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں

سرخ و سفید بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب کوہِ صنم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی اہلِ فراق کے لیئے عیشِ دوام ہے یہی

عالمِ خیال میں ذوق و شوق کی یہ منزلیں کیسی وارداتِ قلبی کے ساتھ طے ہوئی ہیں یہ وہی دل جان سکتا ہے جو عشق کے نشہ سے شاداب و سرشار ہو۔ آپ بھی ان رباعیوں کے سحر میں گرفتار ہو کر عشق مصطفیٰؐ کی لذت سے قریہ جاں کو بہار بداماں کیجئے۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم من و تو کشتۂ شان جمالیم

دو حرفے بر مراد دل بگوییم بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

ترجمہ: (اب اقبال چشمِ تصور میں روضۂ اطہر پر پہنچ چکے ہیں) اے دوست آ، ہم اکٹھے ہو کر آنسو

بہائیں، کیونکہ میں اور تو، دونوں حضور اکرمؐ کی شانِ جمالی کے شہید ہیں۔ اپنی مراد کے مطابق دو حرف عرض کردیں، اور آقاؐ کے پائے مبارک پر اپنی آنکھیں ملیں۔)

یہاں دل کی مراد برآنے اور عشق کی مکمل فتح سے سرشاری کی کیفیت کا اظہار کس قدر دلفریب انداز میں ہو رہا ہے

حکیماں را بہا کمتر نہادند — بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے — در سلطاں بہ درویشے کشادند

ترجمہ: "یہاں داناؤں کی کوئی قدر و قیمت نہیں، البتہ ناداں کو اپنے جلوۂ مستانہ سے بہرہ یاب فرماتے ہیں۔ وہ درویش کتنا خوش نصیب ہے جس کے لیئے بارگاہِ سلطانی میں باریابی کا دروازہ کھولا گیا۔"

اقبالؒ کے جذبہ عشق پر ان کا یہ شعر کس قدر صادق آتا ہے:

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات — تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ترجمہ: "زندگی برسوں کعبہ و بتخانہ میں آہ وزاری کرتی ہے تب کہیں جاکر کائناتِ عشق سے کوئی (اقبالؒ جیسا) رازداں نمودار ہوتا ہے۔"

اس شعر میں عرفان و عشق رسولؐ ملاحظہ ہو:

می توانی منکر یزداں شدن — منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

ترجمہ: "تو کسی نہ کسی خدا کا منکر تو ہو سکتا ہے، لیکن شانِ نبیؐ سے ہرگز منکر نہیں ہو سکتا۔ اگر حضورؐ تشریف نہ لاتے تو ہمیں اللہ تبارک تعالیٰ کا عرفان کیسے میسر آتا؟"

اقبالؒ کی فکر و فن کی بے شمار جہات ہیں، لیکن ان سب میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جہت بہت ممتاز ہے اور اس پر بہت لکھا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ کی روح سے معذرت کے ساتھ ایک تصرف کی جسارت کرتے ہوئے ان کے اس شعر پر اپنی تشنہ تحریر ختم کر رہا ہوں:

طوالت کے سبب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ — ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ

کتابیات

آغا، ڈاکٹر وزیر۔۔ ’’تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں‘‘ اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۰ء

بقا، محمد شریف۔۔ ’’اقبال اور تصوف‘‘، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء

جعفری، منظور احمد۔۔ ’’عرفانِ اقبال‘‘، ندرت پرنٹرز، لاہور، ۱۹۷۵ء

حامد، ڈاکٹر مظہر حامد۔۔ ’’اقبال کی متصوفانہ فکر‘‘، سہ ماہی الاقرباء، اسلام آباد، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴

خان، ڈاکٹر یوسف حسن۔۔ ’’روح اقبال‘‘، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۴۹ء

شکیل، شاہ مصباح الدین۔۔ ’’عشق رسولؐ اور اقبال‘‘ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، ۱۹۷۳ء

طارق، عبدالرحمان۔۔ ’’جوہر اقبال‘‘ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۱ء

عظیم، سید وقار۔۔ ’’اقبال کا مطالعہ‘‘ اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۵ء

فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر۔۔ ’’اقبال اور محبت رسولؐ ‘‘ اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۲ء

قریشی، محمد اسماعیل۔۔ ’’علامہ اقبال بحیثیت مفسر قرآن‘‘، سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد، سالنامہ ۲۰۰۸ء

کامران، ڈاکٹر شاہد اقبال۔۔ ’’تصوف اور اقبال‘‘ سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد، اپریل۔ جون، ۲۰۰۶

’’کلیاتِ اقبال‘‘ جلد اول و دوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

زیدی، پروفیسر نغمہ۔۔ ’’مسجدِ قرطبہ، شاعر مشرق کی ایک شاہکار نظم‘‘ سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۱

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

علامہ اقبالؒ کا تصورِ زماں

(تحقیق کے نئے زاویے)

علامہ اقبالؒ نے زمان و مکاں کے مسئلے کو اسلامی تہذیب کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دے کر جہاں اس مسئلے کی مرکزیت کا بیان کیا، اس امر کو بھی بیان کر دیا کہ ان کے ہاں اس کے مضمرات کتنے عمیق ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے خطبات میں فرمایا کہ اسلامی ثقافت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ اعلیٰ درجہ کے تصوف نے جو نصب العین مسلمانوں کے سامنے رکھا وہ یہ ہے کہ محدود انسان کسی طرح غیر محدود سے ہم آغوش ہو جائے اور جس ثقافت کا رجحان یہ ہو اس میں زمان و مکاں کا مسئلہ دراصل زندگی اور موت کے سوال کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ (اقبالؒ: ۱۰۵: ۲۰۰۶)

اس سے قبل صوفیہ نے زمان و مکاں کی اس حیثیت کو بیان کیا تھا مگر وہ محض انفرادی دائرے میں تھا۔ عین القضاۃ ہمدانی نے 'غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان والمکان' میں لکھا کہ زمان و مکاں کا راز سب سے بڑا راز ہے، اس کو جان لینا سرِ کائنات اور صفات حق کو جان لینا ہے۔ بالفاظ دیگر کوئی بھی شخص اس وقت تک معرفت الٰہی سے کماحقہٗ بہرہ ور نہیں ہو سکتا جب تک اسے سرِ زمان و مکاں سے آگاہی نہ ہو جائے۔ مگر یہاں صوفیہ نے زمان و مکاں کی معرفت کو صرف سالک کے انفرادی حصول معرفت تک محدود رکھا جب کہ 'وان الی ربک المنتھی' (القرآن: ۴۲:۵۳) کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ نے زمان و مکاں کے مسئلے کو تہذیبی وسعت تک پھیلا دیا اور اسے تاریخی اور تہذیبی سطح پر زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دیا جس کے مضمرات کہیں زیادہ وسیع اور عمیق ہیں۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ زمان و مکاں کا فہم بدلنے سے کائنات کے بارے میں تصور، نقطہ نظر اور ماہیت فہم میں تبدیلی وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔ علامہ کے ہاں چونکہ زمان و مکاں کا مسئلہ ملت

اسلامیہ کے لیے زندگی اور موت کے مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے سوانہوں نے اسے اپنی فکر کو مرکزی نقطہ بنایا اوران کے ہاں اس کی معنویت تہذیبی حدود کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تہذیب کسی بھی قوم کے اجتماعی فکروعمل کے سماجی و معاشرتی اظہار کا نام ہے۔ تہذیب کا اظہار سماجی رویوں، ثقافتی رجحانات اور معاشرتی واقعات سے ہوتا ہے۔ اشیا اور واقعات کے فہم کے لیے زمان و مکاں بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول کانٹ:

"By means of the external sense, a property of our mind, we represent to ourselvs objects as without us, and these all in space....so that all which relates to the inward determinations of the mind is represented in relations of time". (Kant, 1970-67-68)

یہی سبب ہے کہ ہر دور کے اہل علم وفکر نے حقیقت زماں کو سمجھنے کے لیے غوروفکر کیا۔ زماں کی اس پُراسرار حیثیت کے باعث کہ اس پر غوروفکر کرتے ہی یہ فوراً ماضی میں بدل جاتا ہے، زماں کی ماہیت کے گرفت میں نہ آنے کا تصور ہر دور میں موجود رہا، سو اس کی حقیقت کو کماحقہ، سمجھا نہ جا سکا۔ تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زمان و مکاں کے بارے میں کسی بھی زمانے میں موجود فکری رجحانات اور تصورات سے ہی اس دور کے عمومی رجحانات کا تعین ہوا۔ اگر ہم انسانی فکر کی تاریخ کا دوراول سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تصور زمان و مکاں نے ہر دور کے علمی وفکری رجحانات اور عمومی تصورزیست کو طے کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلم فکری تاریخ پر بھی اس اصول کا اطلاق یکساں ہے۔ علامہ زماں کے باب میں موجود تصورات کا دیگر شعبہ ہائے حیات پر اثر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ محض ایک نظری بحث نہیں تھی۔ البیرونی کی دریافت، جسے ہم ردِّعمل کا وقت' کہتے ہیں اور الکندی کی یہ دریافت کہ احساس مہیج کے تناسب سے ہوتا ہے وہ مثالیں ہیں جو اس طریق کار کے نفسیات میں اطلاق پر مشتمل ہیں۔ یہ خیال کرنا غلط فہمی پر مبنی ہے کہ تجربی طریق اہل یورپ نے دریافت کیا تھا۔ (اقبالؒ: ۱۰۳ : ۲۰۰۶)

علامہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''۔۔۔زماں کے ضمن میں بھی مسلمانوں کی فکری کوششیں یونانیوں سے بالکل ہی مختلف سمت میں متحرک ہوئی ہیں۔(اقبالؒ:۱۰۵ : ۲۰۰۶)

اقبالؒ کی فکر میں مسئلہ زمان و مکاں کی اہمیت کے پیش نظر ان پہلوؤں کو موضوع تحقیق بنانا درکار ہے جن سے اقبالؒ کے تصورِ زماں کے نئے گوشے سامنے آسکیں۔ان موضوعات میں:

۱۔ اقبالؒ کے تصورِ زماں پر مسلم مفکرین کے اثرات،

۲۔ جبر کے بجائے اختیار کے رویے کی تشکیل،

۳۔ جدید سائنسی تحقیقات کے تناظر میں اقبالؒ کے تصورِ زماں کا تجزیہ،

۴۔ اقبالؒ کے تصورِ زماں پر ابن عربی کے ممکنہ اثرات اور

۵۔ اقبالؒ کے تصورِ زماں کی تہذیبی اہمیت شامل ہیں۔

(۱)

اقبالؒ کے تصورِ زماں کی ایک جہت اس کی اصل کو مسلم صوفیہ اور فلاسفہ کی فکری روایت میں تلاش کرنا ہے۔حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے رسالے Islamic Culture میں اپریل ۱۹۲۹ء میں علامہ کا ایک مضمون A Plea for Deeper Study of the Muslim Scientists شائع ہوا۔اس مضمون میں دیگر مسلمان سائنسدانوں کے سائنسی کارناموں اور ان کی تاریخ انسانی میں غیر معمولی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مضمون کے آخر میں علامہ نے ایک مسلم صوفی عین القضاۃ ہمدانی کے رسالے غایتہ الامکان کا ذکر کیا اور اس کے تصورِ زماں کو تفصیل سے بیان کیا۔حیران کن بات یہ ہے کہ اس مضمون میں بیان کردہ خیالات کا اثر ہمیں علامہ کے خطبات میں بھی نظر آتا ہے۔مثلاً زمانِ الٰہی اور زمانِ متسلسل کا فرق،زمان الٰہی کو ام الکتاب قرار دینا،زمان الٰہی کے تقدم کی اساس،زمان الٰہی میں علتی تسلسل سے ماوراء تمام کائنات کا ایک واحد فوق الدوام اکنوں میں مرتکز ہونا وغیرہ۔تاہم علامہ کی اس تحریر کا سب سے قابل توجہ اور دلچسپ

حصہ وہ ہے جہاں وہ ہمدانی کے تصورات کو جدید فلسفیانہ تصورات کا پیش رو قرار دیتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ کانٹ سے بہت پہلے عراقی نے متعدد مکانوں کا تصور پیش کیا تھا۔ شیروانی: (۱۷۷۔۱۷۶: ۲۰۰۹ء) اور پھر آگے چل کر علامہ ہمدانی کے تصور زمان و مکاں کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس کے حاصلات فکر کے ان پہلوؤں کی توصیف کرتے ہیں جو ان کے نزدیک راست طرز پر ہیں بلکہ ان تصورات کو علامہ نے بعد اخود بھی اختیار کیا:

زماں کی اہمیت پر اگر عراقی کو ذرا زیادہ بصیرت ہوتی تو وہ اس خیال تک پہنچ جاتا کہ زماں، مکاں کی نسبت زیادہ بنیادی ہے اور یہ کہنا (جیسا کہ پروفیسر الیگزانڈر نے واقعی کہہ دیا ہے) کہ ''زماں ذہن ہے مکاں کا'' محض شاعرانہ استعارہ نہیں۔ عراقی نے کائنات کے ساتھ خدا کا تعلق روح اور جسم کے تعلق کے مماثل قرار دیا ہے لیکن بجائے اسکے کہ وہ تجربہ کے مکانی اور زمانی پہلوؤں کی تحقیق کے ذریعے فلسفیانہ طریق سے اس نظریے پر پہنچتا اس نے محض روحانی تجربہ کی بنا پر اس کا دعویٰ کر دیا۔ خدا کی معرفت کے لیے یہ کافی نہیں کہ اس انتہائی مقام پر جو نقطہ بھی ہے اور آن بھی (Point.Instant) ہم مکاں اور زماں کے متوازی سلسلوں کا اتصال دیکھیں۔ وہ فلسفیانہ راستہ جس پر چل کر ہم خدا کو کائنات کی روح کلا(Omni psyche) کی شکل میں دیکھتے ہیں، اس انکشاف سے گزر کر ملتا ہے کہ ''زماں ۔ مکاں''(Space-Time) کا اصل اصول ''فکر زندہ'' (Living Thought) ہے۔ عراقی کا دماغ صحیح رخ پر چلا لیکن ایک تو وہ ارسطا طالیسی رجحانات کا پابند تھا اور دوسری طرف اس میں نفسیاتی توجیہ کی کمی تھی اور یہ دونوں خامیاں اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوئیں۔ چونکہ وہ اس نظریے پر قائم تھا کہ زمان الٰہی تغیر سے بالکل مبرا ہے اس کا یہ نظریہ بدیہی طور پر شعور تجربے کے غیر صحیح تجزیے پر مبنی تھا۔ اس لیے اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ زمان الٰہی اور زمان مسلسل کا باہمی تعلق منکشف کر سکے اور اس انکشاف کے ذریعے عالم کی تخلیق (تولید) مسلسل کے اس تصور تک پہنچے جو اسلام کے ساتھ مختص ہے۔ اور جس کے معنی نمو پذیر کائنات (Growing Universe) کے ہیں۔ (شیروانی: ۱۷۸۔۱۷۷: ۲۰۰۹ء)

(۲)

تشکیل جدید میں علامہ نے لکھا کہ تقدیر زمانہ ہی کی ایک صورت ہے جب اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ تقدیر وہ زمانہ ہے جو سلسلۂ اسباب سے آزاد ہو کر درجہ ظہور میں آ رہا ہوتا ہے۔

" It is time regarded as an organic whole that describes as Taqdar or the destinóóó Destiny is time regarded as prior to the disclosure of its possibilities" (Iqbal.2006:40)

علامہ کے نزدیک زماں کا مسئلہ جبر و اختیار کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ (اقبالؒ:۴۰:۲۰۰۶ء)

چونکہ علامہ چاہتے ہیں کہ مسلمان مرتبۂ جبر کی قید سے نکل کر مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جائیں سو حقیقت زمان و مکاں کا فہم اس باب میں ایک اہم مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ (اقبالؒ:۱۰۵:۲۰۰۶ء)

قرآن حکیم نے بھی اختلاف لیل و نہار کو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا یعنی لیل و نہار کا زمانہ کے ساتھ جو رابطہ ہے وہ قربت ربانی کی رسائی کے لیے ایک آیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ (القرآن،۳:۱۹۰۔۱۹۱)

قرآن حکیم میں وقت اور مظاہر وقت کی بیان کی جانے والی اہمیت کے پیش نظر ہی تاریخ اور فطرت اسلام کے بنیادی ماخذ علوم قرار پائے۔ بقول اقبالؒ:

تاہم باطنی تجربہ انسانی علم کا محض ایک ذریعہ ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق علم کے دو دیگر ذرائع بھی موجود ہیں: فطرت اور تاریخ۔ ان دو ذرائع علم سے استفادہ کی بنا پر ہی اسلام کی روح اپنے اعلیٰ مقام پر دکھائی دیتی رہی ہے۔ (اقبالؒ: ۱۰۲:۲۰۰۶ء)

اقبالؒ کے مطابق زمان الٰہی وہ ہے جسے قرآن 'ام الکتاب' کے نام سے بیان کرتا ہے۔ (اقبالؒ:۵:۲۰۰۶ء)۔ اور زمان و مکاں کو بطور ایک کل کے قرآن حکیم نے 'لوح محفوظ' کہا ہے۔ (اقبالؒ:۵: ۲۰۰۶)

اقبالؒ کے نزدیک زمان ومکاں کا تعلق حیات کے ساتھ بڑا قریبی اور گہرا ہے جب تک اس تعلق کو نہ سمجھا جائے اسوقت تک زندگی کی حقیقت آشکار نہیں ہوسکتی۔ ''گلشن راز جدید'' میں فرماتے ہیں:

حقیقت راچو ما صد پارہ کردیم   تمیز ثابت و سیارہ کردیم
خرد در لامکاں طرح مکاں بست   چو زنارے زماں را بر میاں بست
زماں را در ضمیر خود ندیدم   مہ و سال و شب روز آفریدم
مہ و سالت نمی ارزد بیک جو   بحرف کم لبثتم غوطہ زن شو
بخود رس از سر ہنگامہ بر خیز   تو خود را در ضمیر خود فروریز
(اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۵۴۷)

اگر اقبالؒ کے تصورِ زماں، جو کہ اقبالؒ کی شاعری اور فلسفے دونوں میں پھیلا ہوا ہے، کو سامنے رکھتے ہوئے اقبالؒ کے تصورِ زماں کی نمایاں خصوصیات بیان کی جائیں تو ان کی تفصیل یوں سامنے آتی ہے۔

۱۔ وجود حقیقی یعنی ذات باری تعالیٰ کے مقابل زماں کی حیثیت نیستی کی ہے۔ کائنات ایک آزاد تخلیقی حرکت کا نام ہے اور زماں اس حرکت کا مقدر ہے۔ (اقبالؒ: ۲۰۰۶: ۴۱)

۲۔ زماں کا دوسرا مفہوم وہ ہے جسے اقبالؒ نے زمانِ مسلسل (serial Time) سے تعبیر کیا ہے۔ خطبات کے صفحہ ۵ اور ۳۱، ۳۲ پر علامہ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ جسے ہم ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسے ہی عرف عام میں وقت کہتے ہیں۔ اقبالؒ کی رائے میں یہ غیر حقیقی ہے اور اس کا تعلق ہماری خودی کے اس پہلو سے ہے جسے اقبالؒ نے فعال خودی (Efficient Self) سے تعبیر کیا ہے۔ (اقبالؒ: ۲۰۰۶: ۳۹۔۴۰)

سرار خودی میں فرماتے ہیں:

در گلِ خود تخم ظلمت کاشتی   وقت را مثلِ خطے پنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار   فکرِ تو پیمود طولِ روزگار
(اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۷۱)

گلشنِ راز جدید میں فرماتے ہیں:

خرد در لامکاں طرح مکاں بست   چوں زنارے زماں را بر میاں بست
زماں را در ضمیرِ خود ندیدم   مہ و سال و شب و روز آفریدیم

---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۵۴۷)

۳۔ زماں کا تیسرا مفہوم وہ ہے جسے اقبالؒ حقیقی زمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا تعلق ہماری قدر آفریں خودی (Appreciative Self) کے ساتھ ہے۔ یہ وہ زماں ہے جو خارج میں موجود نہیں ہے بلکہ ہمارے انفس میں پوشیدہ ہے۔ یہی دورانِ خالص (Pure Duration) ہے۔ اقبالؒ نے خطبات کے صفحہ ۳۸، ۳۹، ۴۶، ۴۷ اور ۶۱ پر اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

بال جبریل میں فرماتے ہیں:

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا   ایک زمانہ کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
---- (اقبالؒ، ۲۰۰۷: ۴۲۰)

یا یہ کہ:

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا   اور بھی زمانے ہیں جن کا نہیں کوئی نام
---- (اقبالؒ، ۲۰۰۷: ۴۲۰)

اگر ہم اقبالؒ کے اس تصورِ زماں کا خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو وہ یوں ہوگا:

زمانِ خالص یا حقیقی زماں جس کا احساس ہمیں اپنے شعوری تجربات کے تجزیہ سے ہوتا ہے آنات کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک نامیاتی کل ہے جس میں ماضی حال سے منقطع نہیں ہوتا۔

" Pure time, then, as revealed by a deeper analysis of our conscious experience, is not a string of separate, reversible instants, it is an organic whole in which the past is not left behind, but is moving along with, and operating in,the present. And the

future is given to it not as lying before, yet to be traversed, it is given only in the sense that it is present in its nature as an open possibility (Iqbal, 2006: 39-40)

اسی زمانِ خالص کو قرآنِ حکیم نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے۔

Time regarded as destiny forms the very essence of things. As the Quran says: God created all things and assigned to each its destiny (Iqbal, 2006: 40)

زماں بحیثیت تقدیر "صورت گرِ کائنات" ہے۔

If time is real, and not a mere repetition of homogeneous moments which make conscious experience a delusion, then every moment in the life of Reality is original, giving birth to what is absolutely novel and unforeseeable. 'Every day doth some new work employ Him', says the Quran. To exist in real time is not to be bound by the fetters of serial time, but to create it from moment to meoment and to be absolutely free and original in creation. In fact, all creative activity is free activity. Creation is opposed to repetition which is a characteristic of mechanical action. That is why it is impossible to explain the creative activity of life in terms of mechanismþþ. (Iqbal, 2006: 40).

حقیقی زماں میں زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تخلیقی فعلیت کا اظہار کر سکیں:

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے، تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے، بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے ، نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

---- (اقبالؒ، ۲۰۰۷: ۴۵۵۔۴۵۶)

زمانِ حقیقی دراصل انائے مطلق کی کئی شانوں میں سے ایک شان ہے لیکن اس زماں کا شب و روز سے کوئی تعلق نہیں۔

``Space and time are possibilities of the Ego, only partially realized in the shape of our mathematical space and time Beyond Him and apart from His creative activity, there is neither time nor space to close Him off in reference to other egos. The Ultimate Ego is, therefore, neither infinite in the sense of the space. bound human ego whose body closes him off in reference to other egos. The infinity of the Ultimate Ego consists in the infinite inner possibilities of His creative activity of which the universe, as known to us, only a partial expression``. (Iqbal, 2006:52)

گلشن راز میں فرماتے ہیں:

مجو مطلق دریں دیر مکافات
کہ مطلق نیست جز نور السّمٰوات

حقیقت لازوال و لامکان است　　مگو دیگر کہ عالم بیکران است
کرانِ او درون است و بروں نیست　　درونش پست، بالا کم فزوں نیست
درونش خالی از بالا و زیر است　　ولی بیرونِ او وسعت پذیر است
ابد را عقلِ ما ناساز گار است　　"یکی" از گیر و دار او ہزار است
---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۵۴۶)

اقبالؒ کے نزدیک پیکر ہستی خودی کے آثار میں سے ہے اور خودی کی دو جہتیں ہیں: ذاتیت اور فعلیت۔

خودی تعویذِ حفظ کائنات است　　نخستیں پرتو ذاتش حیات است
حیات از خوابِ خوش بیدار گردد　　درونش چوں یکی بسیار گردد
نہ او را بے نمود ما کشودی　　نہ مارا بے کشود او نمودی
ضمیرش بحرِ ناپیدا کناری　　دل ہر قطرہ موج بیقراری
---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۵۵۲)

اسرار خودی میں فرماتے ہیں:

پیکر ہستی ز آثار خودی ست　　ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست
خویشتن راچوں خودی بیدار کرد　　آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او　　غیر او پیداست از اثبات او
در جہاں تخم خصومت کاشت است　　خویشتن را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکر اغیار را　　تا فزاید لذت پیکار را
---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۱۲-۱۳)

خودی کی ان دونوں حیثیتوں یعنی ذاتیت اور فعلیت کے درمیان تعلق حرکت پر مبنی ہے جس کا لازمی نتیجہ تخلیق ہے جو فعلیت کا بنیادی تقاضا ہے۔ (اقبالؒ: ۳۶: ۲۰۰۶ء)
تخلیق پر مبنی حرکت کا مظاہرہ زمان و مکاں میں ہی ہوتا ہے۔ علامہ نے زماں کو مکاں سے

زیادہ اہمیت دی ہے۔ زماں اور مکاں دونوں میں لمحہ زیادہ بنیادی ہے۔ تاہم نقطے کو لمحے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ اس کے اظہار کا ایک لازمی انداز ہے۔ یہاں نقطہ کوئی شے نہیں رہتا بلکہ یہ لمحے کو دیکھنے کا ہی ایک انداز ہے۔

" The instant is the more fundamental of the two. but the point is inseparable from the instant as being a necessary mode of its manifestation. The point is not a thing, it is only a sort of looking at the instant ".(Iqbal, 2006: 57)

اسی لیے علامہ نے زماں کو مکاں کا ذہن کہا ہے۔

"....That time is the mind of space"(Iqbal,2006:110)

وہ حرکت یا تغیر جو ذات اور فعل کے درمیان موجود ہے اصلِ زماں یا زمانِ حقیقی ہے۔

``If time is real, and not a mere repetition of homogeneous moments which make conscious experience a delusion, then every moment in the life of Reality is original,giving birth to what is absolutely novel and unforeseeable``(Iqbal, 2006, :40)

جس کے ذریعہ ذاتِ الٰہیہ کے پوشیدہ امکانات عمل پذیری کے ذریعہ سے ظہور میں آتے ہیں

As the Quran says: God created all things and assigned to each its destiny; the destiny of a thing then is not an unrelenting fate working from without like a task master; it is the inward reach of a thing, its realizable possibilities which lie within the depths of its nature, and serially actualize themselves without any feeling of external compulsion. Thus the organic wholeness of duration does not mean that

full.fledged events are lying as it were, in the .womb of Reality, and drop one by one like the grains of sand from the hour.glass." (Iqbal.2006:40)

گویا انسانی خودی بھی جس حرکت سے عبارت ہے وہ دورانِ محض ہی ہے۔

"Yet in the single momentary mental act of perception you hold together a frequency of wave motion which is practically incalculable. That is how the mental act transforms sucessionn into duration. The appeciative self, then, is more or less corrective of the efficient self, inasmuch as it synthesizes all the 'heres' and 'now' the small changes of space and time, indispensable to the efficient self. into the coherent wholeness of personality.

(Iqbal.2006: 39)

اس طرح انسان کے لیے زمانِ الٰہیہ کے معانی کو اپنے اندر دریافت کرنا ممکن قرار پاتا ہے

در طلسم من اسیر است ایں جہاں　　از دمم ہر لحظہ پیواست ایں جہاں

لی مع اللہ ہر کہ را در دل نشست　　آں جوانمردی طلسم من شکست

گر تو خواہی من نباشم درمیاں　　لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

(اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۶۱۴) ----

لیکن جب زندگی کا جائزہ صرف عقل یا سائنس کے حوالے سے لیا جائے تو وہ محدود اور جبر کی قیدی محسوس ہوتی ہے۔ یہ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس جبر سے آزاد اور ظاہری میکانیکیت سے ماوراء ہے۔

"Life with its intense feeling of spontaneity constitutes a centre of indetermination, and thus falls outside the domain of necessity. Hence science cannot comprehend life."(Iaqbal, 2006:40-41)

لہٰذا یہ کہنا کہ انسانی خودی کی فعالیت یا انسانی تاریخ کے اعمال کسی جبری میکانیکیت کا نتیجہ ہیں درست نہیں۔

"All is already given somewhere in eternity the temporal order of event is nothing more than a mere imitation of the eternal mould. such a view is hardly distinguishable from mechanism which we have already rejected. '' (Iqbal, 2006: 43)

خودی کی حقیقت سے عدم آگہی اور دوری کے باعث پیدا ہونے والے جبر اور میکانیکیت کے اثرات سے نکلنے کی سبیل خودی میں موجود حرکت، تخلیق اور ارتقا کے امکانات و مرتب کا عرفان۔

"The universe which seems to us to be a collection of things is not a solid stuff occupying a void. It is not a thing but an act." (Iqbal, 2006: 41)

اور ان کے عینِ وجود ہونے کا وجدانی ایقان ہے۔(Iqbal, 2006:113)

اور یہ وجدانی ایقان اس تصور کے فہم کے بعد ہی ممکن ہے کہ:

زندگی از دہر و دہر از زندگی ست　　لا تسبو الدھر فرمانِ نبیؐ ست

---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۱۲۔ ۷۲)

زندگی سے زماں کی اسی قربت کے تصور نے ہی مسلمانوں میں تاریخ کا وہ شعور پیدا کیا جس کی نظیر اس سے قبل انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بقول اقبالؒ:

''میرا مقصود یہ کہنا ہے کہ اسلامی ثقافت نے جس سمت میں سفر کیا اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بات صاف طور پر کھل جاتی ہے کہ صرف ایک مسلمان ہی تاریخ کے ایک مسلسل اور کلی حرکت ہونے کا نظریہ اختیار کر سکتا تھا جو زماں کے اندر ایک ناگزیر نشوو ارتقا پر مشتمل ہے۔ تاریخ کے اس تصور میں دلچسپی کا نکتہ وہ انداز ہے جس میں ابن خلدون تبدیلی کے عمل کو سمجھتا ہے۔ اس کا تصور بے حد اہم ہے کیونکہ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ تاریخ، زماں میں

ایک مسلسل حرکت کی حیثیت سے حقیقی طور پر ایک تخلیقی حرکت ہے۔ وہ ایسی حرکت نہیں جس کی راہ پہلے سے متعین ہوتی ہے" (اقبالؒ:۲۔۱۷۳۔۱۷۳:۲۰۰۶ء)

تاریخ کے ایک مسلسل تخلیقی حرکت ہونے اور اس تخلیقی حرکت میں خودی کے زندہ کردار کے عرفان اور وجدانی ایقان سے زندگی اس آزادانہ تخلیقی ارادے سے بہرہ ور ہوگی جو زماں پر خودی کے غلبے اور تصرف کی اس الوہی نعمت کی عطا اور اظہار کا باعث بنے گا جو خودی کا ایک امتیازی وصف اور کائنات پر اس کے برتر ہونے کی علامت ہے۔ (اقبالؒ:۷۔۱۰: ۲۰۰۶ء)

زماں پر خودی کو یہ تصرف حاصل ہونے سے ہی خودی حرکت وتغیر کی کائناتی رو پر غالب آسکتی ہے یعنی وہ اپنے مصدر میں جو ربانی خودی ہے کارفرما ذات سے لے کے صفات تک اور صفات سے لے کے فعل تک موجود حرکت کی موجودگی اپنی ذات میں محسوس کرنے لگے اور یہی فنا سے بقا کی طرف خودی کی پیش قدمی کا پہلا مرحلہ ہے:

"A critical interpretation of the sequence of time as revealed in ourselves has led us to a notion of the Ultimate Reality as pure duration in which thought, life, and purpose interpenetrate to form an organic unity. We cannot conceive this unity except as the unity of a self, an all. embracing concrete self. the ultimate source of all individual life and thought.

(Iqbal,2006: 44)

یہ پہلو اقبالؒ کی فکر کا وہ نقطہ ہے جہاں وہ دیگر فلسفیوں اور مفکرین سے اٹھ کر حقیقتِ زماں کو صرف ایک علمی مبحث تک محدود رکھنے کی بجائے اسے انسانی خودی کے پوشیدہ امکانات کے اظہار سے ہم آہنگ کرنے کے مرحلے تک لے آتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنے فلسفہ وشعر دونوں کو

وسیلہ بناتے ہیں۔ یہی امتیاز اقبالؒ کو حقیقتِ زماں کی تفہیم کے باب میں ایک نمایاں مرتبہ عطا کرتا ہے۔ یہ سوال کہ خودی زماں کے تغیر و حرکت پر غالب و متصرف کس طرح ہو؟ اس کا جواب دیتے ہوئے جاوید نامہ میں علامہ فرماتے ہیں:

گر تو خواہی من نہ باشم درمیاں ---- لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

(اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۶۱۴)

یہاں اقبالؒ اپنے تصورِ زماں کو شعر اور فلسفہ سے گزارتے ہوئے اس اعلیٰ تصرف کے دائرے میں لے آتے ہیں جہاں خبر کے بجائے نظر، آثارِ قلم کے بجائے آثارِ قدم اور عقلِ محض کے بجائے ذوق و وجدان ہی رہنما اور ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

یوں یہ تصور ایک ایسی تہذیب کی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کا مقصود کائنات میں نائب خدا کے طور پر اس کردار کا حامل بن کر رہنا ہے جس کا ہدف کائنات کی تسخیر ہے۔

علم کے آغاز کا لازمی طور پر تعلق ٹھوس اشیاء سے ہے۔ یہ ٹھوس اشیا پر حاوی قوت اور عقلی گرفت ہے جو انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ٹھوس اشیاء سے آگے بڑھ سکے۔ جیسا کہ قرآن حکیم کا فرمان ہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۳۳: ۵۵)

اے گروہ جن و انساں اگر تم قوت رکھتے ہو تو تم آسمانوں اور زمینوں کے دائرے سے باہر نکل جاؤ۔ مگر تم بغیر "سلطان" کے ایسا نہیں کر سکتے۔ (اقبالؒ: ۲۰۰۶: ۱۰۵)

اور یہ صرف مسلم تہذیب کا ہی امتیاز ہے کہ اس کے عطا کردہ تصورات کی بدولت انسانیت توہمات کے اندھیروں سے نکلی اور آج کی جدید علمی اور سائنسی دنیا نے جنم لیا۔

(۴)

علامہ کے تصورِ زماں کی تشکیل میں معاصر سائنسی تحقیقات کے اثرات ناقابلِ انکار ہیں۔ زمان و مکاں کے بارے میں ہمارا تصور ہی زندگی کے دوسرے حقائق کی جہت اور نوعیت متعین کرتا ہے بقول اقبالؒ:

"What we call things are events in the continuity of Nature which thought spatializes and thus regards as mutually isolated for purposes of action, The universe which seems to us to be a collection of things is not a solid stuff occupying a void. It is not a thing but an act." (Iqbal, 2006: 41)

گلشن راز میں فرماتے ہیں:

فروغ دانش ما از قیاس است   قیاس ما ز تقدیر حواس است
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد   سکون و سیر و کیف و کم دگر شد
---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۵۶۲)

سہ پہلو ایں جہان چون و چند است   خرد کیف و کم او را کمند است
جہان طوسی و اقلیدس است ایں   پے عقل زمیں فرسا بس است ایں
زمانش ہم مکانش اعتباری ست   زمین و آسمانش اعتباری ست
---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۵۴۶)

اگر زمان و مکاں کو مطلق سمجھا جائے تو ماہیتِ اشیا کچھ اور ہوگی اور جب اسے اضافی سمجھا جائے تو کچھ اور:

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور   چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق   وار ہاند جذب و شوق از تحت و فوق
ایں بدن باجان ما انباز نیست   مشت خاکے مانع پرواز نیست
---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۶۱۲)

زمان ومکاں کی اضافیت کا تصور نیا نہیں بلکہ اس سے قبل مسلم دنیا میں محمود اشنوی نے اپنی کتاب "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" میں اس حقیقت پر تفصیل سے روشنی ڈالی کہ زماں کی حقیقت مستقل اور مطلق نہیں بلکہ متحرک، متغیر اور اضافی ہے۔ یہی تصور آج کی سائنسی تحقیقات نے بھی پیش کیا ہے جہاں زمان ومکاں باہم مل جاتے ہیں۔ زمان ومکاں کی باہمی قربت کا ہی اثر ہے کہ اب جدید طبعیات کائنات کی مادی کی بجائے روحانی اساس کی تفہیم کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ لہٰذا آج فلسفہ اور طبعیات کی سرحدیں مل رہی ہیں۔ دور جدید میں کئی کثیر الجہات نظریات کے آنے کے بعد زماں اور مکاں کی بجائے زمان مکان کی اصطلاح مستعمل ہو رہی ہے۔ (Storrs,1966) کیونکہ اب کائنات کی تعبیر وتشریح کے لیے ایک یا چند نہیں بلکہ کئی جہات پر مبنی تصورات کی ضرورت ہے۔ جدید نظریات (Speculative Theories)

جن میں اہم سٹرنگ تھیوری (String Theory) نے اور Causal Sets اور Loop Quantum Gravity, String Theory and Black Hole Thermodynamics ہیں، دس سے پچیس تک جہات تجویز کی ہیں۔ اسی طرح ایم تھیوری (M.Theory) نے کائنات کی تعبیر کے لیے گیارہ جہات بیان کی ہیں جن میں دس کا تعلق (Greene,1999) مکاں اور ایک کا تعلق زماں سے ہے۔ تاہم یہ امر قابل ذکر ہے کہ چار سے زیادہ جہات کی موجودگی کا اطلاق صرف ذیلی اجسام (Sub-Atomic) کی دنیا میں ہی ہو سکتا ہے۔

آئن سٹائن کے مطابق تیز ترین رفتار روشنی کی ہے یعنی 1,86,000 میل فی سیکنڈ یا 2,99,000 کلومیٹر فی سیکنڈ اور یہ رفتار مستقل ہے۔ قرآن مجید کی آیت نور کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ نے آئن سٹائن کے اس تصور کو بنیاد بنایا۔

"Personally, I think the description of God as light, in the revealed literature of Judaism, Christianity, and Islam, must now be interpreted differently. The teaching of modern physics is that the velocity of light cannot be exceeded and

is the same for all observers whatever their own system of movement. Thus, in the world of change, light is the nearest approach to the Absolute, The metaphor of light as applied to God, therefore, must, in view of modern knowledge, be taken to suggest the absoluteness of God and not His Omnipresence which easily lends itself to a pantheistic interpretation." (Iqbal, 2006:51)

مگر اب یورپی سائنسدانوں نے ذیلی ایٹمی ذرات نیوٹرینو (Neutrino) دریافت کر لیے ہیں۔ اس ذرے کی رفتار روشنی سے زیادہ ہے اس دریافت کے مضمرات بیان کرتے ہوئے جریدہ Time نے ۲۳ ستمبر ۲۰۱۱ء کو لکھا۔

"Particles that move faster than light are essentially moving back-wards in time, which could make the phrase cause and effect obsolete.

یہ انکشاف فزکس کی دو انتہائی اعلیٰ تجربہ گاہوں میں ہونے والے تجربات کے بعد سامنے آیا۔ جنیوا میں واقع یورپین سنٹر فار پریکٹیکل فزکس (CERC) کے پارٹیکل ایکسلریٹر سے نیوٹرینو کی افزائش ہوئی اور CERN سے اٹلی کی Apennine پہاڑوں میں واقع Grass Sasso Observatory تک ان ذرات کی پرواز سے ان کی رفتار کی پیمائش کی گئی۔ یہ ذرات روشنی سے ۶۰ نینو سیکنڈ پہلے پہنچے یعنی ان کی رفتار روشنی کی رفتار سے 0.0025 فیصد زیادہ تھی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس دریافت، کے اثرات آئن سٹائن کے خصوصی نظریہ اضافیت پر بہت گہرے ہوں گے اور یہ نظریہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ گو آئن سٹائن بھی زندگی بھر کوانٹم میکانیات سے متفق نہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات میں بہت سے مخفی متغیرات (Hidden Variables) ہیں جن کے باعث کوانٹم میکانیات کے دعوے درست نہیں ہو سکتے۔ اس ذیل میں اس کا یہ قول بہت معروف ہے:۔

God does not play dice with the universe.

۱۹۳۵ء میں آئن سٹائن نے اپنا ایک مضمون شائع کیا جس میں اس نے اپنا معروف ای پی آر تناقض (Einstein. Podolsky. Rosen Paradox) شائع کیا اور لکھا کہ کوانٹم میکانیات کی حقیقت لامقامی (Non. local) اور ادھوری (Incomplete) ہے جب کہ آج کوانٹم میکانیات کے باب میں ہونیوالی پیش رفت آئن سٹائن کے ان تصورات کو غلط ثابت کر رہی ہے۔ گو علامہ نے آئن سٹائن کے نظریات کو کائنات کے بارے میں نقطہ نظر اور مذہب و فلسفہ میں مشترک مسائل کی تفہیم کے حوالے سے زمان ومکاں اور علیت میں بنیادی تبدیلیوں کا پیش رو قرار دیا تھا:

"It seems as if the intellect of man is outgrowing its own most fundamental categories .... time, space, and causality. With the advance of scientific thought even our concept of intelligibility is undergoing a change. The theory of Einstein has brought a new vision of the universe and suggests new ways of looking at the problems common to both religion and philosophy. (Iqbal, 2006:6)

مگر جدید سائنسی تحقیقات اس نقطہ نظر کی نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہے۔

(۴)

علامہ ابن عربی تصور زماں کی تفصیلات جاننے کے لیے متجسس تھے۔ چونکہ علامہ کے تصور زماں کی اساس مسلم مفکرین کی فکر پر ہی استوار ہے سو یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اگر وہ ابن عربی کے تصورات زماں اور سے متعلقہ مصادر ومنابع تک رسائی پاتے تو اس کے اس تصور زماں پر کیا اثرات ہوتے؟ علامہ نے ابن عربی کے تصور زماں کی تفصیل جاننے کے لیے ۱۸ اگست ۱۹۳۳ء کو پیر مہر علی شاہ کے نام خط میں لکھا:

”جناب کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیشِ نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے۔

میں نے گذشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی" پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اب پھر ادھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔ نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں۔ جناب کے اخلاقِ کریمانہ سے بعید نہ ہوگا گر ان سوالات کا جواب ثانی مرحمت فرمایا جائے۔"

۱۔ اوّل یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زماں کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے۔

۲۔ یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کُتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں۔ اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اوّل کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں۔ (عطاء، ۱۰۱۲: ۲۲۳۔۲۲۴)

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ علامہ ابن عربی کے نام یا افکار سے بالکل ہی بے خبر نہ تھے۔ علامہ کی سوانح سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بچپن کے دوران ان کے گھر ان کے والد کی نگرانی میں حلقہ ہائے درس منعقد ہوتے تھے۔ ان حلقہ ہائے درس میں ان کے والد مختلف احباب سے مل کر شیخ اکبر کی تصانیف کا مطالعہ کرتے تھے۔ علامہ خود بیان کرتے ہیں:

"شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بدظنی نہیں بلکہ مجھے ان سے محبت ہے۔ میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور ان کی تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔ برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفل درس میں ہر روز شریک ہوتا۔ بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔ (ڈار، ۱۹۷۷: ۱۷۷)

بعد ازاں شیخ اکبر کے افکار سے علامہ کا ذاتی شغف ان کے اس مقالے سے بھی ظاہر ہے جو

انہوں نے ۱۹۰۰ء میں لکھا۔ یہ مقالہ بمبئی کے انگریزی مجلے انڈین اینٹی کیوری میں ستمبر ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ عبدالکریم جیلی کے تصور توحید مطلق سے متعلق تھا۔ اس مقالے میں علامہ نے جس طرح ابن عربی کا ذکر کیا اس سے یہ ہویدا ہے کہ وہ شیخ اکبر کو عظیم مفکر اور روحانی شخصیت سمجھتے ہیں۔ رزاقی :۱۹۷۹ء:۱۱۲)

شاید ابن عربی کے ساتھ اس فکری قربت و تعلق کے باعث ۱۹۳۳ء میں علامہ کے دورۂ اندلس کے دوران میڈرڈ یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات وفلسفہ میں علامہ کے لیکچر ''اندلس اور اسلام کی فکری کائنات'' کے صدر مجلس پروفیسر آسین نے کہا کہ علامہ اقبالؒ بعض اعتبار سے ابن عربی سے مماثلت رکھتے ہیں۔ (عطا، ۲۰۱۲: ۵۸۴)

ابن عربی کا تصور زماں ان کی دیگر کتب کے علاوہ فتوحات مکیہ میں مختلف مقامات پر موجود ہے اگر ان تمام تصورات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو ان کے تصور زماں کے ایسے خدوخال سامنے آتے ہیں جس سے زماں کے باب میں علامہ کی فکری نہج نہ صرف مماثلت رکھتی ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ علامہ ان تصورات کی روشنی میں اپنے تصور زماں کے انبساط واطلاق کو مزید واضح کرتے۔ فتوحات مکیہ کا باب ۳۹۰ حقیقت زماں سے متعلق ہے۔ اس باب کا عنوان حضرت شیخ اکبر نے یہ رکھا ہے۔

''وجودہ الا انا فلا زمان لی والا انت فلا زمان لک فانت زمانی وانا زمانک''

(ابن عربی، ۱۳۱۸اج:۵۲۹)

''زماں کا وجود محض انا (میں) ہے۔ پس میرا زمانہ صرف تجھ سے اور تیرا زمانہ مجھ سے ہے، یعنی تو میرا زمانہ اور میں تیرا زمانہ ہوں۔''

اور پھر حضرت شیخ زمان کے وجود کو کلیتاً نسبت پر مبنی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جان لے کہ زماں کا وجود (محض) نسبت سے ہے، فی العین اس کا کوئی وجود نہیں اگرچہ لوگوں نے اس کی ماہیت میں بہت کلام کیا ہے۔'' (ابن عربی:۱۳۱۸اج:۵۲۹)

گویا حضرت شیخ کے نزدیک زماں ایک ایسا ظرف ہے جس میں واقعات (ماضی، حال، مستقبل) وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ تاہم یہ ظرف متوہم ہے یعنی اس کا احساس ہماری قوت واہمہ میں ہی موجود ہے۔

''اور زمان کی حیثیت واقعات کے لیے ظرف کی سی ہے۔ ہم اسے نہ تو عقل سے نہ حس سے بلکہ اسے وہم سے معلوم کرتے ہیں، اور یہ مظروف یعنی واقعات کا ظرف متوہم ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور اس کے بارے میں ہم وہم سے ہی کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔'' (ابن عربی، ۱۴۱۸ ج: ۵۲۹)

علامہ نے ''من نباشم درمیاں'' فرما کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ارتقائے خودی کا ایک ایسا درجہ یا مرحلہ موجود ہے جہاں وہ قربت حق سے بہرہ ور ہو کر زماں کی گرفت سے آزاد ہو سکتی ہے۔ تاہم اس کے لیے سلطان درکار ہو گا۔ اس سلطان کی اساس کیا ہو گی اور خودی اسے کس طرح روبہ عمل کرے گی۔ اس باب میں حضرت شیخ کا یہ قول بڑا معنی خیز ہے:

''فبانه علی علم و عن قوّة همة'' (ابن عربی، ۱۴۱۸الف: ۳۰۱)

'بلاشبہ (سالک کی قوتِ تصرف) علم اور قوت ہمت کے باعث ہے۔'

ابن عربی کے مطابق 'ہمت' حضرت شیخ کے ہاں ایک بنیادی تصور اور سالک کی ذات کا نمایاں وصف ہے جو اسے حرکت زماں پر گرفت عطا کرتی ہے۔ (ابن عربی، ۱۴۱۸ب: ۵۱۵)

زماں کے باب میں حضرت شیخ اکبر کے افکار کا یہ اجمالی سا تذکرہ اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر علامہ حضرت شیخ کے تصور زماں سے آگاہ ہو جاتے تو لازماً اس کے اثرات قبول کرتے اور ان کے فکر کی کچھ نئی جہات بھی سامنے آتیں۔ یہ موضوع آج کے محقق کے لیے ایک نیا میدان تحقیق پیش کرتا ہے۔

(۵)

اقبالؒ کے تصورِ زماں کا مقصود تہذیبی معنویت کا حامل ہے:

۱۔ علامہ ملت اسلامیہ کو مادیت کی تنگنائیوں سے نکال کر روح کی لامتناہیت تک لانا چاہتے ہیں۔ سماجی و سیاسی جہت سے اس کا بیان علامہ کے خطبہ الہ آباد میں موجود ہے۔ یہاں علامہ کا امتیاز یہ ہے کہ جدید سائنس نے تو زماں کو مکاں میں ضم کر دیا ہے۔

"It appears to me that time regarded as a fouth dimension of space really ceases to be time"

جب کہ علامہ نے اس کے برعکس مکاں کو زماں کی ہی ایک صورت قرار دیا:

"...The instant is the more fundamental of the two: the point is inseparable from the instant as being a necessary mode of its manifestation. The point is not a thing, it is only a sort of looking at the instant." (Iqbal, 2006: 57)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"...Time is the mind of space" (Iqbal, 2006: 10)

۲۔ علامہ فرماتے ہیں کہ خودی کا کمال یہ ہے کہ وہ زمان پر گرفت حاصل کرے اور یہ صرف حقیقت مطالعہ کی قربت سے ممکن ہے:

در طلسم من اسیر است ایں جہاں — از دم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
لی مع اللہ ہر کہ را در دل نشست — آں جوانمردی طلسم من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں — لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

---- (اقبالؒ، ۱۹۸۵: ۶۱۴)

۳۔ علامہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جس رویے کو کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں وہ جبر کی بجائے

اختیار کا رویہ ہے۔ اور یہ محض خیال نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے۔ مگر اس رویے کو عملی حقیقت بنانے کے لیے سلطٰن کا حصول ضروری ہے۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں:

"It isthe Intellectual capture of and power over the concrete that makes it possible for the intellect of man to pass beyond the concrete. As the Quran says:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ O (۳۳: ۵۵)(اقبالؒ،۲۰۰۶:۱۰۵)

اے گروہ جن وانساں اگر تم قوت رکھتے ہو تم آسمانوں اور زمینوں کے دائرے سے باہر نکل جاؤ۔ مگر بغیر "سلطان" کے ایسا نہیں کر سکتے۔

۴۔ سلطٰن کا حصول اس وقت ہی ممکن ہے جب ہم خودی اور زمان و مکاں کے تعلق کا فہم حاصل کر لیں۔ اس تعلق کی نوعیت کی تفہیم خود قرآن حکیم کا مقصود بھی ہے

"The main purpose of the Quran is to awaken in man the higher consiousness of his manifold relations with God and the universe. "(Iqbal,2006: 7)

اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ مکاں کی اساس زماں اور زماں کی اساس انسانی خودی ہے۔:

جہانِ ما کہ پایانے ندارد چو ماہی در یم ایام غرق است
یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی یم ایام در یک جام غرق است

(اقبالؒ، ۱۹۸۵:۲۱۷)

خودی کے اس عرفان اور پھر زماں پر تصرف سے ہی خودی حرکت و تغیر کی کائناتی رو پر غالب آسکتی ہے۔

۵۔ الغرض اقبالؒ کا تصور زماں اس تہذیبی رویے کی تشکیل کی خشت اساس ہے جو اختیار، جذبہ عمل، نئے امکانات کی تلاش اور جہان نو کی تعمیر سے عبارت ہے۔

کتابیات

القرآن الحکیم

ابن عربی، الفتوحات المکیہ، ج ۱، داراحیا التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۱۸ھ الف

ابن عربی، الفتوحات المکیہ، ج ۲، داراحیا التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۱۸ھ ب

ابن عربی، الفتوحات المکیہ، ج ۳، داراحیا التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۱۸ھ ج

اقبالؒ، علامہ محمد، کلیات اقبالؒ (اُردو)، اقبالؒ اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء

اقبالؒ، علامہ محمد، کلیات اقبالؒ (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء

ڈار، بی اے، انوار اقبالؒ، اقبالؒ اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء

روم، مولانا، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بیت، ۱۶۰۔۱۶۴۔

عطاء اللہ، شیخ، اقبالؒ نامہ مجموعہ مکاتیب اقبالؒ، اقبالؒ اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء

ہمدانی، عین القضاۃ، غایۃ الامکان فی درایۃ المکان، مکتبہ ندیم، ۹/۲۸، ڈی، ۳۔ ناظم آباد، کراچی

Greene, Brian, The Elegant Universe, Superstrings, Hidden Dimensions, and the Quest for the Ultimate Theory, W.W. Norton & Company, February 1999.

Hospers J., An Introduction to Philosophical Analysis, Prentice Hall, Engleword Cliffs, NJ., 1967, 2nd ED.

Iqbal, Allama Muhammad, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, IICV, 2-Club Road, Lahore, 2006.

Kant, Immanuel, Critique of Pure Reason, Eng Tr by Norman Kemp Smith, Macmillan, London, 1970.

Razzaqi, Shahid Hussain, Discourses of Iqbal, Sh. Ghulam Ali & Sons, Lahore, 1979.

Savitt, Steven F., Time's Arrow Today, CUP, NY, 1995

Sherwani, Latif Ahmed, Speeches, Writings & Statements of Iqbal. Iqbal Academy Pakistan Lahore,, 2009.

Storrs McCall, A Model of the Universe: Space-Time, Probability, and Decision, Clarendon Press, 1996.

Swinburne R., Space and Time, Macmillan, London, 1968.

ڈاکٹر خلیل طوقار (استنبول یونیورسٹی۔ ترکی)

مولانا جلال الدین رومیؒ اور علامہ محمد اقبالؒ

مولانا جلال الدین رومیؒ عالم اسلام کے روحانی اور الہامی آسمان کے قطبی ستارے ہیں اور عاشقانِ حق تعالیٰ صدیوں سے پروانوں کی طرح ان کی پُرنور راہ میں مسافرت کرتے ہوئے منزل حقیقت تک رسائی حاصل کرتے آرہے ہیں اور آج بھی نہ صرف اہلِ تصوف اور مسلمان بلکہ غیر مسلم افراد بھی اُن کی دعوت کو لبیک کہہ کر ''شب عروس'' شادی کی رات یعنی اُن کے حق تعالیٰ سے وصلت کی رات قونیہ میں مجتمع ہوتے ہیں اور اُن کے خیالات سے محظوظ ہو کر الٰہی نور کے سرچشمہ سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی دعوت کھلے عام ہے عام و خاص، مسلم اور غیر مسلم سب اہلِ دل اِس دعوت میں مدعو ہیں۔ جس طرح ابوسعید ابوالخیر فرماتے ہیں (ابوسعید ابوالخیر، ص ۳):

باز آ، باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہ ناامیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ترجمہ: ''پھر مڑ کر آ، پھر مڑ کر آ، جس طرح سے بھی ہو پھر مڑ کر آ، اگر تُو کافر بھی ہے، آتش پرست یا بت پرست بھی، جو بھی ہے تُو، پھر مڑ کر آ، ہماری یہ درگاہ نامیدی کی درگاہ کبھی نہیں ہے اگر تُو نے سو مرتبہ بھی اپنی توبہ توڑ دی ہو مگر پھر بھی مڑ کر واپس آ!''

ابوسعید ابوالخیر کی مانند رومیؒ کی بھی یہی دعوت ہے اور لاکھوں عاشق اس دعوت کے منتظر ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ، جدید عہد کے ایک اور قطبی ستارے، عالم اسلام کی راہِ حق گم کردہ بھٹکتی ہوئی نئی نسلوں کے عظیم رہنما بھی مولانا جلال الدین رومیؒ کی اس دعوتِ عام کو لبیک کہنے والوں میں سے

ہیں اور صرف یہ نہیں کہ وہ اس دعوت میں شریک ہو کر فیض یاب ہوئے ہیں بلکہ وہ رومیؒ کی مجلس کے اس فیض و برکت کو دوسروں تک بھی پہنچاتے رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی مریدی کا برملا اعلان کیا ہے اور بار بار اُن کی شاعری میں رومیؒ کا اپنے مرشد ہونے کا بیان موجود ہے۔

اردو شاعری میں تقریباً چوبیس مرتبہ اور فارسی شاعری میں پچھتّر (۷۵) مرتبہ اقبالؒ کے کلام میں رومیؒ کا نام مختلف انداز میں آتا ہے اور اُنھیں کبھی پیرِ روم، کبھی مرشدِ روم، کبھی پیرِ عجم، پیرِ یزدانی کہتے ہیں لیکن زیادہ تر رومیؒ کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ علامہ کے غائبانہ مرشد ہیں اور محمد اقبالؒ اپنی شاعری میں اُن کو اپنے مرشد انتخاب کرنے کے رموز مختلف طریقوں میں مختلف جگہوں پر بار بار بیان کرتے ہیں۔ وہ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں رومیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ فارسی، ص ۸۰۳)

پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر	کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر زماہ و آفتاب	خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش	جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش
از نے آں نے نوازِ پاک زاد	باز شورے در نہادِ من فتاد

یعنی اقبالؒ فرماتے ہیں کہ پیرِ رومیؒ بلاشک وشبہ مرشدِ روشن ضمیر ہیں یعنی اُن کا دِل الٰہی نور سے روشن ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقی عشق اور الٰہی جذبہ کے کارواں کے سالار ہیں۔ اُن کی منزل اس قدر عالی اور بلند مرتبت ہے کہ اُس کے سامنے سورج اور چاند کی منزل بھی پست ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنا خیمہ چاند اور سورج سے بہت آگے ایک ایسے مقام پر لگاتے ہیں جہاں وہ کہکشاں سے رسی کا کام لیتے ہیں۔

قرآنی نور نے رومیؒ کے سینے کو منور کیا ہوا ہے اور جو بھی کرتے ہیں قرآن کی روشنی میں

کرتے ہیں۔ جس طرح رومیؒ نے خود اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے (خواجہ حمید یزدانی، شرح پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر، ص ۷)

من ز قرآں مغزہا برداشتم | استخواں پیشِ سگاں انداختم

یعنی میں نے قرآن سے مغز، یعنی قرآن کے اصل پیغام کو لیا ہے اور جو ظاہری باتیں دوسرے لوگ جنھیں قرآن کی حقیقت سمجھتے ہیں، ہڈی کی طرح کتوں کے سامنے یعنی نااہل لوگوں کے سامنے پھینک ڈالا ہے۔

پھر اقبالؒ کہتے ہیں کہ اس اور پُر نور فطرت والی شخصیت کی نَے (بانسری) کا جو نغمہ سنا ہے اُس نے ایک اور مرتبہ میرے اندر سوز و خروش پیدا کر کے مجھے جھنجھوڑ دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ، رومیؒ کے عاشق بنے ہوئے ہیں اور رومیؒ میں جو قرآنی حقیقتوں کے رموز سمجھ کر بیان کرنے کی اہلیت و صلاحیت ہے اسی وجہ سے اقبالؒ نے اُنھیں اپنا مرشد اور رہنما مانا ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ فارسی، ص ۸۲۵)

نکتہ ہا از پیرِ روم آموختم | خویش را در حرفِ او وا سوختم

یعنی میں نے مولانا رومیؒ سے بہت باریک اور گہری باتیں سیکھ لی ہیں اور اُنھیں کی ان ولولہ خیز باتوں میں اپنے آپ کو جلا دیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبالؒ مزید فرماتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ فارسی، ص ۱۹۰)

مرشدِ رومیؒ حکیمِ پاک زاد | سرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد

"بر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود | زانکہ بر خندل گماں بردند عود

یعنی مولانا رومیؒ جو پاک اور پُر نور فطرت کے مالک ہیں، اُنھوں نے قوموں کی موت اور زندگی کی حقیقت میرے سامنے فاش کی ہے۔ رومیؒ کا کہنا ہے کہ پہلے والی امتیں جو ہلاک ہو چکی

ہیں وہ پتھر کو صندل سمجھ بیٹھی تھیں یعنی راہِ حقیقت سے الگ ہو کر گم راہ ہوئی تھیں۔

جس طرح مولانا رومیؒ فرماتے ہیں (مولانا رومیؒ ، جلد دوم، ص ۱۱۲۲)

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم　　دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم

یعنی میں مرا ہوا تھا زندہ ہو گیا اور رو رہا تھا ہنسنے لگا کیونکہ مجھے عشق کی دولت ملی اور اُسی وقت سے میں خود ایک ابدی اور پائیدار دولت بن گیا ہوں۔

یوں اقبالؒ، رومیؒ کی وساطت سے عشق الٰہی سے روشناس ہوئے ہیں اور اُنھوں نے اِسی عشق میں جل کر پھر سے ایک نئی زندگی پائی ہے اور خود بھی ایک پائیدار دولت بنے ہوئے ہیں۔

اقبالؒ نے رومیؒ کی اسی خصوصیت کی بناء پر اور اُن کی رہنمائی کرنے کی اہلیت وصلاحیت کی وجہ سے رومیؒ کو معراج نبویؐ کے رہنما جبرئیلِ امیں کی مانند ایک اہم کردار سونپا ہے اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اقبالؒ کی نظر میں رومیؒ کا کیا مقام ہے۔ اقبالؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'جاوید نامہ' میں مسافر کو اپنے سفر میں لے جانے کے لیے رومیؒ کی روح کے آشکار ہوتے وقت رومیؒ کی یعنی آئیڈیل رہنما کی خصوصیات کو یوں بیان کرتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ فارسی، ص ۶۰۷)

روحِ رومیؒ پردہ ہا را بر درید　　از پسِ کہ پارۂ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب　　شیبِ او فرخندہ چوں عہدِ شباب
پیکرے روشن زنورِ سرمدی　　در سراپائش سرورِ سرمدی
برلب او سرِّ پنہانِ وجود　　بندہائے حرف وصوت از خود کشود
حرفِ او آئینہ ای آویختہ　　علم باسوزِ دروں آمیختہ

یعنی مولانا رومیؒ کی روح، جبرئیل علیہ السلام کی طرح درمیان میں موجود روحانی پردوں کو پھاڑ کر ایک پہاڑی کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اُن کا چہرہ سورج کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا تھا ایسے کہ اُن کی پیری میں بھی جوانی کی سی شگفتگی تھی یعنی وہ بوڑھا ہونے کے باوجود جوانوں کی طرح

خوبصورت اور پُر جوش تھے۔ اُن کا جسم سرمدی نور سے یعنی اللہ تعالیٰ کے نور سے منور تھا اور سر سے پاؤں تک اُن پر سرمدی نور چھایا ہوا تھا۔ اُن کے ہونٹوں پر وجود یعنی ہستی کے پنہاں راز موجود تھے اور وہ الفاظ اور آوازوں کی زنجیروں کو یکا یک کھول کر حقیقت کے اسرار کو بیان کرنے لگے۔ اُن کا بیان کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان پر سے لٹکتا ہوا حقیقت کا آئینہ ہو اور اس بیان میں علم کے ساتھ ساتھ اندرونی سوز اور آتشِ عشق بھی تھی جو اُسے اور زیادہ تاثیر بخشتی تھی۔

صرف یہ نہیں کہ اقبالؒ جاوید نامہ میں مولانا رومیؒ کو جبرائیل علیہ السلام کے مقام پر فائز کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر اُن کو ''پہلوی میں قرآن'' لکھنے والے ایک پیغمبر کے درجے کے حقدار سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنی تصنیف اسرارِ بے خودی میں لکھتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ، فارسی، ص ۹)

شب دلِ من مائلِ فریاد بود	خامشی از یار بم آباد بود
شکوہ آشوبِ غم دواں بدم	از تہی پیمانگی نالاں بدم
ایں قدر نظارہ ام بیتاب شد	بال وپر بشکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیرِ حق پرست	کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق	جرعۂ گیراز شرابِ نابِ عشق
برجگر ہنگامۂ محشر بزن	شیشہ برسر، دیدہ برنشتر بزن
خندہ راسرمایۂ صدنالہ ساز	اشکِ خونیں را جگر پرکالہ ساز

یعنی کل رات میرا دل فریاد کرنے پر مائل تھا اور میری خاموشی میں بھی ''یارب، اے اللہ!'' کی پکار گونج رہی تھی اور میرے دل میں ایک شور سا تھا۔ میں اندرونی غموں کی وجہ سے شکوہ وشکایت کر رہا تھا اور میرے پیمانۂ دل کا خالی ہونا یعنی عشقِ حقیقی سے دُور ہونا مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کی بے چینی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں میں ہمت ہی نہیں رہی اور اچانک میری آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں حق کی فطرت رکھنے والے مولانا رومیؒ نے اپنا چہرہ دکھا دیا۔ رومیؒ وہ

شخص ہیں جنھوں نے پہلوی یعنی فارسی میں قرآن لکھا ہے۔ رومیؒ نے فرمایا اے عشق کے دیوانے! عشق کی صاف اور خالص شراب سے ایک گھونٹ پی لے۔ اسی طرف سے اپنے دل وجگر میں قیامت برپا کر اور صراحی اپنے سر پر اور آنکھیں نشتر پر مار! تاکہ تیری آنکھیں کھل جائیں اور حقیقتوں کا مشاہدہ کرسکیں۔ تُو اپنی ہنسی اور خوشی سینکڑوں نالوں اور فریادوں کا سرمایا بنا اور خون کے آنسوؤں کو جگر کا ٹکڑا بنا۔

اب یہاں اقبالؒ کا مولانا رومیؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ اُنھوں نے فارسی زبان میں قرآن لکھا ہے ہرگز (نعوذ باللہ) رومیؒ کو رسول پاک محمد مصطفیؐ کی برابری پر کھڑا کرنا نہیں ہے۔ یہاں اقبالؒ یہ بتاتے ہیں کہ مولانا رومیؒ نے قرآن کی حقیقتوں کو فارسی زبان میں احسن طریقے سے بیان کیا ہے اور ایک طرح سے فارسی میں قرآن مجید کی شرح لکھی ہے۔

جبرئیل علیہ السلام کی برابری اور پہلوی قرآن کی مصنفی یہ ایسے عالی اور افضل مقامات ہیں جن کے لیے علامہ اقبالؒ نے مولانا رومیؒ کو جائز اور حقدار سمجھا ہے۔ کیونکہ مولانا رومیؒ اُن کے اپنے مرشد ہیں، رہنما ہیں اور استاد ہیں، اقبالؒ نے جو سیکھا ہے اُن ہی کے ذریعے، اُن ہی کے توسط سے سیکھا ہے اور اسی سبب سے اقبالؒ ہر مرحلے میں رومیؒ کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبالؒ فرماتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ فارسی، ص ۹۳۸)

چو رومیؒ در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرارِ جاں من

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن، او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں، من

مَیں نے رومیؒ کی پیروی کرتے ہوئے حرم میں یعنی کعبہ میں اذان دی کیونکہ عصر حاضر کے مسلمانوں نے اپنے وہم اور خام خیالات سے، اپنی غیر اسلامی عادات ورسوم کی بنیاد پر ایک ایسا اسلام ایجاد کیا ہے جس کا قرآن اور حدیث نبویؐ سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے اور یہ غلط اعتقادات کا ایجاد شدہ اسلام عالم اسلام کے ہر خطے میں یہاں تک کہ اسلام کے مرکز حرم تک پھیلا ہوا ہے۔ مَیں نے ان خام خیالات اور ظنون کے نظام کی غلطی ظاہر کرنے کے لیے برسرِ عام اذان دی یعنی

قرآنی اسلام کی حقیقتیں برملا بیان کیں جس طرح مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔ کیونکہ اُن کا زمانہ بھی عالمِ اسلام کے لیے فتنہ اور تباہی کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ جس میں مَیں جیتا ہوں، یہ بھی مسلمانوں کے لیے فتنہ اور انحطاط اور انتشار کا زمانہ ہے۔

پھر اقبالؒ فرماتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ اردو، ص ۳۳۱)

صحبتِ پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش　　　لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بہ کف

یعنی مولانا رومیؒ کی صحبت کا یہی فائدہ ہوا اور میرے سامنے اُن کی صحبت نے یہ راز فاش کیا ہے کہ اپنی جیب ☆ کا خیال رکھنے والے یعنی دنیا کے مادّی مفادات کے پیچھے پڑے ہوئے لاکھ فلسفیوں سے اپنے ہاتھ میں اپنا سر لئے یعنی بہادر اور نڈر کلیم، کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے مگر یہاں کلیم سے مراد حق بات کو کہنے سے نہ ڈرنے والا مردِ مومن ہے، بہتر ہے۔

یوں تو اقبالؒ نے خود رومیؒ کو اپنا مرشد مانا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی یہ مشورہ دیا ہے کہ مولانا رومیؒ کو اپنا رہبر ار مرشد بنائیں کیونکہ وہ راہِ حقیقت کے رہنما ہیں۔ اقبالؒ اس ضمن میں جاوید نامہ میں لکھتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ فارسی، ص ۷۹۶)

پیرِ رومیؒ را رفیقِ راہ ساز　　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومیؒ مغز را داند ز پوست　　　پائے او محکم فتد در کوئے دوست

شرحِ او کردند و او را کس ندید　　　معنیِ او چوں غزال از ما رمید

رقصِ تن از حرفِ او آموختند　　　چشم را از رقصِ جاں بر دوختند!

رقصِ تن در گردش آرد خاک را　　　رقصِ جاں برہم زند افلاک را!

☆ فاضل مقالہ نگار سے غالباً سہو ہوا ہے۔ شعر کے معنوی سیاق و سباق میں 'جیب' کے معنی گریباں پیرہن یا لباس کے ہیں۔ جیسا کہ 'سر بگریباں' ہونا غور و فکر کی کیفیت کی طرف اشارہ مراد لیا جاتا ہے اس لیے حضرت علامہ نے حکیم بمعنی مفکر و فلسفی 'سر بجیب' استعمال فرمایا ہے (ادارہ)

یعنی ان فارسی اشعار میں اقبالؒ فرماتے ہیں کہ نوجوانو! تم مردِ مومن یا مردِ کامل ہونے کے خواہشمند ہو تو اس راہِ پُر خطر میں مولانا رومیؒ کو اپنا ہمسفر بنالو اِس طرح سے اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں سوز و گداز یعنی آتشِ عشق بھڑکا دے گا۔ چونکہ مولانا رومیؒ قرآن مجید میں بیان کی گئی حقیقتوں سے بخوبی واقف ہیں اور الٰہی رموز سے باخبر ہیں اسی لیے رومیؒ کی مدد تمھارے لیے لازم و ملزوم ہے اور وہ دین کی اصل حقیقتیں یعنی مغز کیا ہے اور فروعات یعنی پوست کیا ہے احسن طریقہ سے جانتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوست کی گلی میں یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور اُن کا مقام بلند ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ لوگوں نے اُن کے کلام کی شرح کی مگر اُس کی حقیقتوں سے بیگانہ رہے اور ان حقیقتوں کو سمجھ نہیں پائے۔ اور اُن کے کلام کے معانی ہرن کی طرح ہم سے بھاگ کر دُور ہوئے۔ لوگ خود اپنی غلط فہمیوں کی بناء پر یہ سمجھ بیٹھے کہ رومیؒ رقصِ تن، جسم کے رقص کا سبق دیتے ہیں اسی لیے اُن لوگوں نے جان کے رقص سے یعنی روح اور ایمان کو جوش دلانے والے الٰہی رقص سے اپنی آنکھیں پھیر لیں، دراصل رقصِ تن زمین سے گرد و غبار اُڑانے کے علاوہ کسی بھی کام میں نہیں آتا لیکن رقصِ جاں افلاک کو حرکت میں لاتا ہے جس کا سبق مولانا رومیؒ کے کلام میں موجود ہے۔

درج بالا فارسی اشعار کی طرح اقبالؒ "رومیؒ" کے عنوان والی اردو نظم میں اہلِ نظر کو مولانا رومیؒ کی پیروی کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ۔ اردو، ص ۵۸۳)

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک   ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک!
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک !   کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک!
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک!   کہ تُو ہے نغمۂ رومیؒ سے بے نیاز اب تک!

یعنی اقبالؒ کا کہنا یہ ہے کہ تیری نیم کھلی آنکھ ابھی تک سب کچھ غلط دیکھ رہی ہے یعنی تُو حقیقتوں کو دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر ہے، اور ابھی تک تیرے لیے تیری ہستی ایک راز کی صورت ہے جس کو تُو نہیں سمجھ پاتا ہے۔

تیرا نیاز یعنی تیری دعائیں ناز کی حقیقت سے بے خبر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی نظر میں تیرا جو

مقام ہے اُس سے بالکل ناواقف ہے۔ کیونکہ ابھی تک تیری نماز قیام سے محروم ہے یعنی تجھے نماز کے دوران سجدے میں جانا آتا ہے لیکن ''قم باذن اللہ'' کا بھید تجھے معلوم ہی نہیں، کیونکہ تیری خودی کے ساز کی تاریں ڈھیلی ہو چکی ہیں اور اس کا واحد سبب مولانا رومیؒ کے نغموں سے تیری لاتعلقی ہے۔

اقبالؒ کے مطابق رومیؒ کے پیغام سے روگردانی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان حقیقی اسلام کی روح سے دُور ہوئے ہیں اور اُنھیں پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اسلام کی بلندی اور عظمت کو دنیا کو دکھانے کے لیے رومیؒ کے کلام پر دھیان دینا لازمی ہے، کیونکہ رومیؒ کے کلام میں ہر عصر اور ہر فرد کے لیے پیغام ہے۔ اس بارے میں ''یورپ سے ایک خط'' کے زیرِ عنوان نظم میں کہتے ہیں (کلیاتِ اقبالؒ، ص ۴۴۱)

یورپ سے ایک خط

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اِک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومیؒ!

تُو بھی ہے اِسی قافلۂ شوق میں اقبالؒ
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ

اِس عصر کو بھی اُس نے دیا ہے کوئی پیغام؟
کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومیؒ

جواب

کہ نباید خورد و جو ہمچو خراں
آہوانہ در ختن چر ارغواں

ہر کہ کاہ و جَو خُورد قرباں شود
ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود

معروف دانشور پروفیسر خواجہ محمد زکریا صاحب نے اِس نظم کی تشریح میں لکھا ہے:

''یورپ سے کسی نے اقبالؒ کو خط لکھ کر استفسار کیا کہ آیا مولانا رومؒ کے کلام میں عصرِ حاضر کے لیے بھی کوئی پیغام موجود ہے؟ اقبالؒ نے مثنوی معنوی میں سے دو اشعار بطور جواب تحریر کیے ہیں جو اُن کے نزدیک ہمارے زمانے کے لوگوں کے لیے رومیؒ کے پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

مکتوب نگار نے اقبالؒ کو لکھا:

''ہم لوگ روزمرہ کی زندگی کے مشاہدے میں آنے والی دنیا میں آرام سے رہنے کی خواہش میں ہیں اور جو اس کے علم کے علاوہ کسی اور چیز کے طلبگار نہیں ہیں جب کہ رومیؒ کا کلام ایک تند و تیز سمندر کی طرح ہے جو حواس کے علم سے آگے کی چیز ہے''۔

اے اقبالؒ! تم بھی عشق کے اُس قافلے کے مسافر ہو جس قافلے کے سالار رومیؒ ہیں۔ یعنی رومیؒ کی طرح تم بھی وجدان اور ماورائے حواس علم کو مانتے ہو۔ رومیؒ اس قافلے کا رہنما ہے اور تم اس قافلے میں شامل ہو۔

رومیؒ کو دنیا کے مردانِ حُر یعنی اہلِ عشق کا رہنما قرار دیا جاتا ہے۔ کیا مولانا نے عصرِ حاضر کے لوگوں کو بھی کوئی پیغام دیا ہے؟

جواب

گدھوں کی طرح گھاس اور جو نہیں کھانے چاہئیں۔ خُتن کے صحراؤں میں ہرنوں کی طرح ارغواں کے پھول چرنے چاہئیں۔ گھاس اور جَو کھا کر یعنی زندگی کے معمولات میں رہ کر تو انسان گدھے کی طرح زندگی کا بوجھ ہی اُٹھا سکتا ہے لیکن معمولات سے بلند ہو کر اُس ہرن کی طرح بن سکتا ہے جس کے پیٹ میں ارغواں کھانے سے مشک نافہ پیدا ہوتا ہے یعنی انسان غیر معمولی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے تو مردِ مومن بن سکتا ہے۔

جو کوئی گھاس اور جَو کھاتا ہے، بھیڑ بکری کی طرح مارا جاتا ہے اور جو نورِ حق کھاتا ہے، قرآن مجسم بن جاتا ہے۔

آنحضرتؐ مردِ مومن (مردِ کامل تھے) آپ کی زندگی خدا سے لو لگانے کی وجہ سے سراپا نور اور قرآنِ مجسم بن گئی اور آپ زندۂ جاوید ہو گئے لیکن جو لوگ معمولات کے مطابق زندگی بسر کرتے رہے وہ ختم ہو کر رہ گئے''۔ (خواجہ زکریا۔ ص ۳۹۰۔ ۳۹۱)

نورِ حق کو اپنے ہر عضو پر طاری کر کے سراپا نور ہونا یعنی قرآن کے پیغام کو خوب سمجھ کر اور اُس

پرعمل کر کے مردِ مومن اور مردِ کامل ہونا یہی اقبالؒ کا پیام ہے اور یہی اقبالؒ کی تلاش ہے۔ جس کا جواب مولانا رومیؒ کے کلام اور روحانی رہنمائی میں اقبالؒ کو ملا ہے۔

میرے خیال میں اقبالؒ نے اس وجہ سے بھی رومیؒ کی مریدی اختیار کی تھی کہ رومیؒ کے کلام میں ہر عصر کے لوگوں کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام تھا اور اقبالؒ ایک ایسے اسلام کے دعویدار اور خواہاں ہیں جس کا پیغام ہر آنے والے دَور اور ہر آنے والی نسل کے لیے ہمیشہ تازہ و زم ہو اور ہر ایک فرد کے لیے رہنمائی کرتا رہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اُس میں ہر دَور کے مسائل کے لیے کوئی نہ کوئی چارہ اور مشکلوں کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہے، چونکہ رومیؒ کا کلام بھی قرآنی اسلام کی ایک قسم کی تشریح ہے لہٰذا اُن کے کلام میں بھی سدا تازگی اور ہر عصر کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام موجود ہے۔

مزید برآں پیری و مرشدی، استادی و شاگردی اور شمع و پروانگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اقبالؒ نے رومیؒ کی ذات میں ملت کے سامنے ایک سیاسی مشیر کی مثال بھی پیش کی ہے۔

دراصل اقبالؒ اور رومیؒ کے تعلقات کو دیکھتا ہوں تو یہ بھی نظر آنے لگتا ہے کہ وہ یعنی علامہ محمد اقبالؒ اپنی ذات میں ہمارے سامنے ایک ایسے قائدِ ملت یا لیڈر کا ماڈل پیش کرتے ہیں جو نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ کو پس ماندگی اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر کے اپنے اصل مقام تک جس کی تفصیل و تفسیر قرآن مجید میں مختلف آیات میں بیان کی گئی ہے، پہنچائیں اور ایک آئیڈیل معاشرہ قائم کریں جسے دیکھ کر تمام خلقتِ خدا اس کی کشش میں آجائے اور اسلام کی طرف اُن میں رغبت پیدا ہو جائے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اس قائد کو اپنے علم و دانش کی وساطت سے قرآنی حقیقتوں سے روشناس کر کے صحیح راستہ دکھانے والے ایک رہبر یا مشیر کی ضرورت ہے اور جیسے کہ یہاں تک دی گئی معلومات سے آشکار ہو چکا ہوگا، اقبالؒ کی نظر میں یہ رہبر رومیؒ ہیں۔

میں یہاں اقبالؒ کی شاہکار تصنیف 'جاوید نامہ' کی طرف آنا چاہتا ہوں تا کہ اقبالؒ اور رومیؒ کے تعلقات کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے آسکے۔ جیسا کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے فرمایا، اقبالؒ کا جاوید نامہ معراج نبویؐ سے ماخوذ پلاٹ پر قائم ہے۔

''اسرارِ حقائق معراج محمدیہ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال ڈاکٹر صاحب کو ایک مدت سے تھا اور گلشنِ راز جدید کی طرح علوم حاضرہ کی روشنی میں معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا معراج نامۂ جدید لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس اثنا میں اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کی کتاب 'ڈیوائن کامیڈی' پر بعض نئی تنقیدات یورپ میں شائع ہو چکی تھیں، جن میں اِس حقیقت کو پایۂ ثبات تک پہنچایا گیا تھا کہ 'ڈیوائن کامیڈی' کے آسمانی ڈرامے کا پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر ان واقعات پر مبنی ہیں جو اسلام میں معراج محمدیہ کے متعلق بعض احادیث و روایات میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور متصوفین و ادباء کی کتابوں میں درج ہوئے۔'' (اے ایم ناز، حیاتِ اقبالؒ، ص ۲۰۹)

مولانا عبدالسلام ندوی کے اس بیان کے مطابق اقبالؒ کے 'جاوید نامہ' کا پلاٹ بھی معراج نبویؐ پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں ہمارے سامنے ملی یا قومی خودی کی معراج کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ہم اس تقریر میں قومی سے زیادہ ملی اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ اقبالؒ قوم سے زیادہ ملت اسلامیہ کا خیال رکھتے تھے اور اُس کی ترقی اور بہتری اور اتحادِ اسلامی کے خواہاں تھے۔ اُنھوں نے اپنے معراج نامہ خودی میں یہ بیان کیا کہ کس طرح ملی خودی حاصل ہو سکتی ہے۔ کس طرح اُس کی موت آجاتی ہے اور کیسے اُس کا استحکام و استقلال قائم کیا جا سکتا ہے؟ 'جاوید نامہ' میں اس قسم کے تمام سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، الغرض خودی کی معراج کیسے ہو سکتی ہے اور اُس کی بقائے حیات کیسے قائم کی جا سکتی ہے اُس کی فارمولا سازی کی گئی ہے۔

خواہ اسے ملت اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کا فارمولا کہیے خواہ علامہ اقبالؒ کی حکومت اسلامیہ کا سیاسی پروگرام یہ فارمولا جس کو علامہ اقبالؒ نے 'جاوید نامہ' میں پیش کیا ہے، چار اہم عناصر پر قائم کیا گیا ہے۔

یکم مسافر یا لیڈر۔ جس کی خودی شانِ معراج کی شایان اور لافانی زندگی کی حقدار ہو یعنی آگے چل کر سیاسی اور سماجی لیڈر شپ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

دوم رہبر یا مشیر، جو اس مسافر یا لیڈر کو اس سفر میں لے جانے اور رہبری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سوم مثبت کردار، جو مسافر کے سامنے ملی خودی کی بلندی بقائے حیات کے راز کھولتے ہوں

چہارم منفی کردار جو مسافر کو ملی خودی کی بیماری اور موت اور قوموں کی سیاسی اور اجتماعی تباہی کے اسباب پیش کرتے ہوں۔

شاعری کی ایک اصطلاح ہے جو 'سہل ممتنع' کہلاتی ہے، یعنی ایک بہت ہی مشکل اور پیچیدہ یا فلسفیانہ مطلب کو ایک ایسے آسان اور بہت ہی سہل فہم انداز میں شعر میں ڈھالنا ہے جسے پڑھنے والا پہلے یہ سوچے کہ ٹھیک ہے یہ تو بہت ہی آسان ہے میں نے سب کچھ سمجھ ہی لیا مگر پڑھنے والا اگر صاحب ادراک ہو تو کافی غور و خوض کے بعد ایک آسان شعر میں بیان کئے ہوئے مطالب کی معنوی وسعت اور فکری اور فلسفیانہ گہرائی کے دھاگے کا بس ایک ہی سرا پکڑ سکا ہے۔ جس سے مشکل لُوپوں سے بنی ہوئی نازک اور باریک کروشیا کی صرف ایک لُوپ ہی کی تفہیم ممکن ہوگی۔

واقعتاً مولانا جلال الدین رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کے تعلقات کی وسعتوں کو پرکھتے ہوئے ہم اصطلاح کی سی ایک صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اب اقبالؒ اور رومیؒ کے تعلقات اور ذہنی اور روحانی روابط کا ایک پہلو ہماری سمجھ میں آیا ہے تو ذرا اور سوچنے پر یکایک یہ دیکھتے ہیں کہ نہیں یہ بس پہلی منزل ہے اس سے بھی آگے اور منزلیں، اور مطالب اور وسعتیں ہیں۔ اس لیے اقبالؒ اور رومیؒ پر کچھ کہتے ہوئے ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جو بھی معلومات ہم پیش کرتے ہیں اُن کی ایک الگ تشریح اور کچھ جداگانہ معنی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ معنی ہمارے ذہن میں نہ آئے ہوں اور کسی دوسرے کے ذہن میں آئے ہوں گے۔ لہٰذا 'جاوید نامہ' میں اخذ کئے ہوئے نتائج کے بارے میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ یہ نتائج سو فی صد صحیح ہیں مگر یہ پہلو بھی قابل غور ہے اور یہ بھی اقبالؒ کے کلام کی ایک اور جہت ہے اور یہ بھی اقبالؒ

کے کلام کی تفہیم نو پر ہم کو اکساتی ہے۔ اقبالؒ کا کلام بھی مولانا رومیؒ کے کلام کی طرح زندہ اور ہمیشہ تازہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ ان دونوں نے بھی اپنے کلام میں آیاتِ قرآنی کے اصل مفہوم کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور بہت حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اُن کے پیغام کو آنے والی نسلوں تک پہنچانا اقبالؒ کے شیدائیوں پر فرض بنتا ہے۔ کیونکہ اقبالؒ کا ہر شعر بلکہ ہر ایک مصرع سہل ممتنع کی طرح ہے اور ایک معنی کے پیچھے سو نئے اور مختلف معانی اور پیغام چُھپے ہوئے ہیں اس لیے غور و خوض کر کے ان پیغامات کو درک کرنا اور ہر نئے عصر اور ہر نئے مسئلہ کے مطابق اُن کے کلام کی تشریح کرنا اور آنے والی نسلوں کی ضروریات اور فہم و ادراک کی وسعتوں کے مطابق اُن کو نئے مطالب سے ہمکنار کرنا بہت ضروری ہے ورنہ اقبالؒ کا کلام بھی ایک نہ ایک دن قصۂ پارینہ بن جائے گا۔ چنانچہ جس طرح رضا علی عابدی اور علی معین صاحبان اور ان کے رفقاء کا کہنا ہے میں بھی اُن کی تائید میں یہ کہتا ہوں کہ اب اقبالؒ کے کلام کی تفہیم نو کا زمانہ آ ہی گیا ہے بلکہ وقت گزر بھی رہا ہے۔

حوالہ جاتی کُتب

۱ ابوسعید ابوالخیر، سخنانِ منظومِ ابوسعید ابوالخیر، مرتبہ: سعید نفیسی، انتشارات کتابخانہ شمس، تہران ۱۳۳۴ ہجری شمسی۔

۲۔ اے ایم ناز، حیاتِ اقبالؒ، لاہور ۱۹۸۴ء

۳ خلیل طورقار، جاوید نامہ (معراج نامۂ خودی کی کردار تحلیل یا خودی کی بقائے حیات کے فارمولے کے عناصرِ تشکیلی)، سہ ماہی مجلّہ اقبالؒ، جلد ۴۹، شمارہ ۱، ۲، لاہور جنوری، ۲۰۰۲ء، ص ۴۱۔۶۴۔

۴ خواجہ حمید یزدانی

۵ شرح جاوید نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء

۶ شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء

۷ خواجہ محمد زکریا، تفہیم اقبالؒ، بزم اقبالؒ، لاہور نومبر ۲۰۰۲ء

۸ محمد اقبالؒ:

۹ کلیات اقبالؒ

۱۰ فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ستمبر ۱۹۸۱ء

۱۱ کلیات اقبالؒ۔ اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ستمبر ۱۹۸۶ء

۱۲ مولانا جلال الدین محمد بن حسین بلخی رومی، دیوان کبیر، کلیات شمس تبریزی، (نشر توفیق ح سبحانی)، اوّل، دوم، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران ۱۳۸۶ ہجری شمسی۔

۱۳ مولانا غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبالؒ۔ اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بلا تاریخ۔

۱۴ یوسف سلیم چشتی

۱۵ پیام مشرق، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، جولائی ۱۹۹۳ء

۱۶ مثنوی پس چہ باید کرد۔ مع مسافر، شرح، اعتقاد پبلشنگ، ہاؤس، نئی دہلی جنوری ۲۰۰۴ء

پروفیسر نغمہ زیدی

''اقبالؒ اور تہذیب حاضر''

تہذیبوں کی پیدائش اوران کے عروج وزوال کے اسباب اس قدر پیچیدہ ہیں کہ زمانہ حال میں فلسفۂ تاریخ کے بڑے بڑے مفکرین اسپنگلر، ٹائن بی وغیرہ متضاد نظریات پیش کرتے ہیں۔ اسپنگلر کی عالمانہ کتاب ''زوال مغرب'' میں یہی نظریہ ملتا ہے کہ ملتیں بھی نباتی یا حیوانی وجود کی طرح پیدا ہوتی ہیں اور طفولیت وشباب کے ادوار سے گزرتی ہیں اور آخر میں مرجاتی ہیں۔ اسپنگلر تاریخ میں ایک خاص قسم کے جبر کے قائل ہیں انکا کہنا ہے کہ ''ہر دور میں علوم وفنون کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ معاشرت میں جو تغیرات آتے ہیں وہ بھی لگے بندھے قوانین کے ماتحت ہوتے ہیں انتہائی تبحر علمی سے انھوں نے تمام بڑی بڑی تہذیبوں کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مغربی تہذیب نشو ونما کی تمام منازل طے کر کے اب زوال پذیر ہے۔ اور عنقریب یہ بھی اس طرح مٹ جائے گی جس طرح یونان وروما اور مصر وبابل کی تہذیبیں زوال پذیر ہوئیں۔

مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ مغربی اہل دانش کو اپنی تہذیب وتمدن کا کھوکھلا پن اور زوال نظر آرہا ہے جب کہ اہل مشرق مغربی تہذیب اور نظام فکر کو مکمل وارفع سمجھتے ہوئے اندھا دھند اپنا رہے ہیں اور امرت دھارا سمجھتے ہوئے ہر مرض کا شافی علاج تجویز کر رہے ہے۔ خاص طور پر اسلامی دنیا میں تاتاری غارت گری کے بعد علوم وفنون وتہذیب وتمدن کی ترقی رک گئی۔ مسلمانوں میں آخری بڑا مفکر ابن خلدون ہے۔ جس کا زمانہ چودھویں عیسوی صدی ہے۔ سولہویں بلکہ سترھویں صدی تک یورپ مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ مگر مسلمانوں کے زوال کا سبب ارباب سیاست رہے جنھوں نے سیاسی استبداد کے ساتھ ساتھ عوام وخواص کو جامد اور مقلد بنادیا۔ یہاں تک کے دین کو اپنے استبداد کا آلۂ کار بنایا۔ اور علمائے سُو کی کثرت نظر آنے لگی جو فتویٰ فروشی سے اقتدار میں حصہ دار بن گئے اور جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت

رکھنے والے علمائے حق ناپید ہو گئے۔ فقہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ جب کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد مغرب میں بیداری پیدا ہوئی اور انھوں نے اُندلس کے عظیم الشان تہذیب و تمدن سے کسب فیض کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ مشرقی یورپ پر ترکوں کے قبضے کے بعد سے یونانی اور رومائی علوم و فنون کے ماہرین ہجرت کر کے اطالیہ اور مغربی فرنگ میں پھیل گئے اور یونانی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم و تہذیب و تمدن نے فرنگ کی نشاۃ ثانیہ میں بھرپور اور موثر کردار ادا کیا۔ یورپ نے اس بیداری کے آغاز میں عربی کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کیے۔ ایک عرصے تک یہی ترجمے مغرب کا علمی سرمایہ تھے۔ مسلمانوں نے علوم و فنون کا مدار مشاہدے اور تجربے پر رکھا تھا اور یہ بات یونانیوں کے ہاں بھی مفقود تھی۔ مغرب کو عصرِ حاضر میں جو عروج اور ترقی حاصل ہوئی وہ زیادہ تر تجرباتی سائنس کی رہین منت ہے۔ جس کی ابتدا مسلمانوں نے کی لیکن ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد علوم کی مشعل فرنگ کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس لیے اقبالؒ کو کہنا پڑا

بُجھ کے شمع ملت بیضا پریشاں کر گئی   اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی

مغربی تہذیب و تمدن، انداز فکر اور سیاسی تصورات جنھیں مغربیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل مغرب کے مسلم معاشرے میں سرایت کرنے کا عمل ہے۔ اس اثر کی اوّلاً ذمہ داری ترکوں پر عائد ہو سکتی ہے۔ جن کی شعوری اور لاشعوری حکمت عملیوں سے دنیائے اسلام میں مغرب کے اثرات کا آغاز ہوا۔ اور مسلمان تہذیب و فکر فرنگ کے جلووں سے خیرہ ہو گئے۔ اور مسلمانوں کے تمام طبقات جنھوں نے مغربی ترقی کا کسی حد تک بھی مشاہدہ کیا وہ مغرب کی ترقی اور اس کے ذرائع آمد و رفت، مطابع، صنعتی اور زرعی مشینوں اور آرام و آسائش کی نت نئی ایجادات کو دیکھ کر مسحور ہو کر رہ گئے۔ مسلمان اپنی عظمت رفتہ کے نشے میں چور بے خبری کا شکار رہے اور ان کا یہ نشہ اس وقت ٹوٹا جب اُن کو مخالفین کے جدید نظام حرب اور سائنسی آلات کے طفیل پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں نپولین کے حملہ مصر نے مصر کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ اور مصر کو ایک نئی زندگی قومیت اور مغربیت کے احساس سے آشنا کیا۔ لبنان اور

شام میں یہ لہر اسی صورت میں آئی مسلمان ممالک میں مغربی تعلیم یافتہ عیسائی باشندوں نے سارے معاشرے کی پار بار ورکاؤ (Cross-Fertilization) میں حصّہ لیا۔ انیسویں صدی میں عیسائی مبلّغ مغربی تہذیب اور ذہنی بیداری کو جگہ جگہ پہنچانے کا وسیلہ بن گئے۔ بعد میں ایران و افغانستان میں مغربیت حکمرانوں کی ایما سے پھیلی اور دیگر ممالک میں سیاسی اور اقتصادی عوامل کے ذریعے داخل ہوئی۔ جلد ہی مغربیت اور تجدّد کی دوڑ میں لبنان اور شام ترکی و مصر سے بہت آگے نکل گئے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ نے حکمرانی سنبھالتے ہی ایران کو مغربی خطوط پر استوار کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ مصطفےٰ کمال پاشا کی پیروی میں یہ چاہتے تھے کہ ان کا ملک بھی مغربیت کو اپنا لے۔ انھوں نے نئی تہذیب کی حوصلہ افزائی کی، قدیم معاشرت ترک کر کے مغربی لباس و انداز کو اپنایا، پردۂ نسواں کی مخالفت کی اور یہ سارے اقدامات سرکاری حکام کے احکام اور ترغیب پر کیے گئے۔ ہندوستان میں صورت حال مختلف تھی۔ دنیائے اسلام میں مغربیت بڑی حد تک مدافعتی جدیدیت کے توسط سے داخل ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کو مغرب نے نہ صرف اپنے ہتھیاروں اور اپنے قانون کی مدد سے تاراج کیا بلکہ تقریباً دو سو سال تک اس پر حکمرانی بھی کی۔ ہندوستان نے مغرب سے ارادی و غیر ارادی طور پر بہت کچھ سیکھا۔

انگریزوں کی حکمرانی کے نتیجے میں مغربیت مختلف پہلوؤں سمیت ہندوستانیوں کی روح میں سرایت کر گئی۔ سرایت کا یہ عمل اٹھارویں صدی کے ربع آخر سے شروع ہوا۔ مغربی تہذیب کے جس پہلو نے گہرا اثر ڈالا وہ اس کے مادی اور صنعتی وسائل تھے۔ جدید اسلحہ جنگ جو مغرب کا سب سے بڑا تحفہ تھا۔ پھر دخانی کشتیاں اور بعد میں ریل، تار برقی اور گیس کی روشنی نے بے انتہا مقبولیت حاصل کر لی۔

انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں برطانوی حکومت نے خوب سوچ سمجھ کر ہندوستان کے روایتی اسلامی اور ہندو تعلیمی نظاموں کو انگریزی نظام تعلیم سے بدل کر ہندوستانی ذہن کا ایک

دروازہ مغرب کی طرف کھول دیا۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے معاشرتی تصورات، پارلیمانی، دستوری نظام حکومت اور قوم پرستی کے نظریات سے روشناس کرایا۔ ایسے نازک حالات اور پیچیدہ نفسیاتی کیفیت میں دو قسم کے تصورات اور ان کی حامل قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ایک تصور کے علم بردار روایت اور ماضی کے پرستار تھے۔ اور دوسرے تصور کے حامی جدید مکتب خیال اور جدید تعلیم کے دلدادہ تھے۔ روایات اور ماضی کے علم برداروں نے کوشش کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے بچے کھچے آثار کا تحفظ کیا جائے۔ اور ایسی نسل تیار کی جائے جو اسلامی روایات اور تہذیب کی مبلغ اور داعی بن سکے چنانچہ دیوبند اور ندوۃ العلماء کی تحریکیں اس تصور کی علم بردار بنیں۔

ادھر جدید مکتب فکر کے حامی افراد کا خیال تھا کہ مصلحت بینی اور دُور اندیشی کو کام میں لاتے ہوئے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان فاصلوں کو کم کیا جائے اور جدید تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ اس مکتب فکر کے حامیوں نے سر سید احمد خاں کی سرکردگی میں قوم کی توجہ جدید نظام فکر اور مغربی علوم کی تحصیل و ترویج کی طرف دلائی۔ انگریزی زبان اور حاکم قوم کی معاشرت و تہذیب کو اختیار کرنے اور ان کے ساتھ بے تکلف رہنے سے ان کی مرعوبیت، ان کا احساس کمتری اور احساس غلامی دُور ہو سکے گا۔ انگلستان کے سفر نے سر سید احمد خان کے ان خیالات کو مزید راسخ بنا دیا۔ سر سید احمد خان کی اس جدیدیت کی تحریک نے اگرچہ قوم کی سیاسی، تعلیمی، سماجی ادبی بیداری میں اہم کردار ادا کیا مگر مغربی تعلیم و تہذیب پر حد درجہ اصرار نے مسلم معاشرہ کے حالات اور تقاضوں سے قطع نظر اسے مغربیت کا واضح رنگ دینے میں پورا موقع فراہم کیا۔ اس طرح عام مسلمانوں کی زندگی آہستہ آہستہ مغربی تہذیب و معاشرت کا روپ اختیار کرنے لگی۔ جس کا دائرہ اثر سرکاری ملازمتوں اور انتظامی اداروں تک محدود رہا۔ اور مسلمان انگریزی زبان بولنے، مغربی لباس اور بود و باش اپنانے کو اپنی ترقی سمجھنے لگے۔

میری اس طویل تمہید کا مقصد ان حالات کا تجزیہ کرنا تھا جن میں علامہ محمد اقبالؒ نے انگریزی تہذیب وتمدن کو پرکھا اور پھر اس کی بھرپور مخالفت بھی کی۔ کیونکہ یہ استعمار کی ایک ایسی گہری سازش تھی جس نے مسلمانوں کی عظیم روایات وتہذیب کی حامل قوم کو قعرِ مذلت میں پہنچا دیا۔

ایک مغربی مصنف ریمزے میکڈانلڈ نے اس کی مثال خوب صورت مغلیہ محلات کو ٹاٹنہم کورٹ روڈ کے شکستہ سامان سے آراستہ کرنے سے دی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ہم نے انہیں صرف یہ نہیں سکھایا کہ وہ اپنی تہذیب کو حقیر سمجھ کر ترک دیں بلکہ ہم نے یہ بھی بتایا کہ خالی جگہ کو ایسی اشیاء سے پُر کریں جو آب وہوا کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ ہم نے مشرقی دماغ کو مغربی طمانیت اور ماحول دینے کی کوشش کی لیکن ہم کو پوری کامیابی اس میں ہوئی کہ دونوں میں ذہنی اور اخلاقی بدنظمی قائم کر دی۔"

علامہ اقبالؒ نے اگرچہ انگریزوں کے دَور میں آنکھ کھولی۔ اور تمام تر تعلیم بھی مغربی ہی حاصل کی۔ مگر اُن کی چشم بصیرت ہمیشہ وا رہی قیام انگلستان نے بھی اُن کی مشرقیت اور مذہب سے محبت پر اثر نہ ڈالا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ پختہ اور راسخ العقیدہ مسلمان ہو گئے۔ اور وہ قرآن و سُنت کی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ قیام یورپ کے دوران انہیں مغربی تہذیب وتمدن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر مغرب کی تہذیبی زندگی اس کے مادہ پرستانہ اور عقلیت زدہ رجحان، جمہوری، ریاکاری لادینی نظام سیاست، روحانیت سے خالی فلسفۂ تعلیم، فرد کی انانیت اور اخلاقی اقدار کی پامالی پر سخت تنقید کی ہے۔ بانگ درا کی نظم "تہذیب حاضر" میں فرماتے ہیں

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مُسلم کا تنِ خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے — یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی یہ بے باکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا — رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوس ناکی
فروغِ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی — مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلے داری	چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری

چونکہ اقبالؒ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کی بھٹی میں سے سونا بن کر نکلے تھے اور تہذیب مغرب کے گہرے مشاہدے نے اس راز کو فاش کر دیا تھا کہ اہلِ مغرب نے مشینی ایجادات اور مادی ترقیات کے بل بوتے پر ممالک اسلامیہ کو مرعوب و محکوم بنا رکھا ہے۔ اہلِ مغرب نے یورپ کی بعض مشرقی ریاستوں کو مسلمانوں سے زبردستی چھین لیا۔ اور ایران ترکی و فلسطین کی گردنوں پر چھری رکھ دی کیونکہ کمزور اقوام کو غلام بنانا اور لوٹنا اس تہذیب کا شیوہ ہے۔ مغرب نے اپنی تمام تر عقل عالمِ محسوسات پر تصرف حاصل کرنے میں صرف کی لیکن دماغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ دِل بے نور ہوتا گیا۔ یہ بظاہر حسین تہذیب عالم روحانی کی منکر اور الحاد کی طرف مائل ہے اس کی ظاہری ترقی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن اس میں حقیقی انسانیت کا جوہر ماند پڑ گیا ہے۔ اس قسم کی تہذیب کی نقالی سے مشرق کو کیا فائدہ پہنچے گا جو ظاہر پرست ہے اور جس کے اندر باطن کی پرورش نہیں ہوتی۔

اقبالؒ نے اقوام مشرق کو اور ممالک اسلامیہ کو مغربی تمدن و تہذیب کی لعنتوں سے پوری طرح آگاہ کیا ہے اور انھیں یقین دِلایا ہے کہ مغربی تہذیب اپنے ہاتھوں خود اپنا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اور بہت جلد اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ روحانی قدروں اور دینی شائر کو یکسر نظر انداز کر کے تہذیب کے نام سے مغرب نے ایک ایسی آگ کو جنم دیا ہے جس میں وہ خود بھسم ہونے والا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ جب وہ خود اپنے کیے پر آپ پچھتائے گا مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب	کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید	ضمیر پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی	یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو	ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا	جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

یورپ کے سرمایہ دارانہ تمدن میں کسب زر کو ہی زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ ماڈی زندگی کی قدر و قیمت اس قدر بڑھ جانے کے باعث بے مروتی اور سنگ دلی کو فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ انسان اعتدال، توازن اور ہم آہنگی سے محروم ہو گیا۔ سائنسی ترقی نے مغرب کو ماڈی حیثیت سے غیر معمولی طاقت بخش دی اور اسے ظاہری شان و شوکت سے مالا مال کر دیا۔ مگر یہ سائنسی علوم و فنون انسان کو حقیقی راحت، آسودگی اور آرام بخشنے کے بجائے اس کی تباہی کا ذریعہ بن گئے۔ جدید یورپین تہذیب میں روحانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا۔ اور اس کو اس بات کا احساس باقی نہ رہا کہ آخر عمل کی یہ ساری مجنونانہ تگ و دو کس لیے ہے؟ کیا یہ مقصود بالذات ہے کیا زندگی کا مقصد افادہ اور لذت حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ بہتری صرف مادی نہیں ہوتی بلکہ اخلاقی و روحانی بھی ہوتی ہے۔ جب تک انسان کے اخلاق بلند نہ ہوں اس وقت تک باوجود خوش حالی کے ان کی زندگی پست رہے گی۔ ویسی ہی پست اور بے مدعا جیسے حیوانوں کی زندگی۔ کیونکہ اگر زندگی علم، محبت و عقیدت سے عاری ہو اور اس کا مقصد خدمت انسانی کا جذبہ نہ ہو تو وہ بجائے نعمت کے لعنت بن سکتی ہے۔ مغرب میں اخلاقی اور روحانی اقدار سے روگردانی اُن کی تہذیب کا زوال بن گئی۔ عورت کو بے محابا آزادی مل گئی۔ عریانی، مے خواری، سُود خوری اور اخلاقی پستی نے جنم لیا۔ گھریلو نظام انتشار کا شکار ہو گیا اور معاشرے میں فساد برپا ہو گیا۔ اور یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی نظر آنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ جدید سائنس نے آدمی کو فطرت کی غلامی سے بڑی حد تک آزاد کرایا لیکن وہ اس کو خود اس کے نفس کی غلامی سے آزاد نہ کرا سکی۔ جو بہت بڑی غلامی ہے۔

اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ خالص مادیت اور نفس پرستی کی بنیادوں پر کسی تہذیب کو استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔ اپنے اشعار میں وہ مغربی تہذیب پر سخت تنقید کرتے ہیں:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم، یہ حکمت یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مادیت کی اس شدید مذمت کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اقبالؒ مادی ترقی کے سرے سے مخالف ہیں۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''اقبالؒ مادّی ترقی کے مخالف نہ تھے۔ اس معاملے میں اُن کی صریح رائے یہ تھی کہ انسان کو مغرب کی طرح مادّے کے سامنے سر نہ جھکانا چاہیے۔ اور نہ ہی بعض ترک دنیا کے طالب علموں کی طرح مادّے سے انکار کرنا چاہیے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ مسلمان اسلام کی اُس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے''۔

اقبالؒ پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے جواب میں کہتے ہیں۔

''اسلام کی روح مادّے کے قُرب سے نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمھارا دنیا میں حصّہ ہے۔ اس کو نہ بھولو''۔ (موج کوثر)

اقبالؒ کے نزدیک مغربی تہذیب کی دوسری بڑی خامی یہ ہے کہ اس کی بنیاد میں عقل پرستی کا خمیر ہے۔ جدید تمدن، انسانی افعال و افکار کو عقل کے علاوہ کسی اور کسوٹی پر پرکھنے کے لیے تیار نہیں۔ جب کہ اقبالؒ کے خیال میں عقل کے پاس حقیقت تک پہنچنے کا کوئی موزوں پیمانہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا دار و مدار محض حواس پر ہے اور حواس اکثر اوقات حقیقت کے ادراک میں ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ اس ناموزوں پیمانے سے حاصل شدہ نتائج ہمارے لیے حتمی نہیں ہو سکتے۔ اقبالؒ اس طرزِ فکر کے بھرپور نقاد ہیں۔ عقل یقیناً انسان کا بیش قیمت جوہر ہے۔ مگر اس رہوار کی باگیں عشق کے ہاتھ میں ہوں تب ہی یہ سیدھے راستے پر رہتا ہے۔ اس لیے زندگی کے ارتقا کے لیے اخلاقی

پابندیاں اور روحانی رہبری بھی ضروری ہے۔ ورنہ صرف عقل سوائے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ مغرب کے سارے فلسفی عقل پرستی کا شکار نہ ہوں تو بھی اُن کی غالب اکثریت اس کی حامی ہے۔ اس لیے یہی یورپ کا نمائندہ طرزِ فکر ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے چراغِ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

مغربی تہذیب کی طرح مغربی تعلیم بھی اقبالؒ کی شدید تنقید کا نشانہ بنی۔ اگرچہ وہ خود مغربی تعلیم کے پروردہ تھے۔ مگر اُن کی بچپن کی تعلیم نے انھیں تعلیمی نقائص سے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ وہ اپنے عمیق مطالعے کے باعث مغربی افکار اور ان کی کمزوریوں پر گہری نظر رکھنے کے قابل ہو گئے۔ اقبالؒ کے خیال میں مغربی تعلیم انسان کو دہریت اور مادیت کے قریب اور اخلاق و مروت سے دُور کر دیتی ہے۔ مغربی تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچل دیا ہے۔ اور انھیں مردانِ کار بنانے کے بجائے مردِ بیمار بنا دیا ہے۔ خود غرضی، نفسا نفسی، لادینی، بے مقصدیت، احساسِ کمتری، اور گمراہ کن نظریات جدید تعلیم کا خاصہ ہیں۔ مغربی تعلیم انسان کو منکسر المزاج اور متواضع بنانے کے بجائے مغرور و متکبر اور نفس پرست بنا دیتی ہے۔ مغربی نظامِ تعلیم مسلمان قوم کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ کیونکہ ہر قوم کا نظامِ تعلیم قومی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر مرتب کیا جانا چاہیے۔ اقبالؒ کے نزدیک مسلمان قوم کو اپنی ترجیحات کو سامنے رکھ کر نظامِ تعلیم کو منظم کرنا چاہیے۔ کیونکہ مغربی تہذیب میں خاص طور پر عورت کو بے لگام آزادی دے دی گئی ہے۔ اور اُسے جذبۂ اموقیت سے بے گانہ کر دیا ہے۔ عورت اُس فرض سے جان چُرانے لگی ہے جو نئی نسل کی تخلیق اور تعلیم و تربیت کی صورت میں قدرت نے اس کے سپرد کر رکھا ہے۔ مغربی تہذیب میں فرد کا رشتہ گھر سے ٹوٹ چکا ہے۔

یوں گھر جو زندگی کی اکائی ہے۔ مستقبل کے انسان کی ذہنی، جسمانی، نفسیاتی، اور اخلاقی تعلیم میں وہ کردار ادا نہیں کر رہا جو نسلِ انسانی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یوں ماں کا کردار بھی اب

قابل اعتماد نہیں رہا۔ اور انسانوں کی بڑی تعداد اخلاق و کردار سے عاری نظر آتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم   کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم   ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ اُمومت   ہے حضرت انساں کے لیے اسکا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن   کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی   لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن   پُر کار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں   لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے   مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں   چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

اقبالؒ کے نزدیک تہذیب حاضر نے جھوٹے معبودوں کا خاتمہ تو کیا ہے کیونکہ نفی کا یہ پہلو ضروری تھا لیکن اس کے بعد اثبات حقیقت کی طرف اس کا قدم نہ اٹھ سکا۔ اس لیے اب یورپ میں بھی اس کے خلاف واویلا ہو رہا ہے اشتراکیت نے مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جو بغاوت کی اس کے وجوہ زیادہ تر وہی ہیں جن سے اقبالؒ بھی متفق ہے۔ نظم "لینن خدا کے حضور میں"

اقبالؒ نے شکوہ کیا ہے مغرب میں سودی نظام ہے۔ ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے۔ بنکوں کی عمارات گرجوں سے بڑھ کر ہیں۔ مشینوں کی حکومت دِل کے لیے موت ہے۔ چہروں پر غازے کی سُرخی ہے۔ اور بندہ مزدور کے اوقات بہت تلخ ہیں۔ سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑا لیا صناعوں کی انفرادی جدت اور صناعی ختم ہوگئی۔ اب کمزور اقوام پر ہر قسم کی یورش تجارت سے نفع اندوزی کی خاطر ہو رہی ہے۔ اُن کے وسائل پر غاصبانہ قبضہ جمایا جا رہا ہے۔ خود سرمایہ داروں میں گلا کاٹ مقابلہ اور مسابقت شروع ہوگئی ہے۔ دین کی ایک تخریبی اور جامد صورت کو مغرب نے عین دین سمجھ لیا ہے۔ علم کی روشنی میں جب وہ عقائد باطل ثابت ہوئے تو سائنس کی پیدا کردہ تہذیب نے دین سے ہی منہ پھیر لیا۔ حکومتیں غیر دینی اور سیکولر ہوگئیں مذہب کے بودا ہونے کی وجہ سے مغرب ظاہر کی روشنی کے باوجود باطن کو منور نہ کر سکا۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

اقبالؒ کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
تُرکان جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر — بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

مغرب کے خلاف اقبالؒ نے اس قدر تسلسل سے لکھا۔ کہ بادیٔ نظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؒ بڑے مشرق پرست، جامد مولوی، رجعت پسند اور دقیانوسی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اہلِ مشرق کے جمود، جہالت، دین نما بے دینی، غفلت و بے حسی سے بھی اتنے ہی بیزار تھے جتنا مغرب کی تہذیب سے۔ اقبالؒ کو یہ ملال تھا کہ جو علم و حکمت ان کے آبا و اجداد سے منسوب تھی وہ اب یورپ کی ملکیت ہے۔ اگرچہ اقبالؒ کے ذہنی ارتقا پر مغرب کے اثرات نمایاں ہیں۔ مغربی علم و حکمت کے وہ کہیں کہیں معترف بھی نظر آتے ہیں اور متعدد مغربی مفکرین کے خیالات سے انھوں نے استفادہ بھی کیا ہے۔ انھیں اعتراف تھا کہ ہیگل، گوئٹے اور ورڈز ورتھ سے انھوں نے

بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے ایشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں ان کی رہنمائی کی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ بیدل اور غالب نے انھیں یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمونے کے باوجود اپنے جذبہ اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھیں۔ اُن کے خیال میں مغربی علم وحکمت اور علوم وفنون کا سلسلہ مسلمانوں سے جا ملتا ہے۔ اس اعتبار سے مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان مغرب کے صحت مندر جحانات کو قبول کریں اور اپنی فرسودہ خیالی کو ترک کر دیں۔ اقبالؒ تہذیب وفکر مغرب کے مثبت پہلوؤں اور نیک اثرات کے قائل تھے۔ فرماتے ہیں

قوت مغرب نہ از چنگ ورباب نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
قوت افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است

اقبالؒ مغرب سے یہ نہیں چاہتے کہ، علم وہنر میں اپنی تمام تر ترقیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا کر کسی قدیم روش پر آجائے۔ جب کہ انسان مظاہر فطرت اور اس کی قوتوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ فطرت کے جبر پر قابو پا کر خودی کی استواری اس کے کلام کا اہم عنصر ہے۔ کیونکہ قرآن مظاہر قدرت کے مسلسل مطالعے اور اس کی کثرت کو ایک وحدت کی طرف راجع کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اقبالؒ کی خواہش یہ تھی کہ علمِ وفن یورپ سے حاصل کرو لیکن روحانیات اور اخلاقیات کا جو سرمایہ تم کو اسلام نے عطا کیا ہے۔ اس بیش بہا وراثت کی قدر کرو۔ تاکہ تم شرق و غرب دونوں سے افضل اور مکمل تہذیب وتمدن پیدا کر سکو۔ حقیقی ترقی کی تعمیر اور صالح معاشرت اسلام کی بنیادوں پر ہی ہو سکتی ہے۔ محض تہذیب مغرب کی اندھادھند تقلید میں مسلمان روح حیات سے بے گانہ نہ ہو جائیں۔ بلکہ علم تو مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے۔ فرنگ میں ہو یا چین میں مسلمان کو بے تابانہ اُس کی طرف لپکنا چاہیے۔ خُدا نے جس حکمت کو خیر کثیر کہا ہے اس میں ظاہر اور باطن دونوں کا عرفان شامل ہے۔ اقبالؒ کو یہ یقین بھی ہے کہ کوئی اگر خود شناس ہو تو مغربی تہذیب اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہو سکتی وہ اسکے مفید پہلوؤں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر افسوس کا مقام

ہے کہ ہم مغربی تعلیم وتمدن کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے محض، زور اور خام پہلوؤں کو اپنا رہے ہیں۔ عیاشی اور تفریح طبع کی خاطر شراب خوری، جوا بازی، عریانیت اور بے لگام آزادی جیسی قبیح عادات کو پختہ کر رہے ہیں۔

اقبالؒ نے مسلمانوں کی نفسیات کا اندازہ لگانے کے بعد انھیں سختی سے اپنے مذہب وروایات کا پابند بنانا چاہا۔ تا کہ تہذیب نو کی دلکشی اور ظاہری حُسن مسلمان نوجوانوں کو گمراہ نہ کر سکے۔ اپنی تہذیب کی کمزوریوں کا خود یورپ کو بھی احساس ہو چلا ہے۔ اور وہ اپنے مادی نظامِ فکر سے ہٹ کر روحانی بالیدگی کے لیے بھی اقدامات کر رہے ہیں۔ مگر اقبالؒ کو یقین ہے کہ ان کی تہذیب کی بنیاد کھوکھلی ہے۔ اور اگر چہ اپنی عمر دتاریخ کے لحاظ سے جواں سال ونوعمر ہے۔ لیکن زیادہ عرصے تک باقی نہ رہ سکے گی۔ ان کے خیال میں مغربی تہذیب کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ خود اس پر عمل کرنے والے اس کے مقتضیات کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ جو تہذیب خود اپنی موت آپ مر رہی ہو وہ اقوام مشرق کو کیوں کر زندگی دے سکتی ہے؟ اس لیے مسلمان قوم خصوصاً اور اقوام مشرق ہرگز مغربی تہذیب وتمدن کی مکمل نقالی نہ کریں۔ بلکہ اسلامی تہذیب کو اپنائیں۔ تا کہ اقوام عالم میں ان کا تشخص اور وقار برقرار رہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اُن کی فکری ترجمانی کر رہے ہیں۔

وہ فکر گستاخ جس نے عُریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

محمد طارق غازی (ایسٹ یارک۔ کینڈا)

عاد: تہذیب اور تباہی

(قدیم تہذیبوں کی تاریخ پر زیر تحریر کتاب کا ایک جزو)

قوم عاد کو مٹے ہوئے ہزاروں سال بیت گئے مگر ان کی ایک میراث آج بھی زندہ ہے موجودہ تہذیب کی ایک عام خوش فہمی ہے کہ اس سے زیادہ ترقی یافتہ زمانہ دنیا میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور ہم سے بہتر و برتر کوئی نہیں ہے ہم سب سے افضل ہیں اپنے بارے میں قوم عاد کا بھی یہی خیال تھا مَن اَشَدُّ مِنّا قُوَّۃً (فصلت ۱۵:۴۱)= ہم سے زیادہ طاقتور بھلا کون ہے۔ ! ترقی یافتہ قوموں کی یہ خوش گمانی انسان کا واحد تہذیبی ورثہ ہے۔

دنیا میں تہذیب کے بانی تو حضرت آدم علیہ السلام تھے مفسرین کی روایات کے مطابق ان کی سب سے اہم ایجاد پہیہ تھا انہوں نے لوہا دریافت کیا ہل بنایا سوت کاتنے کا تکلا اور کپڑا بننے کا کرگھا بنایا کاشتکاری کا آغاز کیا گندم اور کپاس پیدا کی کپاس سے حضرت حوا نے سوت کاتا اور حضرت آدمؑ نے کپڑا بنا اور یوں جامۂ احرام کو دنیا میں انسان کا پہلا مہذب لباس قرار دیا۔ حضرت آدم کی ساتویں نسل میں دوسری انسانی تہذیب کے دوران حضرت ادریس علیہ السلام کی سب سے اہم ایجاد قلم تھا انہوں نے الفبا ایجاد کی روشنائی اور دوات بنائی اور تحریری زبان ایجاد کی علم الحساب اور علم فلکیات میں تحقیقات اور ایجادیں کیں مفسرین نے ان کی اور ایجادات کا ذکر بھی کیا ہے دنیا کی تیسری تہذیب حضرت نوح کی قوم نے مرتب کی تھی وہ جہاز ساز اور جہاز راں تاجر قوم تھی اسی میدان میں سفینہ نوح کی تعمیر حضرت نوحؑ کا معجزہ بھی تھا اور ایک جلیل القدر رسول کے علم و فن کا کمال بھی ان کی قوم مکمل طور پر تباہ ہو جانے والی دنیا کی پہلی تہذیب تھی قوم نوح کے خاتمہ کے بعد قوم عاد میدان میں اتری

مادّیات کے علوم انسان کو مبہوت اور مرعوب کر کے اسے اپنا غلام بنا لیتے ہیں اور معاصی کے ساتھ شرک یا الحاد کا دروازہ کھولتے ہیں اسی لیے ان علوم کو قانون، قانون شریعت کے تابع رکھنے کا ربانی التزام کیا گیا ہے تاکہ انسان مظاہر قدرت کے بجائے قادر مطلق پر ایمان رکھے۔ عقیدہ توحید انسان کی سب سے بڑی عمرانی ضرورت ہے کیونکہ یہ عقیدہ انسانی معاشرہ کو تباہی اور خاتمہ سے محفوظ رکھتا ہے قوم نوح کے بعد قوم عاد کو بھی یہی نکتہ سمجھانے کی کوشش کی گئی مگر ان دنوں قوموں نے مادّیت کی غلامی کے ساتھ مکمل تباہی اور دائمی خسران کے حق میں فیصلہ کیا اس زاویۂ نظر سے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت مختلف نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مکمل طور پر تباہ ہو جانے والی تاریخ عالم کی دوسری تہذیب کی بانی قوم عاد تھی اس کے معیار ترقی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا بہت دشوار ہے قوم نوح کی چند نسلوں بعد قوم عاد کا خاتمہ بھی ایسا ہی ہوا حضرت ہُود علیہ السلام کی نافرمان قوم کو نام ونشان اور تمام تر آثار کے ساتھ یوں مٹا دیا گیا کہ حیاتی مورخین کے نزدیک اس کا وجود بھی قابل ذکر نہیں رہا۔ چنانچہ تاریخ عالم اس قوم کے ذکر سے خالی ہے۔ اس قوم کا سنجیدہ ذکر صرف قرآن حکیم میں ملتا ہے جہاں حضرت ہُود کا نام الاعراف ہُود اور الشعراء میں سات مقامات پر اور عاد کا ذکر الاعراف هود، المومنون، الشعراء فصلت الاحقاف، الذاریت، القمر اور الحاقه میں نو مقامات پر آتا ہے تورات، زبور اور انجیل میں اس قوم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے شاید اس لیے کہ عاد وثمود دونوں قومیں بنی اسرائیل کی تاریخ اور دینی یادداشت سے خارج ہیں اگرچہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا نسبی عمود حضرت ہُود کے واسطے ہی سے حضرت نوحؑ اور حضرت آدمؑ تک پہنچتا ہے صحف سماوی میں قرآن حکیم ہی واحد کتاب ہے جس میں عاد کا خاصا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

تہذیبوں کی عصیاں پسندی

کتاب اللہ اور تفاسیر میں اس قوم کے بارے جو معلومات یکجا کی گئی ہیں فقط انہیں کی بنیاد پر اس قوم کی تاریخ کے کچھ تانے بانے کھینچے جا سکتے ہیں ان معلومات کے مطابق بڑے بھاری ستون

پر بنی ہوئی عمارتوں میں رہنے والی قوم عاد نے دنیا کی دوسری بڑی تہذیب کو ترقی کی انتہا پر پہنچا دیا تھا یہ قوم طوفان نوحؑ کی مومن باقیات کی اولاد میں تھی مگر چند ہی نسلوں میں اس کے سردار تکبر، ظلم، فساد اور شرک کے انہی امراض کا شکار ہو گئے جن سے بچے رہنے کے انعام میں ان کے اجداد کو حضرت نوحؑ کے ساتھ نجات دی گئی تھی۔

قوم عاد بھی تہذیبی ترقی کی اس بلندی کو پہنچی تھی جہاں اس سے پہلے اپنی اصل کو بھول بھلا کر قوم نوح نے عین طوفان سے پہلے خود کو پایا تھا اگر حیرت کی جائے تو اس پر کہ جس قوم کے سردار اپنے خود تراشیدہ خداؤں کو باپ دادا سے چلی آنے والی روایت کہنے کی حماقت کر رہے تھے ان کے پاس اتنی عقل بھی باقی نہیں رہی تھی کہ طوفان نوح کی روایت سے کچھ سبق حاصل کرتے مگر پھر یہی مادی تہذیبی ارتقاء کا خاصہ ہے کہ جہاں انسان نے مادیات میں کوئی کمال کر دکھایا وہ سب سے پہلے عقل سلیم کو رد کرنے کی سفاہت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنی جہالت کو باپ دادا سے منسوب کر کے خود کو مطمئن کرنے کی غلطی کرتا ہے۔

حضرت ہودؑ کا تعارف

امام قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۴:۲۲۵) نے قوم عاد کا نسب عاد ابن عوص ابن اِرَم ابن سام ابن نوح دیا ہے البتہ حضرت ہودؑ کے نسب کی ترتیب میں اختلاف ہے ایک روایت ہے ہود ابن عبداللہ ابن رباح ابن خلود ابن عاد ابن عوص دوسری روایت میں ابن اسحٰق نے ہود ابن شالخ ابن ارفخشد ابن سام ابن نوح بتایا ہے شیخ ابوبکر نے خلاصۃ السِیَر میں ان کا نسب ہود ابن شالخ ابن قینان ابن ارفخشد ابن سام ابن نوحؑ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام کتب انساب میں یہی نسب آیا ہے شیخ ابوبکر نے کہا کہ حضرت ہود کی والدہ کا نام مکعبہ بنت عویلم ابن سام ابنِ نوح تھا امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۴:۳۲۶۔۳۲۸) نے ان کی والدہ کا نام مرجانہ بتایا ہے ابن کلبی نے بھی یہی روایت کی ہے حضرت ہودؑ کے بارے میں امام اندلسی کا بیان ہے کہ وہ حضرت آدمؑ سے مشابہ تھے ان کا رنگ گورا تھا، بال سفید تھے، ڈاڑھی نچلے ہونٹ کے نیچے سے شروع ہوتی

تھی اور لمبی تھی وہ تاجر تھے شیخ الوبکر نے مزید لکھا ہے ہُود ان کا لقب تھا، جب کہ ان کا نام عابر، عابَر، عَیبر یا عُبیر تھا نسابین عام طور سے عابر بتاتے ہیں۔ عُمان میں حضر موت کی سرحد کے قریب اور صحرائے ربع الخالی کے کنارے پر شصر (بروزن مصر) نامی گاؤں کے پاس کھدائی میں ایک قدیم بستی دریافت ہوئی جس کا نام عُبار بتایا گیا۔ ممکن ہے بستی کا یہ نام حضرت عابر کی نسبت سے پڑا ہو، یا اس باغ کے حوالہ سے ہو جہاں تباہی کی آندھی کے وقت حضرت ہودؑ اور اہل ایمان نے پناہ لی تھی۔

امام پانی پتی (تفسیر مظہری ۴:۲۲۵) نے لکھا ہے کہ حضرت ہُودؑ شریعت نوح پر تھے اور ان کی عمر ۴۰۰ سال، یا ۴۶۰ سال ہوئی۔ تاریخ شامی میں ابن حبیب کا قول ہے کہ عمر ۱۳۴ سال ہوئی تھی، اور ابن کلبی نے ۴۶۴ سال قرار دی ہے۔

مساکن عاد کی روایات

مفسرین نے تاریخ عاد کی بہت سی تفصیلات جمع کی ہیں ان کی تحقیقات کے مطابق یہ قوم احقاف کے علاقہ میں رہتی تھی امام بغوی (معالم التنزیل ۷:۲۶۲) اور امام پانی پتی (مظہری ۱۰:۳۰۵) نے احقاف کو حقف کی جمع بتایا ہے اور کہا مستطیل خم در خم ریگستان کو احقاف کہتے ہیں اسلمؒ ابن زید نے پہاڑی نما مگر پہاڑ سے کم اونچے مستطیل ریگستان کو احقاف کہا ہے۔ کسائی نے دائروی ریگزار بتایا ہے۔ روایت ایسے ریگستان کی بھی ہے جس میں ریت کے تودے سمندر کی موجوں اور لہروں کی طرح نشیب و فراز کا نظارہ دکھاتے ہیں عاد کے مساکن حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان ربع الخالی کے مغرب میں تھے یمن کے سواحل نیز عمان اور حضر موت سے عراق تک ان کا سکہ رواں تھا جنوبی یمن میں کہیں ان کے پرانے کھنڈر موجود ہیں (مولانا محمد جمال بلند شہری/ جمالین فی شرح جلالین ۲:۸ ۳۷۸۔۳۷۹) مولانا شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی ۳:۲۷۳۔۲۷۷) نے سید سلیمان ندوی/ ارض القرآن کے اضافی حوالہ سے اسی خطہ کو عاد کا وطن بتایا ہے۔ ابن جریر طبری (جامع البیان ۱۲:۵۰۷) نے حضر موت سے عمان تک الشحر کے علاقہ میں ان کی سکونت بتائی ہے قتادہؒ کی روایت (امام اندلسی/ بحر المحیط ۸:۶۳) بھی یہی ہے کہ بحر الیمانی سے متصل بلاد شہر عاد کا

مسکن تھا تفسیر طبری ہی میں آتا ہے حضرت علیؓ نے رسول اللہ سے روایت کی ہے کہ یمن میں سرخ مٹی کا ٹیلہ جس پر گھاس ہے یا ایک درخت اگا ہوا ہے حضرت ہودؑ کی قبر ہے۔ امام آلوسی (روح المعانی ۲۶:۲۴) کی ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ نے شام کے پہاڑ کو بھی احقاف میں شمار کیا ہے سورۃ ھود (۱۱:۵۲) کی شرح میں امام اندلسی (بحر المحیط ۵:۲۳۲۔۲۳۳) اور امام طبری (جامع البیان ۳/۹:۵۱) نے شام و یمن کے درمیان ریگستان میں ساکن عاد کا ذکر کیا ہے جغرافیائی طور پر اس کا مطلب ہوا کہ عاد کا تسلط تین ریگستانوں پر محیط تھا صحرائے ربع الخالی، صحرائے نجد اور شمالی حجاز کا صحرائے نفود۔

سورۃ الاعراف کی آیت وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً (۷:۶۹) کی شرح میں علامہ عثمانی (تفسیر عثمانی ۱:۲۵۷) کا قول ہے کہ جسمانی قوت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے یہ قوم مشہور تھی امام طبری (جامع البیان ۱۲:۵۹۴) نے اس آیت کی شرح میں تین قول تحریر کیے ہیں اوّل جان جثہ میں قوم نوح سے زیادہ تھے، ثانی قوم نوح سے زیادہ طاقت ور تھے، ثالث قوم نوح کے مقابلہ میں عاد پر زیادہ انعامات کیے گئے تھے مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن ۳۳۴) نے بتایا کہ یہ لوگ بڑے قد آور اور قوی الجثہ ہوتے تھے مولانا محمد جمال بلند شہری (جمالین فی شرح جلالین ۲:۳۷۷) نے تحریر کیا ہے کہ عاد کو ڈیل ڈول میں جسامت بھی زیادہ دی یعنی قد آور بنایا اور قوت بخشی ابن کثیر نے ارم ذات العماد (الفجر ۸۹:۷) کی تفسیر کی ہے کہ جنگل میں ستونوں (عالی عمارتوں) میں رہتے تھے بلند قامت ہوتے تھے دوسرے شہروں میں ان کے مانند لوگ پیدا نہیں کیے گئے تھے بڑے قوی، طاقت ور، لانبے چوڑے قد کے ہوتے تھے، جیسے جسمانی طور پر سخت اور زوردار تھے اس طرح دلوں میں بھی سختی تھی (تفسیر ابن کثیر ۸:۲۸۸۔۲۹۰) ان بیانات کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ ان کے قد و قامت سو پچاس گز کے ہوتے تھے امام قرطبی (جامع البیان ۵/۲۰:۴۵۔۴۶) ایسے بیانات کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں عماد کا مطلب سید القوم بھی ہے اور اسلمؒ ابن زید کا کہنا ہے کہ وہ ستونوں پر قائم بلند و بالا عمارتیں بنایا کرتے تھے اور صحاح میں بھی یہی مفہوم آتا ہے کہ عماد یعنی بلند عمارتیں۔

عاد کی مادّی طاقت

امام باقرؒ کے بقول عاد کا ایک مرد ایک بڑی چٹان کو توڑ دیتا تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ (امام آلوسی/روح المعانی ۱۵۶:۸۔۱۵۷) کی روایت ہے کہ ایک شخص پتھر سے تراشا ہوا ایک کواڑ (مصراع) اٹھا لیتا تھا جسے پانچ سو آدمی نہ اٹھا سکیں ان اقوال یا آراء سے لازم نہیں آتا کہ ایک چٹان کو توڑنے کے لیے ہاتھ کی ایک ضرب کافی تھی یا وزنی پتھر اٹھانے کے لیے کسی آلہ کی ضرورت نہیں تھی خود ہمارے زمانہ میں فولادی غرنوقہ (crane) کے بلوری حجرہ میں بیٹھا ہوا ایک کمزور و لاغر شخص چند کلوں کو حرکت دے کر سیکڑوں ٹن کا وزن ادھر سے ادھر منتقل کر دیتا ہے اور بھاری چٹانوں اور سنگ و خشت اور لوہے سے بنی ہوئی عمارتوں کے ڈھانچوں کو آلات جرثقیل کی ایک ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے یہ درست ہے کہ قوم عاد کے پاس ایسے آلات کی موجودگی کی کوئی حسی یا حضری شہادت پیش نگاہ نہیں ہے مگر حسّی یا حضری شہادت کی عدم دستیابی کسی شے کی عدم موجودگی کی دلیل نہیں ہوتی تو کیا وجہ ہے کہ قوم عاد کے پاس اس قسم کے آلات کی موجودگی کا انکار کیا جائے۔ جو دلیل ان آلات کے انکار کی ہوگی وہی قوم عاد کے پاس ان آلات کی موجودگی کے حق میں جائے گی۔

وہ اہل دانش جو حسی شہادت نہ ہونے کی وجہ سے قوم عاد کو ایک قدیم پسماندہ گروہ باور کرنے پر اصرار کریں گے انہیں لازم آئے گا کہ تسلیم کریں کہ مصر میں ۱۳۹ میٹر بلند خوفو کا حرم بنانے والے لوگوں کا قد ۲۰۰ میٹر کا تھا، یا بارہویں صدی کی دہلی کے باشندے ۱۰۰ گز ے ہوتے تھے جنہوں نے ۷۳ مٹر بلند قطب مینار تعمیر کیا تھا دلچسپ بات یہ ہے کہ ان قدیم آثار کی تعمیر کے بارے میں عہد جدید کے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ مصنفین کا خیال یہی ہے کہ یہ تعمیرات سو گزے انسانوں نے یا کسی عجوبہ خلائی مخلوق نے بنائی تھیں جو اپنے عمارتی آثار چھوڑ کر اپنے سیارے میں واپس چلے گئے کبھی واپس نہ آنے کے لیے، یا اڑن طشتریوں میں آتے تو ہیں مگر انسانوں سے رابطہ کرنے سے ڈرتے یا شرماتے ہیں (Daniken Chariots of the Gods) مسلمان اہل علم کے نزدیک یہ باتیں درخور اعتناء نہیں ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حضرت انسؓ ابن مالک اور حضرت سعیدؒ ابن المسیب کی

روایات کے مطابق رسول اللہ کو ۳۰ یا ۴۰ یا ۴۵ مردوں کے برابر قوت دی گئی تھی (مصنف عبدالرزاق ۷:۴۹ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۲) اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ رسول اللہ کا قد و قامت اور جان جثہ چالیس پچاس انسانوں کے برابر تھا۔

سیر و سیاحت کی بانی قوم

موجودہ زمانہ کی مغربی یورپی اور امریکی اقوام سیر و سفر کی بڑی دلدادہ ہیں سمندروں کے کنارے، تفریح گاہوں میں، آثار قدیمہ کے لیے مشہور شہروں، پہاڑی مقامات اور برفزاروں اور برفشاروں کی سیر ان قوموں کا جزو تہذیب اور سالانہ معمول ہے ان کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے ان سیاحتوں سے عمرانی یا عبرتی نتائج اخذ کرنے سے کم لوگوں کو دلچسپی ہوتی ہے اس قسم کی سیاحت کے بانی عاد تھے تفاسیر قرآن میں ایسی روایات ملتی ہیں کہ عاد کے متمول لوگ ہر سال موسم بہار میں سیر تفریح کے لیے نکل جایا کرتے تھے امام بغوی (معالم التنزیل ۷:۲۶۲) نے کہا ہے وہ موسم بہار میں (تفریحی) سیر و سفر پر جایا کرتے تھے اور (موسم خزاں کے آغاز پر) جب سبزہ سوکھ جاتا تو گھروں کو واپس آجاتے یہی بات علامہ محمود آلوسی (روح المعانی ۳۰:۱۲۳) نے بھی بیان کی ہے صحرائے ربع الخالی کے کنارے موسم بہار بھی خوشگوار نہیں ہوتا اس موسم میں سیاحت کی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ فصل ربیع کے بعد عاد کے مالدار لوگوں کی جیبیں بھری ہوتی تھیں اور وہ دلکشا اور روح افزا مقامات پر تفریح کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے روایات کے مطابق عراق و شام ان کی تفریحی جولان گاہ تھے ممکن ہے ان کے علاوہ دیگر ممالک کا سفر بھی کرتے ہوں۔

امام اندلسی (بحر المحیط ۵:۲۳۳) نے ساعت عذاب میں ظعینہ کی تباہی کا بیان بھی کیا ہے جس سے کوچ گاہیں، سفر کے اڈے مراد ہیں چونکہ اس قوم کے اہل ثروت موسم بہار میں سیر و سیاحت کے لیے نکلتے تھے اس لیے ظعینہ (کوچ گاہ) سے اشارہ ملتا ہے کہ سفر کا کچھ عوامی یا اجتماعی قسم کا طریقہ رائج تھا اور کسی متعین مقام پر مسافروں کو سواریاں دستیاب تھیں ان سواریوں کی ہیئت پر بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن طویل سالانہ سیاحتوں کے لیے بہر حال سواریاں درکار تھیں۔ یہ

(الشعراء ۲۶:۱۲۹) یہ کثیر المعنی لفظ ہے لغات میں اس سے مراد ہے وہ مکان جہاں صناعت ہو، حوض جس میں پانی جمع کیا جائے، بڑے حوض، زیر زمین نہریں (مولانا محمد ادریس کاندھلوی / معارف القرآن ۵:۵۶۲)، قلعے جن میں پانی کے بڑے خزانے ہوں (امام بغوی / معالم التنزیل ۶:۱۲۴) بڑے محلات، عظیم عمارتیں، قصر، حصن، کنویں، قریہ وغیرہ مولانا مفتی محمد شفیع (معارف القرآن ۶:۵۳۵۔۵۳۷) نے کاریگریاں مراد لیا ہے۔

ریگزاروں میں چرازار

امام آلوسی (روح المعانی ۱۲:۸۱) نے عاد کی خوش حالی اور دنیوی عزت کے بیان میں ایک لفظ 'خصب' استعمال کیا ہے جو مال اور مویشی، بالخصوص زراعت اور غذائی پیداوار وغیرہ میں کثرت نمو اور برکت کے مفہوم کو پہنچتا ہے امام اندلسی (بحر المحیط ۷:۳۱) نے لفظ ریع (الشعراء ۲۶:۱۲۸) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عمان سے حضر موت تک کا علاقہ اُمرَ ع البلاد تھا یعنی اس میں گیاہِ سبز کی بہترین چراگاہیں بلکہ چرازار اور مویشیوں کے لیے بسیار چارہ فراہم تھا مفسرین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ عاد کے پاس کثیر تعداد میں مویشی تھے ظاہر ہے ان کو چراگاہوں کی بھی ضرورت تھی جو ریگستانی خطوں میں آسانی سے مہیا نہیں ہوتیں مگر ریگزاروں کو چرازاروں میں تبدیل کرنے کے لیے عاد کے پاس کوئی طریقہ، کوئی حکمت، کوئی سائنس تھی کہ ان کا یہ کام تاریخ میں قابل ذکر ٹھہرا مولانا محمد ادریس کاندھلوی (معارف القرآن ۴:۴۳۔۴۴) نے عاد کی دو خصوصیات بتائی ہیں ایک ان کی غیر معمولی قوت و توانائی جس کا انہیں مکمل احساس و ادراک تھا جیسا کہ قرآن حکیم میں خود قوم عاد کا قول آیا ہے کہ ہم سے زیادہ زور آور بھلا کون ہے (فُصِّلت ۴۱:۱۵)، اور دوسرے یہ کہ ان کے بلاد سرسبز و شاداب تھے اور وہ لوگ صاحب زراعت و صاحب عمارت تھے امام قرطبی (احکام القرآن ۹/۳:۵۱) اور امام اندلسی (بحر المحیط ۵:۲۳۲۔۲۳۳) نے انہیں اصحاب زروع (کھیت کیار) بساتین (باغات) و عمارات بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس قوم کو ان جائدادوں کی بڑی زبردست حرص تھی۔ یہ جائدادیں ان کی مالداری کی دلیل تھیں ریگستان کے بیچ سرسبز و شاداب خطہ جس کی زرعی اور غذائی پیداوار کی مثالی قوت ثمو ان کی دولتمندی کا ایک سبب تھی۔

نقد فصلوں کی کاشتکاری

ایک قابل توجہ اقتصادی نکتہ یہ ہے کہ کسی ملک یا قوم کی کثیر غذائی پیداوار اور نباتات کی ہریالی اسے فاقہ مستی سے تو محفوظ رکھ سکتی ہے مگر دولتمند بنانے کو کافی نہیں ہوتی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم یا ملک نقد تجارتی فصلیں پیدا کرتا ہو اور اس مقصد کے لیے وسیع و عریض مزرعوں اور باغات میں کاشت کی جارہی ہو چھوٹے کھیتوں میں چھوٹے کسان اپنے خاندان کے گزر بسر کے لیے کافی غلہ پیدا کر سکتے ہیں مگر قومی یا گروہی ثروت مندی میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے تو محض یہ جان لینا کافی نہیں کہ قوم عاد کے پاس کھیتیاں اور باغات تھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس قوم کے چودھری اور رئیس سرداروں کی ملکیت میں ایسے لمبے چوڑے مزرعے اور ایسے گھنے اور پھیلے ہوئے باغات تھے جن کی پیداوار کی اجناس اور پھل وغیرہ جھٹ پٹ نقدی میں بدل جاتے تھے تاہم ان کی دولت مندی سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اس قوم کا ہر فرد قارون وقت تھا اجناس کو فوراً نقد میں بدلنے کے لیے ایک خاص قسم کی دنیوی عقل درکار ہوتی ہے جو کسی مادیت اساس معاشرہ میں اقتصادی طور پر جابر و غاصب اور معاشرتی طور پر بے حس طبقہ پیدا کرتی ہے یہ صورت قوم عاد میں پیدا ہوئی تھی۔

ہر ثروت مند معاشرہ تین طبقات میں جیتا ہے اعلیٰ طبقہ جو بڑے کھیتوں اور باغوں یا صنعتوں، بازاروں پر قبضہ کر کے نقد اجناس پیدا کرنیوالی دنیوی عقل کی وجہ سے راست یا اپنے تنخواہ دار کارندوں کے واسطے سے سیاسی سطوت حاصل کر لیتا ہے اور پھر ایک برہمنی معاشرہ میں یہ اعلیٰ طبقہ اپنے انفرادی معاصی اور اجتماعی فساد کے حق میں مذہبی دلیل لینے کے لیے پروہتوں اور کاہنوں کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے دوسرا متوسط طبقہ ہوتا ہے جو اس طرح بننے والے سیاسی اور اقتصادی اور پروہتی نظام کو برقرار اور متحرک رکھنے میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتا ہے اور تیسرا غریب طبقہ جسے حقیر و ادنیٰ خدمات کے لیے باقی رکھنا ایک جابر و طاغی معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے نچلے دونوں طبقے اس اعلیٰ طبقہ کی دنیوی عقل کی پیداوار ہوتے ہیں کیونکہ ان دونوں طبقوں کی وجہ سے اعلیٰ طبقہ کی

سرداری باقی رہتی ہے عمرانی اعتبار سے متوسط طبقہ بھی دراصل نچلے طبقہ ہی کا حصہ ہوتا ہے بعض معاشروں میں اسے متوسط طبقہ محض اس لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ اسے حقیر وذمیم کاموں میں استعمال نہیں کیا جاتا۔

بہرحال یہ تینوں طبقے عاد کے معاشرہ میں لازماً موجود تھے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت نوح نے امداد باہمی کے اصول پر معاشرہ کو چار گروہوں میں منظم کیا تھا اہل علم، اہل سیاست، اہل معیشت اور عوام الناس ممکن ہے اس معاشرتی نظام کار کو قوم عاد کے چودھریوں نے اپنے طبقہ کے حصول مفادات کا ذریعہ بنالیا ہو اور تب سے یہ نظام انسانی معاشروں میں رائج ہو گیا یہ بھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرہ میں ان طبقات کو سب سے پہلے قوم عاد کی سیاسی عقل ہی نے ایجاد کیا ہو اسی کو دنیوی عقل کہا گیا ہے جو اپنے مزاج میں ایجادی اور اختراعی ہوتی ہے اور یہی دنیوی عقل کسی تہذیب کے عمرانی معیار کا پیمانہ ہوتی ہے یہ عقل جس قدر ایجادی ہوگی تہذیب اسی قدر مادی ہوگی، اسی قدر دولت آفریں ہوگی، اسی قدر اسباب پر تکیہ کرے گی، اسی قدر مغرور ہوگی اور اسی قدر سرکش اور ظالم ہوگی اور اسی آخری وجہ سے اپنی تباہی کو دعوت دے گی۔

معاشرہ میں تمرد اور سرکشی ہمیشہ دولت کی زیادتی کا نتیجہ ہوتی ہے غریب معاشروں میں آدمی کو ایک وقت کے کھانے کی تگ ودو ہی سے سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی کیونکہ ان لوگوں کو اپنے وجود کی اہمیت کا ادنیٰ احساس بھی نہیں ہوتا مگر یہ انسانی وجود کا منفی رخ ہے مثبت پہلو یہ ہے کہ زندگی کا مقصد سامنے ہو تو ناداری اور فقر سے انکسار وفروتنی، تواضع، رحم دلی اور مساہمت جیسے اوصاف از خود پیدا ہو جاتے ہیں دنیا کی ہر تہذیب میں یہ دونوں عمرانی عناصر اسی طرح الگ الگ دکھائی دیتے ہیں جیسے جنوبی افریقہ میں راس امید کے نیچے دو سمندروں کے پانی اور الہ آباد میں سنگم کے نیچے گنگا اور جمنا کے دھارے اپنے رنگ اور ذائقہ میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔

وَجَعَلَ بَینَ البحرین حاجزا (النمل ۲۷:۶۱)= اور دو دریاؤں کے درمیان روک بنائی۔

عاد کا معاشرتی پیمانہ

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ بے شک ایجادیں اپنے معاشرے کی ضرورتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں مگر خود ضرورتیں بھی اپنے معاشرہ کے مزاج کا عکس ہوتی ہیں۔ معاشرہ کا مزاج علمی ہوگا تو دین معرفت، فقہ، اخلاقیات، تاریخ، تحقیق اور دانش ونکتہ آفرینی کو فروغ ہوگا، معاشرہ تفریح پسند ہوگا تو کھیل کود، انحرافی مشاغل، اور ڈرامائیت تماشانویسی اور حیران کاری، قصہ نویسی، داستان گوئی، لہو ولعب اور حرص وہوا اور شہوت رانی کے سامان مہیا کیے جائیں گے معاشرہ غفلت شعار یا پندار کا شکار ہوگا تو اونچی عمارتیں بنانے اور بات بات پر یادگاریں تعمیر کرنے، مصوری، آلات موسیقی، شاعری، رقص ونغمہ، طرب گاہیں، نواخانے قائم کرنے کا فن ترقی کرے گا اور عیش و عشرت اور شادی ونشاط کے وسائل پیدا کرے گا معاشرہ تجارت اساس ہوگا تو سیاست مدن، قیام امن واماں کی ضمانت، شاہراہوں کی تعمیر اور مواصلات کی فراہمی، گزرگاہوں پر آرام گھر، صنعتوں کی کثرت، بیرونی منڈیوں کی تلاش اوران پر قبضہ کی سیاست، بیرونی تاجروں کے لیے قیام گاہیں اور تجارتی سہولیات وغیرہ مہیا کرنے پر توانائیاں لگائے گا اور اس معاملہ میں ہوس غالب ہوگی اور مال ودولت کا ہُو کا ہوگا تو بڑی فوجوں کی فراہمی، آلات جنگ صنعتیں، دنیا میں خام مال کی تلاش اور بیرونی مادی وسائل اور منڈیوں پر جارحانہ قبضہ کے اسباب مہیا کرے گا۔

دوسری طرف ہر وہ شے جسے انسان بناتا یا پیدا کرتا ہے اس سے اپنا استعمال مانگتی ہے اپنے جائز دفاع کے لیے انسان بندوق بناتا ہے تو بندوق اسے مسلسل استعمال پر اُکساتی رہتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان بے سبب جنگیں لڑتا ہے اور بڑے پیمانے پر لڑائیوں میں کشت وخون کرتا ہے اس کی قوت نہ ہو تو بستیوں میں بے وجہ قتلِ عام کرتا پھرتا ہے۔ اور اس معاملہ میں ذرا قانون پسند ہو تو تفریحاً پرندوں اور وحشی جانوروں کے شکار کے لیے نکل جاتا ہے۔

ان عمرانی پیمانوں پر قوم عاد کہاں کھڑی نظر آتی ہے۔؟

تہذیب عاد کا اجمالی نقشہ

تہذیب عاد کا ایک اجمالی نقشہ یہ ہے کہ اول وہ اصحاب زروع تھے اور وسیع وعریض کھیتوں کے علاوہ مویشیوں کے واسطے چرازار بھی رکھتے تھے؛ دوم تاجر قوم تھی جو سفر وسیاست کی دلدادہ بھی تھی؛ سوم، بڑی زبردست عمارتیں بھی بناتے تھے جن میں ستون یا اونچے برج بناتے تھے۔ اصحاب زروع کا مطلب ہے ان کے پاس کاشتکاری ہوتی تھی یہ معمولی قسم کی کاشتکاری ہوتی تو قابل تذکرہ نہ ہوتی ایک طرف ان کے بروج مشیدہ محکم عمارات' برجیوں اور عماد قصر وقلعہ کا ذکر آئے اور دوسری طرف چھوٹی موٹی کھیتی باڑی تو یہ ایسا ہی جیسے کاروں کا بیوپاری سائیکل پر دفتر جائے جیسا کہ اوپر بات ہو چکی ہے کہ اہل زراعت کی زراندوزی کی شرط نقد فصلیں ہوتی ہیں البتہ نقد فصل مقدار میں زیادہ ہو تب ہی منافع دیتی ہے اس کے لیے وسیع وعریض مزرعے لازمی ہیں اور بڑے مزرعوں میں عام ہلوں جیسے چھوٹے زرعی آلات سے کھیتی نہیں ہو سکتی اور نہ ایسی کھیتیاں تجارتی فصلیں دیتیں ہیں ہندستان میں ۱۹۰۰ء سے پہلے اسی قسم کا زمینداری نظام تھا جس نے انگریز کے دور میں ہندستان کو کوئی بہت بڑا زرعی تجارتی ملک نہیں بنا دیا تھا آزادی کے بعد اس نظام میں تبدیلی کے نتیجہ میں ہندستان زرعی تجارت کے نقشہ پر ابھر سکا تھا۔

سادہ الفاظ میں بڑے کھیتوں کے لیے ذرا مختلف قسم کے زرعی آلات درکار ہوتے ہیں قوم نوح کے بارے میں معلوم ہے کہ زرعی سائنس میں اس کی ترقی کا یہ حال تھا کہ اس کے اہل زراعت ہر ماہ دو فصلیں پیدا کرتے تھے (ابو حیان اندلسی/بحر المحیط ۸:۳۳۴) اگرچہ عاد کے سلسلہ میں ایسی کوئی روایت سامنے نہیں آتی لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کچھ ایسے آلات ضرور ایجاد کر لیے تھے جو وسیع وعریض مزرعوں میں کاشتکاری کے لیے ضروری ہوتے تھے اس کی ایک دلیل چرازاروں کی موجودگی ہے چرازار وکثیر تعداد مویشیوں کے ساتھ مشروط ہے اگر یہ تعداد مویشی کسانوں کے بیل تھے تو عاد کی کاشتکاری بڑا تھکا دینے والا اور قطعاً غیر اقتصادی کام ثابت ہوتا ہے۔ بصورت دیگر یہ باور کیا جائے گا یہ مویشی دودھ، گوشت اور جانوروں کی ہڈیوں اور

چمڑے کی صنعتوں کے لیے پالے جاتے تھے اور ان مویشیوں کے لیے بڑی مقدار میں چارہ اور گھاس ضروری تھا اسے خودرو گھاس پھوس پر معلق نہیں کی جا سکتا تھا اس مقصد کے لیے چارہ کا ایک عمدہ پیداواری نظام ضروری تھا چنانچہ بڑے چراگاہوں میں باقاعدہ ہری گھاس اگانا، انہیں زہریلے اور نقصان دہ خودرو پودوں اور جھاڑیوں سے محفوظ رکھنا بجائے خود ایک باتاتی علم ہے پھر مویشیوں کے ریوڑوں کو بارہ مہینہ چارہ مہیا کرنے کے لیے گھاس بھی فصلوں کی طرح اگانی پڑتی ہے جن مقامات پر بارش ہوتی رہتی ہے اور ندیاں اور نہریں آس پاس بہتی ہیں وہاں اس معاملہ میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی لیکن ربع الخالی کے کنارے پر خشک علاقہ میں اس کام کے لیے انتظامی صلاحیت کے ساتھ ایجادی صلاحیت بھی درکار تھی۔

دنیوی عقل اور پندار علم کی محفلیں

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عاد کو تمکین فی الارض ۔مَسَکَّنّٰھُم حاصل تھی وہ مادی طاقت، جسمانی قوت، مال دولت رکھتے تھے انہیں دنیوی عقل یعنی مادی زندگی میں کان، آنکھ اور دل کے استعمال کی استعداد حاصل تھی، ان کا علم ایسا تھا جس پر وہ ناز اور فخر کر سکتے تھے اور اس پر انہیں فخر و غرور تھا بھی فَرِحُوا بِما عِندَھُم من العِلمِ (غافر/المومن ۴۰:۸۳) وہ لوگ اپنے اس علم معاش پر بڑے نازاں تھے مولانا مفتی محمد شفیع (معارف القرآن ۷:۶۲۱) نے لکھا ہے کہ عاد اپنے مادی علم پر بڑے نازاں تھے اور جو لیاقت حاصل تھی اس پر خوش تھے اور اکڑتے تھے۔

البتہ ہر قسم کا علم پندار پیدا نہیں کرتا اور نہ ہر طرح کے علم پر انسان اکڑتا ہے عاد کا مادی علم معمولی درجہ کا ہوتا یا وہ ادنیٰ درجہ کے کسان ہوتے تو قرآن حکیم میں ان کے انعام و بنین ٥ جنت و عیون ٥ (الشعراء ۲۶:۱۳۳-۱۳۴) مویشیوں اور اولاد اور باغات اور جھرنوں کا ذکر نہ آتا یہ ذکر بجائے خود دلیل ہے کہ ان کے باغات اور مزرعے کثیر و بسیط تھے اور انہیں سیراب کرنے والے چشمے بھی انہیں حاصل تھے یہی وجہ ہے کہ اونچے محلات کے برج ان کے کلب تھے جہاں مجلسیں جما کر وہ لوگ اپنے پندار علم یا معاشرتی بڑائی کا مظاہرہ کرتے اور نادیا وطلتصلف ان کلبوں میں بیٹھ کر خود ستائی کے نعرے لگاتے (امام اندلسی/ بحر المحیط ۷: ۳۱)

خودستائی اور تصلّف کرتے تھے تو کچھ حسن وخوبی تو ہوگی ان میں خودستائی اور پندار کے لیے علم ہوگا تو اس کا کہیں تو ظہور ہو رہا ہوگا اس مادی علم کے اظہار کا ایک موقعہ لازماً ان کی زراعت کی صنعت تھی

بھلائی اور برائی کی جڑیں

قوم ادریس اور قوم نوح کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ قومیں لوہے کے علاوہ مختلف دھاتیں اور ان کے آمیزے استعمال کرتی تھیں قوم نوح کے مومنین کے ساتھ یہ علم باقی رہ گیا تھا اور ان سے قوم عاد تک پہنچا تھا اور ان کی دولتمندی کا سبب تھا۔

پہلی خصلت جو دولتمندی کے ساتھ قومی مزاج کا حصہ بنتی ہے وہ ہے جبر وتشدد، کمزوروں اور زیر دستوں پر ظلم وستم اور حاکم طبقہ کی رعونت اور کبر ونخوت اوپر سے عامۃ الناس میں ان تمام عمرانی خرابیوں کا نفوذ ہوتا ہے اور معاشرہ کو گھن لگنا شروع ہوتا ہے عمرانی کلیہ ہے کہ معاشرتی بھلائی اور حسنات کا آغاز ہمیشہ کمزور اور نام نہاد نچلے طبقہ سے ہوتا ہے اور قوم میں صلاحیت ہو تو خیر اور صلاح و فلاح کی برکتیں بالآخر بالا طبقات کو متاثر کر کے معاشرہ کو سراط مستقیم پر ڈال دیتی ہیں اس کے برعکس برائیوں کی جڑیں ہمیشہ اوپر کے طبقات میں ہوتی ہیں معاصی، گناہ، بدکاری، رشوت، بدعوانی، شہوت رانی کا وبائی آغاز بالا طبقہ میں بالخصوص حکمراں ٹولوں میں ہوتا ہے جن کی پردہ کشائی کی ہمت کسی میں نہیں ہوتی علاوہ ازیں وہ برتر حکمراں گروہ ایسے قوانین بنا لیتے ہیں جن سے ان گناہوں اور برائیوں کو جواز مہیا ہوتا ہے اور انہیں برائی نہیں سمجھا جاتا حسب موقعہ کبھی یہ قوانین دنیاوی ہوتے ہیں اور کبھی ان کو مذہب اور عقیدہ کا چولا پہنا دیا جاتا ہے جب برائیوں کو قانون کی سرپرستی مہیا کر دی جاتی ہے تو یہ سماجی امراض نچلے طبقات میں پھیل جاتے ہیں اور قوم غیر محسوس طور پر زوال وسقوط کی ڈھلان پر قدم ڈال دیتی ہے قوم خوش قسمت ہو اور اس میں اصلاح کی طرف لوٹنے کی جان باقی ہو تو اس کے اندر اصلاح کی دعوت دینے والا کوئی فرد یا کوئی جماعت سامنے آجاتی ہے اور کم سے کم معاشرہ کے ایک حصہ کو بچالیتی ہے ورنہ وہ ساری قوم تاریخ کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔

پیغام ہودؑ کے دو پہلو

قوم عاد میں حضرت ہود علیہ السلام وہ شخص تھے جو اللہ کے فرستادہ تھے اور توحید کا پیغام ان کی دعوت کا اصل اصول تھا جیسا کہ تمام انبیاء کی سیرتوں سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ برابر توحید الٰہی پر اصرار کرتے رہے کیونکہ اس عقیدہ کے بغیر صرف فساد اور ظلم کو راہ ملتی ہے اور انسان تباہی کی سمت بڑھتا چلا جاتا ہے عقیدۂ توحید کا عمرانی پہلو بہت اہم ہے اس عقیدہ سے معاشرہ میں اعتدال پیدا ہوتا ہے جو اخروی کامیابی کے ساتھ دنیوی فلاح کی شرط ہے۔ چنانچہ حضرت ہودؑ کی شخصیت کا دوسرا پہلو عمرانی تھا اور ان کے پیغام اور دعوت کے معاشرتی عنصر سے عبارت تھا اسی اعتبار سے ان کی شخصیت کا تہذیبی پہلو سامنے آتا ہے۔

تمام انبیاء کی دعوت میں دو باتیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں شرک سے توبہ اور توحید کی طرف اجتماعی واپسی، نیز معاشرتی بیماریوں سے اجتناب کا عہد اور سوسائٹی میں خیر کے ذریعہ برکت اور کثرت کی ضمانت اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ہودؑ بھی اپنی قوم کی ارتقائی صلاحیت کو ضائع ہونے سے بچانا چاہتے تھے وہ جانتے تھے کہ ان کی قوم شرک کے پیدا کردہ گناہوں اور برائیوں پر مصر رہی تو سارا زور ٹوٹ جائیگا اور علم و ترقی سب ملیامیٹ ہو جائے گی قوم کو اس بدحالت سے بچانے کی ایک ہی صورت تھی انہوں نے ان ربانی نعمتوں پر شکر گزاری کا مشورہ دیا فَاذْكُرُوْآ اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۶۹)= تو یاد کرو اللہ کے احسانات تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (ھود ۱۱: ۵۲)= اے قوم اپنے رب سے استغفار کرو پھر توبہ کرو اور اس کی طرف لوٹو تو وہ آسمان سے موسلا دھار بھیجے گا اور تمہاری قوت میں اور قوت بڑھائے گا امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۵: ۲۳۳) نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ہودؑ کا وعدہ تھا کہ ایمانی قوت جسمانی قوت میں اضافہ کا سبب بنے گی یعنی عقیدۂ توحید کی بناء پر وعدہ صاف صاف جسمانی اور فوجی قوت میں اضافہ کے متعلق تھا مولانا ادریس کاندھلوی

(معارف القرآن ۴: ۴۳-۴۴) نے کہا کہ وعدہ تھا اللہ عاد کی مالی، بدنی قوت بڑھائے گا اور دولت و اولاد میں برکت دے گا۔

دنیا کی پہلی سپر پاور قوم

سورہ الفجر کی تفسیر میں مفسرین کا عام بیان یہ ہے کہ عاد کے دو بیٹے تھے شدید اور شداد اور وہ دونوں بادشاہ بنے اور سب پر غالب آ گئے پھر شدید مر گیا اور تمام حکومت شداد کو مل گئی اور وہ ایک قاہر بادشاہ بن کر سامنے آیا وہ دنیا کا بادشاہ ہوا علامہ آلوسی (روح المعانی ۸: ۱۵۶) امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵: ۴۸۷) امام قرطبی (احکام القرآن ۵/۲۰: ۴۷) اور امام بیجاوی (انوار التنزیل ۵: ۴۸۷) نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ ساری دنیا کے بادشاہ شداد کے آگے جھکتے تھے امام اندلسی (بحر المحیط ۴: ۳۳۸) نے کہا کہ عاد کو زمین کی بادشاہت دی گئی تھی الکشاف میں علامہ محمود زمخشری نے بیان کیا ہے کہ انہیں مخلوقین۔ انسانوں اور جنوں میں فضلیت دی گئی تھی امام اندلسی نے سدّی، ابن اسحٰق اور شیخ الاسلام ذکریا انصاری کے حوالہ سے بھی اس کی تائید کی ہے شیخ الاسلام نے مزید کہا کہ عاد کو زمین پر اقتدار و استیلاء دیا گیا تھا۔

زمخشری قرطبی، بیضاوی، نسفی، اندلسی اور پانی پتی کا بیان ہے کہ شداد نے جنت کا ذکر سنا تو زمین پر عدن کے صحرا میں اس کی مثال بنانے کا ارادہ کیا جس میں محلات سونے اور چاندی کے تھے، ستون زبرجد اور یاقوت کے تھے قسم قسم کے درخت لگائے اور چکردار بہتی ہوئی نہریں (المطرد) بنائیں اور اس جنت ارضی کا نام ارم رکھا جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں تھی یہ بھی کہا گیا کہ شداد نے دنیا بھر کے بادشاہوں کو زر و جواہر مہیا کرنے کا حکم دیا اور ساری دنیا کی دولت اس کے پاس جمع ہو گئی کیونکہ روئے ارض کا کوئی بادشاہ شداد کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا اس جنت کے مکمل ہونے میں ایک دن رات رہ گیا اور بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے روانہ ہوا تو ایک زبردست چنگھاڑ نے شداد کو اس کے تمام درباریوں اور امیروں سمیت مٹا ڈالا۔ ان مفسرین میں امام بیضاوی نے جنتِ ارم کے قول کو ضعیف کہا ہے ابن خلدون (تاریخ العبر ۱: ۳۰)

نے بھی اس قصہ کو بے اصل خرافات قرار دیا ہے مگر اس تردید سے عاد کی سیاسی قوت اور وسیع حکومت کی تردید نہیں ہوتی کیونکہ اسی ذیل میں خود ابن خلدون نے مسعودی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شداد نے ممالک شام وعراق کے علاوہ ہند کو بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تھا قصہ ارم کے خرافات ہونے سے عاد یا شداد کی سطوت اور مادی ترقی کی تردید بھی نہیں ہوتی۔

تفسیری اطلاعات سے چار باتیں ثابت ہوتی ہیں اول عاد کے شہنشاہ شداد کی حکومت ساری دنیا پر تھی دوئم قرطبی، بیضاوی، نسفی، اندلسی، آلوسی کا اتفاق ہے کہ شداد معمورہ ارض۔ ساری مہذب دنیا کا بادشاہ تھا: سوئم موجودہ زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قوم عاد دنیا کی پہلی سپر پاور تھی جس کا حکم ساری یک قطبی مہذب دنیا پر چلتا تھا چہارم ساری دنیا پر حکومت کرنے یا دوسرے حکمرانوں کو اپنے سامنے جھکانے کی شرط مادی علوم میں انتہائی درجہ کی مہارت ہوتی ہے جو عاد کو حاصل تھی

ہمسری اور برتری کی کشمکش

ہمسر قومیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تو ہیں مگر کسی ایک کی برتری بھی تسلیم نہیں کرتیں۔ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے ایک ہزار سال تک فارس اور یونان باہم دست وگریباں رہے مگر دونوں برابر کی طاقت ہیں تو شکستوں اور فتوحات کی طویل تاریخ کے باوجود کوئی ایک کسی کو اپنے سامنے نہ جھکا سکا استعماری دور میں برطانیہ ایک ایک کر کے باقی یورپی ملکوں کو دنیا کے بڑے خطہ سے بے دخل کرتا چلا گیا کیونکہ علم عناصر اور سیاسی قوت میں کوئی اور یورپی ملک اس سے برتر نہ تھا گزشتہ صدی میں امریکہ (اور اس کے یورپی اتحادی) اور معدوم سوویت یونین برابر کی ٹکر کی طاقتیں تھیں اس لیے ان میں سے کوئی بھی دوسرے پر راست جارحیت کی جرأت نہ کر سکا۔

اگر دنیا کی قومیں اور بادشاہ عاد وشداد کے سامنے جھک گئے تھے تو اس کا سبب ہوگا ان میں کوئی بھی عاد کا ہمسر نہیں تھا حقیقت یہ ہے کہ ایجادی مادیات اور اختراعی استعداد میں برتر قوم کے پاس وہ مادی ذرائع اور وسائل موجود ہوتے ہیں جو دوسروں کے ہمسری کے دعووں کو کچل پھینکتے

ہیں اور جب کوئی ہمسر باقی نہیں رہتا تو برتر قوم کھلے عام ظلم و جبر، فساد اور تشدد پر اتر آتی ہے تمام بزرگ مفسرین قرآن کے بیان کے مطابق یہی کچھ عاد کے ساتھ بھی ہوا شداد اور قوم عاد کو معمورۂ ارض پر اقتدار و استیلاء ملا تھا تو لازم تھا کہ مادی علوم عناصر میں اس کا مقام باقی قوموں سے کہیں زیادہ اونچا ہو اور اسی مہارت کی وجہ سے وہ باقی دنیا کو اپنے سامنے جھکنے پر اپنے احکام کی تعمیل کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنے علم اور ترقی کی رفتار پر تفاخر اور تکبر نے ان کے حکمراں ٹولے اور پھر باقی قوم میں اعلیٰ انسانی جذبات کو کچل دیا۔ ان کے لیڈر ظالم و جابر بن گئے حق سے دشمنی پر اُترے تو انسانوں سے دشمنی کرنے لگے تشدد اور انتہا پسندانہ اقدامات اور مالی رشوتوں اور بدعنوانیوں کے ذریعہ عام لوگوں کو اپنے اعتقادات کو قبول کرنے پر مجبور کرنے لگے، خود اتنے بے رحم ہو گئے کہ ذرا ذرا سی بات پر موت کی سزائیں سناتے اور زیردستوں پر کوڑے برساتے سرداروں کی برائیاں عام لوگوں میں رائج ہوئیں تو نتیجہ میں ساری قوم ظلم و تشدد اور شیطنت و جہالت کی لائی ہوئی تباہی اور دائمی خسران کا شکار ہوئی اسی کو سنت اللہ کہا گیا ہے جو نہ بدلتی ہے (الاحزاب ۳۳:۶۲؛ فاطر ۳۵:۴۳؛ الفتح ۴۸:۲۳) اور نہ پلٹتی اور رُخ پھیرتی ہے (فاطر ۳۵:۴۳) پھر چاہے یہ بات مجرم قوموں کو کتنی ہی بری کیوں نہ لگے۔ (الانفال ۸:۸)

قوموں کی بقا اور فنا کی وجوہات

ظلم کے دو درجے ہوتے ہیں ایک تو قومیں خود اپنے ہم قوم، ہم وطن، ہم مذہب انسانوں پر ظلم و جور کرتی ہیں اس ظلم کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور عموماً ایسا ظلم باقی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے یا کوئی اس کی پروا نہیں کرتا کیونکہ ظالم قوم سے سب کمتر ہوتے ہیں یا کسی میں ظالم گروہوں کا ہاتھ پکڑنے کی ہمت یا اخلاقی جرأت نہیں ہوتی دوسرا درجہ اپنے ملک و قوم سے باہر دیگر قوموں پر ظلم و جور کا ہوتا ہے اس قسم کے ظلم کا پھیلاؤ وسیع ہوتا ہے اور اپنے نواح اور پڑوس سے آگے ساری دنیا تک اس کا دائرہ پھیل سکتا ہے عمرانی کلیہ ہے کہ جب کسی قوم کا کوئی ہمسر باقی نہیں رہتا تو وہ اس قسم کے ظلم عام پر اتر آتی ہے اور پھر اسے اپنی تباہی کی سمت دیوانہ وار دوڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ عہد پارینہ میں اول تو فارس کو روم پر میقاتی تقدم حاصل تھا پھر فوجی قوت،، تہذیب وتمدن، صنعت ودستکاری، اختراعات اور فن تعمیر میں فارس کا مقام روم سے کہیں زیادہ بلند تھا اور مقابلتاً وہ حکومت اسی درجہ ظالم و جابر بھی تھی اور اسی وجہ سے ایک بار سکندر مقدونی کی سپہ سالاری میں یونانیوں نے اسے برباد کیا (۳۳۴ ق م) اور دوسری بار خود اس کا ظلم و فساد اور تکبر اسے لے ڈوبا جب کسرائے ایران خسرو ثانی (م: ۶۲۸ء) کے بعد یزدگرد ثالث (۶۳۲۔۶۴۲ء) تک لگاتار ۱۶ بادشاہ اس عظیم اور مہذب و متمدن، مگر خودسر اور سرکش شہنشاہیت کو بربادی وتباہی نہ بچا سکے۔ اس کے برعکس مشرقی رومی شہنشاہیت کمزور قیصروں کے باوجود صرف اس لیے مزید آٹھ صدیوں تک دنیا میں باقی رہ گئی کہ دوسری خرابیوں کے مقابلہ میں وہ حکومت نہ اپنے عوام پر ظلم کرتی تھی اور نہ پڑوسیوں اور باقی دنیا کے انسانوں کے لیے موجب تکلیف تھی تاریخ کا یہ عمرانی نکتہ مؤرخین کی نظروں سے اوجھل ہے کہ جنگِ قادسیہ (نومبر ۶۳۶ء/ ۱۵ھ) میں فارس کی کیثرائیت کے پرخچے اڑ گئے تھے مگر جنگ یرموک (اگست ۶۳۶ء/ ۱۵ھ) کے بعد بھی بیزنطینی قیصریت کا وجود برقرار رہ گیا قدیم دنیا کی ان دو بڑی طاقتوں کی ان متضاد تقدیروں کا کوئی عمرانی یا اخلاقی سبب ضرور ہوگا۔

عاد کا ظلم دو گونہ تھا وہ مال و دولت اور املاک و جائداد کے حریص تھے اور ان کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔ ظلم کا یہ پہلو داخلی طور پر بھی اس قوم کو گھن لگا رہا تھا اور اس کا خارجی پہلو اس کے سیاسی جسد کو کمزور کر رہا تھا عاد اپنے عہد کی بہت بڑی فوجی طاقت تھے اور اس طاقت کو ظلم و جبر اور دیگر قوموں کی تذلیل اور تباہی کے لیے استعمال کرتے تھے امام اندلسی (بحر المحیط ۵: ۲۳۳) نے سورۃ ھود (۱۱: ۵۲) کی تفسیر میں صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ عاد کے لوگ ایسے بے رحم تھے اور ان کو ایسی بڑی اور بھاری فوجی قوت حاصل تھی کہ اس کے جا و بے جا استعمال سے انہیں گریز نہ تھا اور ہر علاقہ میں قوموں میں غارت ڈال دینے اور ان کی توہین و تذلیل کرنے میں انہیں باک نہ تھی، بـاس مهيبين فی کل ناحيه، ہر خطہ میں اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ اوروں کی اہانت و تحقیر پر کمربستہ رہتے تھے

ایک قرآنی اصطلاح

امام اندلسی نے تفسیر میں عاد کے سلسلہ میں لفظ 'بأس' استعمال کیا ہے دراصل یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے اور اس سے مُراد جنگ اور سامان جنگ اور ہتھیار وغیرہ ہوتے ہیں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مولانا مفتی محمد شفیع تک ممتاز مفسرین نے وَاَنزلنا الحدید فیه بأس شدید (الحدید ۵۷:۲۵) کی تفسیر میں اس لفظ سے جنگ، آلات حرب، فوجی قوت وغیرہ مراد لیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں اسے 'سلاح' کہا جسے جہاد فی سبیل اللہ میں استعمال کیا جائے ابن عطیہ کا قول ہے (بحر المحیط ۸:۲۲۵) کہ اس کا مطلب ہے اسلحہ دشمنوں سے لڑنے کے لیے امام قرطبی (احکام القرآن ۱۷:۲۶۱) نے وضاحت کی ہے کہ آہنی آلات میں قتل کیے جانے کا شدید خوف ہے یہی بأس ہے امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵:۳۰۴) نے بأس سے مراد آلات حرب لیے ہیں جو لوہے سے بنائے جاتے ہیں کفار کے خلاف جہاد کرنے کی خاطر امام بغوی (معالم التنزیل ۸:۴۱) نے قوت شدیدہ یعنی اسلحہ جنگ کہا اور مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ آہن سے دفاع اور ضرب کے آلات بنتے ہیں امام طبری (جامع البیان ۱۰/۲۳:۲۰۱) نے بھی اسے قوت شدیدہ کہا ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ آہنی سیوف وسلاح سے ظالموں کا علاج کیا جاتا ہے امام رازی (مفاتیح الغیب ۱۶:۲۱۰۔۲۱۱) نے کہا کہ دشمنوں سے سیف کے ذریعہ معاملہ کیا جاتا ہے، ناپسندیدہ لوگوں کو سیدھا رکھا جاتا ہے، غیر مطلوب اور ضرر کو دفع کیا جاتا ہے، مزاحمت کے کام آتا ہے یہ مفتی محمد شفیع (المعارف القرآن ۸:۳۲۰۔۲۲) نے اس کا مطلب شدید ہیبت بتایا ہے کہ مخالفین پر آہنی آلات حرب کا رعب پڑتا ہے اور اس سے سرکشوں کو احکام کا پابند بنایا جاتا ہے کیونکہ سرکش معاند جو کسی دلیل سے نہیں مانتا۔ اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ دنیا میں عدل و انصاف قائم نہ ہونے دے گا اس کو پابند کرنا لوہے کا کام ہے جو حکومت وسیاست کرنیوالے آخر میں بدرجہ مجبوری استعمال کرتے ہیں۔ علامہ آلوسی (روح المعانی ۲۷:۱۸۸) نے عذاب شدید مراد لیا کہ لوہے سے آلات الحرب بنتے ہیں اور ان کی مدد سے عدل قائم ہوتا ہے ظلم کا قلع قمع کیا

جاتا ہے۔قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظھری ۱۱:۱۹۷) نے کہا کہ بأس شدید بمعنی جنگ ہے اور جنگ کے آلات لوہے سے ہی بنائے جاتے ہیں مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن ۱۹۱ ۷) نے سورۃ النمل (۳۳:۲۷) کی تفسیر میں اس سے بڑے لڑنے والے مراد لیا ہے مولانا محمد ادریس کاندھلوی (معارف القرآن ۷:۵ ۶۷) نے لکھا کہ لوہے میں سختی ہے جو محض ظاہری اور مادی نہیں بلکہ جہاد میں (اس کا) استعمال ہے جو ہدایت کا ذریعہ ہے (فقط دشمنوں کا قتل کرنے کا نہیں) جو لوگ اپنی طبعی کجروی سے باز نہ آئیں، نہ اللہ کے احکام کو مانیں، نہ انصاف کی ترازو کو سیدھا رکھیں جس سے نظام عالم اور اس کا امن و راحت وابستہ ہے تو پھر ان سے جہاد و قتال ہوگا، تلوار اٹھانی پڑے گی۔۔لوہے سے ہی کام لینا پڑے گا عبداللہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمہ و شرح قرآن حکیم میں بأس کے معنی علی العموم فوجی طاقت کے لکھے ہیں۔

تہذیب سازی میں آہن کا کردار

بأس کا لفظ قرآن حکیم میں البقرہ ۲:۱۷۷؛ النساء ۴:۸۴؛ الانعام ۶ :۶۵؛ الاسراء ۱۷:۵؛ الکھف ۱۸:۲؛ النمل ۲۷:۳۳؛ الاحزاب ۳۳:۱۸؛ غافر/المؤمن ۴۰:۲۹؛ الفتح ۴۸:۱۶ میں وارد ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا مفہوم فوجی قوت، اسلحہ، آلات حرب، دفاع، ضرب، جنگ، وغیرہ بیان ہوا ہے اس تناظر میں ابن کثیر (تفسیر ۳۰:۲۴ ۷) نے سورۃ الفجر کی تفسیر میں قوم عاد کے ہتھیاروں کا ذکر کیا ہے کہ وہ بہترین ہتھیاروں والے تھے چنانچہ بأس کی تحقیق کا مقصد یہی واضح کرنا تھا کہ قوم عاد ایک بڑی فوجی طاقت تھی بڑے مہلک ہتھیار بناتی تھی، آہن اور دیگر دھاتوں اور معدنی مرکبات کے فن سے واقف تھی کیونکہ اس کے بغیر اسلحہ سازی کی صنعت کام نہیں کرسکتی۔

قوم عاد کی صناعی کا کچھ اندازہ آہن کے مصالح الناس کے ذیل میں امام رازی کی دی ہوئی تفصیل سے ہوسکتا ہے مفاتیح الغیب (۱۶:۲۱۱) میں انہوں نے آغاز اس سے کیا کہ آہن سلطنت و حکومت کی اساس ہے جیسا کہ لوہے کی فوجی بلکہ تادیبی اہمیت اوپر بیان ہوچکی ہے اس کے علاوہ

مکانات کی بنیادوں اور تعمیرات میں کمال کے لیے آہن درکار ہے زراعت، پارچہ بافی اور کپڑے کترنے اور سینے کے لیے، کھانا بنانے اور کھانے کے برتن اور پیالے، پھل چھیلنے اور تراشنے کی چھریاں اور چاقو، اناج سے آٹا پیسنے، روٹی بنانے، کرسیاں اور نشستیں بنانے غرض ہر اُس کام میں جو تہذیب مدن کے لیے لازمی ہو لوہا سب سے اہم عنصر ہے یہ تفصیل امام رازی جیسا عمرانی مفکر ہی دے سکتا تھا چنانچہ لکھتے ہیں کہ سونا لوہے کے مقام تک نہیں آتا جو منافع لوہے کے ہیں وہ سونے کے ہرگز نہیں ہیں یہ بھی لوہے کی فضیلت ہے کہ وہ آسانی سے کثیر مقدار میں دستیاب ہے جب کہ سونا مشکل سے اور قلیل مقدار میں ملتا ہے۔

ایک ایسی قوم جو دولتمند ہو، جو اپنے مادی طبیعیاتی علوم پر مغرور بھی ہو جو اعلیٰ پایہ کی صنعت گر بھی ہو، جس کے پاس ہتھیار بنانے کی استعداد بھی اور جو ظالم و جابر بھی ہو کہ کمزور اقوام اور پڑوسیوں کی توہین وتذلیل کرنے اور ان ملکوں میں لوٹ مار کرنے سے اسے عار نہ آئے وہ قوم کسی بھی مادی پیمانہ تہذیب پر معمولی درجہ کی قوم ثابت نہیں ہوتی بے شک عاد کا مادی تہذیبی مقام اونچا تھا اسی لیے اس میں فساد بھی بہت شدید تھا اسی لیے اس کے پاس ایک جلیل القدر نبی کو بھیجا گیا تھا۔

ہوس اور حرص کا بازار

عاد کے پاس مال و دولت کی کمی نہیں تھی لیکن دولت کا خاصہ حرص اور لالچ ہے مال کتنا بھی ہو اہل ثروت کو کم ہی لگتا ہے اور مزید کی ہوس انہیں پاگل بنائے رکھتی ہے۔ عاد بھی مال دولت اور املاک و جائداد کے بڑے حریص اور لالچی تھے (الاندلسی /بحر المحیط ۵: ۲۳۲-۲۳۳) اور اس مقصد کے لیے لوٹ مار ان کا پیشہ تھا ادھر ادھر نکلتے لوگوں کو مار پیٹ کر جبراً قہراً ان کے مِلک و مال پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے (ابن کثیر ۸: ۲۹۰) یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ عاد معمولی قسم کے لٹیرے تھے جو راہگیروں کی جیبیں کاٹ لیتے تھے بلند مقام تہذیب ایسے لچر کاموں کی اجازت نہیں دیتی اس کے علاوہ کسی چلتے پھرتے آدمی کی جیب سے کتنا مال ملے گا جو کسی ثروت مند کی حرص کا پیٹ بھر سکے گا وہ قوم جس کے سردار اور اہل دولت اونچے برجوں والی بلند و بالا عمارتوں میں بیٹھ کر ستاروں

کی گردشوں میں انسانی تقدیر کے رموز ڈھونڈتے ہوں کھیل تماشے کرتے ہوں اوروں کی تذلیل و توہین اور بے شرمی سے ان کا مذاق اڑاتے ہوں (بیضاوی/انوار التنزیل ۴:۲۴۷؛ نسفی/مدارک التنزیل ۲:۸۷۱؛ کاندھلوی/معارف القرآن ۵:۵۲۶) ان کی طلب زر گرہ کٹی کا پیشہ نہیں ہو سکتی تھی وہ کچھ اور ہی بات تھی اس نکتہ کو آج کی دنیا میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

تہذیب جب عروج پر آتی ہے تو سربراہان تہذیب اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے دوسری قوموں اور ملکوں کا مال اور ان کے وسائل پر غاصبانہ قبضہ کو انصاف قرار دیا جاتا ہے اس کا ثبوت شداد کے واقعہ سے ملتا ہے کہ کس طرح اس نے اپنی باج گزار اور ماتحت قوموں سے زر و جواہر جمع کر کے وہ باغ بنایا تھا جس کا تذکرہ اساطیری رنگ اختیار کر گیا یہ تھی مال دولت کی بے انتہا حرص اور لوٹ مار اور اسی مقصد کے لیے عاد کی خونریز مہمات تھیں ذاتی قومی دفاع سے مجبور جن کمزور ملکوں میں عاد کے قدم جاتے فتنہ و فساد، جرائم اور غارت گری ساتھ جاتی (شبیر احمد عثمانی/تفسیر عثمانی ۶:۵۳۵۔۵۳۷) وہ بے شرمی سے قتل عام اور خون ریزی پر لوگوں اور باجگزار قوموں کو اکساتے تھے اور خود اس قسم کے کاموں میں ملوث ہوتے تھے التحریض علی القتال = قتل و غارت گری پر لوگوں کو اکساتے تھے (اندلسی/بحر المحیط ۵:۲۳۳)

سیاسی اور اقتصادی دائرہ اثر

اگرچہ عاد کا وطن اور مرکز حکومت یمن و حضرموت اور عمان میں احقاف کے علاقہ میں تھا لیکن ایسی روایات سامنے آ چکی ہیں کہ ان کا سیاسی تسلط اور اقتصادی استیلاء، بحرین، عراق اور شام بلکہ ہندوان تک وسیع تھا اور حجاز کا مرکزی شہر مکہ ان کا حلیف تھا اور وہاں کا عمالقی حاکم معاویہ ابن بکر عاد کا قرابت دار بھانجہ تھا (امام طبری / جامع البیان ۵/۱۲:۵۰۸) حضرت ابن عباسؓ نے احقاف کے اثرات شام میں بتائے ہیں، یعنی یمن سے شام تک ان کا سیاسی استیلا اور اقتصادی تسلط تھا (قرطبی /احکام القرآن ۳/۹:۵۱؛ آلوسی/روح المعانی ۸:۱۵۶) اور عراق تک ان کا سکہ رواں تھا (بلند شہری/ جمالین فی شرح جلالین ۲:۳۷۸۔۳۷۹) نزول قرآن

کے زمانہ میں یہ سب دور دراز علاقے تھے اور اہل حجاز کے لیے معروف بھی تھے اس لیے مفسرین نے انہی کے ذکر پر اکتفا کیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے علاوہ کسی اور علاقہ تک عاد کا سیاسی اور اقتصادی دائرہ اثر وسیع نہیں تھا ابن خلدون کا بیان ہے کہ شداد نے شام و عراق کے علاوہ ہند کو بھی فتح کر لیا تھا (تاریخ العبر ا:۳۰) عاد کے شہنشاہ شداد نے باغ ارم کے لیے جو زر و جواہرات اکٹھا کیے تھے وہ صرف ان چند ملکوں سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

اب یہ سامنے کی بات ہے کہ جس قدر اس دائرہ اثر کا پھیلاؤ ہو گا اسی قدر اسباب سفر کی سہولتیں بھی لازم ہوں گی اور اتنا ہی بسیط عاد کا نظام مصنوعات، اساس ایجادات اور منہاج تعلیم ہو گا، اور اتنا ہی وسیع عاد کا مادی علم عناصر بھی ہو گا لہٰذا اس کے باوجود کہ مؤرخین کے نزدیک یہ قوم اور اس کی تاریخ و تہذیب لائق اعتناء نہیں رہی، ایسے حسی اور منطقی شواہد موجود ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ عاد ایک بے حد ترقی یافتہ قوم تھی اور اس کا تمدن دنیا کی چند اہم ترین تہذیبوں کی فہرست میں شامل ہے۔

اس کی آخری دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم میں دیگر اقوام کے مقابلہ میں عاد کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور اس پر بھیجے جانے والے عذاب کو رہتی دنیا کے لیے نشان عبرت بنایا ہے اس موضوع کو حیاتی اور علمی تحقیق کی ضرورت ہے بے شک بعض شوقین امریکیوں نے اس سلسلہ میں کچھ نیم علمی کام کیا ہے مگر ان کا نقطہ نظر مادی ہے اس لیے درست نتائج تک رہنمائی نہیں کرے گا۔

حضرت ہودؑ اور عربی زبان

قوم عاد کے چودھریوں اور کاہنوں اور حضرت ہودؑ کے مابین جو مکالمہ ہوا اس میں حضرت ہودؑ کے مختصر مگر نہایت جامع جواب کو کئی مفسرین نے حضرت ہودؑ کا معجزہ قرار دیا ہے۔

حضرت ہودؑ نے کہا استغفار اور توبہ کرو تو چھاجوں مینہ برسے گا، تمہاری قوت میں اضافہ ہو گا مجرموں کا راستہ اختیار نہ کرو وہ بولے اے ہود تم کوئی دلیل تو لائے نہیں کہ محض تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو ترک کر دیں ہم ایسا کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی

معبودوں نے تمہیں کسی جنون اور برائی میں مبتلا کر دیا ہے حضرت ہودؑ نے کہا میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی سن لو کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک بنا کر پوجتے ہو اور ایسا ہی ہے تو بلاؤ اپنے سارے معبودوں کو اور تم اور وہ مل کر میرے ساتھ داؤ گھات کر لو، ذرا کسر نہ چھوڑو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو میں نے تو اللہ پر بھروسہ کر رکھا ہے جو میرا بھی رب اور تمہارا بھی رب ہے اور جو کچھ بھی اس زمین پر چلتا ہے اس کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے (ھود ۱۱:۵۲۔۵۶)

یہ مدلل، جامع اور موجز و مختصر گفتگو اور طلاقت لسانی اور منطقی استدلال حضرت ہودؑ کا معجزہ تھا تو یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ قوم عاد منطقی طرز گفتگو کی ماہر تھی طرفین کے اس طرز گفتگو سے اس ترقی یافتہ زبان کی طرف ذہن جاتا ہے جو حضرت ہودؑ بولتے تھے اور عاد کے ہاں رائج تھی وہ کونسی زبان تھی؟

مفسرین کا قول ہے کہ حضرت ہودؑ کا پوتا اور سارے یمن کا حاکم یعرب ابن قحطان ابن ہودؑ پہلا شخص تھا جس نے عربی زبان بولی تھی، اس کے بعد ہی اس خطہ کے لوگوں نے اپنا نام عرب رکھا (اندلسی / بحر المحیط ۴:۳۲۶) امام اندلسی کی رائے ہے کہ حضرت ہودؑ عرب نہیں تھے مگر یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ عاد کو عرب بائدہ۔ ختم ہو جانے والے عرب۔ اور عرب عاربہ۔ اصلی عرب۔ اقوام میں ثمود، طسم، جدیس اور جرہم وغیرہ کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے اس کی تصدیق مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (قصص القرآن ۱:۱۰۳) نے یاقوت حموی (معجم البلدان ۶:۱۲۹) کے حوالہ سے کی ہے۔

ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نے اصوات کی بناء پر سریانی زبان کی ابجد مرتب کر دی تھی اور لسانی اعتبار سے آج تک ساری دنیا کی تمام معدوم اور موجودہ زبانوں کی الفبا اسی سریانی ابجد سے مشتق ہیں سریانی زبان اس لحاظ سے ام الالسنہ۔ زبانوں کی ماں ہے اور قدرے ترمیم کے ساتھ اس کی اور یہی الفبا ہی عربی زبان کے لیے بھی مستعمل ہے چنانچہ طوفان نوح کے بعد بنی سام ابن نوح کی نسلوں میں سریانی زبان سے مشتق

ایک سامی زبان کے اصوات والفاظ مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے اور حضرت ہُودؑ کا زمانہ آتے آتے یہ ایک امتیازی پیرایہ اظہار بن چکی تھی، اگرچہ وہ موجودہ یا قرآنی عربی سے قدرے مختلف تھی اس دلیل سے قوم نوح بھی کوئی ایسی زبان استعمال کرتی تھی جو عربی سے قریب بلکہ خود عربی کی ماں کہلا سکتی ہے ممکن ہے یعرب ابن قحطان ابن ہُود نے اس زبان کے قواعد مرتب کیے ہوں جن کی مدد سے یہ ایک مکمل اور سائنٹفک زبان بن گئی اس کا مطلب ہوا کہ حضرت ہُودؑ کے زمانہ میں اول دور کی عربی زبان کے خدوخال واضح ہونے لگے تھے اور اسے ایک درجہ میں علمی زبان کا درجہ حاصل ہو چکا تھا اس خیال سے انکار کر دینا آسان ہے لیکن اسی کے ساتھ قوم نوح اور قوم ہُود کے تہذیبی ہی نہیں عمرانی وجود کا انکار بھی لازم ہوگا، اور فقط یہی نہیں بلکہ سفینہ نوح اور عمان وحضرموت میں عاد کے ستونوں کے آثار کی نفی بھی لازم آئے گی۔

یہاں یہ عمرانی کلیہ پیش نظر رہے کہ تہذیب بننے کی ایک بنیادی شرط قوم کے پاس ایک ایسی محکم زبان کا ہونا لازم ہے جس میں علمی اور سائنسی تحقیقات ہو سکیں اور جو ایجادات واختراعات کا علمی وزن اٹھا سکے جن قوموں کی زبانوں نے یہ شرط پوری نہیں کی وہ دنیا کو کوئی تہذیب بھی نہیں دے سکیں یہی وجہ ہے کہ ایک زبان جب تک ادبیات عامہ (Folk.lore دیہی گیتوں اور قصوں) سے ادبیات عالیہ کے مقام تک نہ آئے اور ادبیات عالیہ سے علوم عالیہ کی سمت پیش رفت نہ کرے وہ کسی تہذیب کا تاج نہیں بن سکتی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ عاد نے بڑے بڑے بلند وبالا محلات اور قلعے تعمیر کیے فن تعمیر کو ایک نیا رخ دیا اور عمارتوں کو دیرپا بنانے کے لیے ستون ایجاد کیے جن پر وہ عظیم ومحکم عمارتیں اٹھائی جاتی تھیں، علم سیاست میں وہ مقام حاصل کیا کہ ساری دنیا ان کے زیر اثر اور زیر تسلط آ گئی یہ سب کچھ کوئی گونگی، بے زبان اور بے علم اور بے وقار قوم نہیں کر سکتی تھی ان کاموں کے لیے قوم کی لسانی میراث میں ایک فاخرہ زبان ضروری تھی تاکہ اس کا علمی خزانہ تخلیقی جواہرات سے لبریز ہو جائے پھر اگر تین نسل بعد ایک زبان لغوی اور لسانی استحکام کو پہنچنے والی تھی تو وہ اچانک یعرب ابن قحطان پر نازل نہیں ہو گئی تھی بلکہ تین نسل پہلے یقیناً ایک وسیع علمی زبان بن چکی تھی

زبانیں مدتوں کی بول چال کا نتیجہ ہوتی ہیں سرکاری سرپرستی میں کوئی زبان ترقی کرسکتی ہے، لیکن زبان بذات خود کمزور ہو تو سرکار اور قوم دونوں کو لے ڈوب سکتی ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ قوم عاد اپنی زبان کی کمزوری کی وجہ سے تباہ نہیں ہوئی تھی بلکہ حقیقتاً بے مہار زبان آوری نے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

منطق اور اجتماعی تمسخر کا فن

قوم عاد خالی خولی باتیں نہیں کرتی تھی بلکہ اپنے خیال کی دلیل بھی رکھتی تھی اونچے برجوں میں واقع کلب نما انجمنوں میں بیٹھ کر دوسری قوموں کا مذاق بناتے والے لوگوں کے بارے میں یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ بازاری لوگ تھے اور بازاری زبان بولتے تھے استہزاء و تمسخر اور بازاری گالی گفتار میں بڑا فرق ہوتا ہے عاد کی زبان آوری کا اندازہ حضرت ہودؑ سے ان کی جھک بحث سے ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان کی منطق غلط تھی مگر بحث ان کی زبان آوری سے ہے جسے وہ مجبور و کمزور افراد اور قوموں کے خلاف اپنا دعویٰ مرتب کرنے میں بھی استعمال کرتے تھے زبان آور قومیں لفاظی کے ذریعہ آج بھی اسی طریقہ پر عمل کرتی ہیں اس سے دو نکتے سمجھ میں آتے ہیں، اول یہ کہ علم منطق کے موجد عاد تھے خواہ انہوں نے اس کے کلیات نہ مرتب کیے ہوں اور ممکن ہے تہذیب کے ساتھ یہ فن معدوم ہو گیا ہو اور افلاطون و ارسطو نے اسے از سر نو دریافت اور مرتب کیا۔

دوسرے کارٹون کشی اور خاکہ نگاری کے ذریعہ لوگوں کا مذاق اڑانے کی رسم کا آغاز بھی بظاہر عاد ہی نے کیا تھا۔ یہ جو روایت ہے کہ اونچے برجوں میں بیٹھ کر وہ غیروں کا مذاق اور مضحکہ اڑاتے تھے تو ضروری نہیں کہ وہ عام راہگیروں سے بازاری چھیڑ چھاڑ ہو اگر عاد کو ایک مہذب اور ترقی یافتہ قوم مانا جائے تو یہ بہر حال سُوقیانہ اور غیر مہذب حرکت تھی چنانچہ اس طنز، تنقید اور پھبتی کا نشانہ بظاہر وہی افراد اور اقوام بنتی تھیں جن کو برج نشین لوگ حقیر اور کمتر گردانتے تھے موجودہ تہذیب کے پیرائے میں اس کو سمجھنے کے لیے ابلاغیہ میں بنائے جانے والے سیاسی اور معاشرتی کارٹون اور مہذب و دانشمند لوگوں کا خاکہ اڑانے جیسی باتوں کو پیش کیا جاسکتا ہے یہ دعویٰ شاید حد سے تجاوز کرے کہ

عاد کے پاس ابلاغیہ اور کارٹون سازی جیسی کوئی بات تھی لیکن بین الاقوامی تعلقات میں ایسی روایت قائم کرنے میں ان کا حصہ ضرور ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا سیاسی اور معاشی استیلاء شام، بحرین، عراق اور ہند تک پھیلا ہوا تھا اور شداد کے قصہ میں اس سے بھی آگے تک کا اندازہ قائم ہوتا ہے ان محکوم قوموں کو عاد اپنے برابر کا درجہ نہیں دیتے تھے اور اس لیے اگر ان سے حقارت کے اظہار میں ان کا مذاق اڑاتے ہوں تو یہ ان کے ترقی یافتہ ہونے پر قطعی دلیل ہے۔

شرک اور معاشرتی فساد

عاد کی تہذیب ان کی معاشرت اور مزاج کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بات ہو چکی ہے جس سے تاریخ تہذیب میں ان کا مقام متعین کرنا آسان ہو گیا ہے۔ ان کی تہذیب میں بھی ہر ترقی یافتہ تہذیب کی طرح کچھ نا قابل برداشت باتیں رائج ہو گئی تھیں۔ سب سے پہلی بات جو باقی مادی تہذیبوں کی طرح عاد کی تہذیب میں بھی نمایاں تھیں وہ شرک اور اس پر اصرار اور اس کے حق میں ممکنہ عقلی اور منطقی دلائل کی بحث تھی شرک کا ایک خاصہ معاشرتی فساد ہے کوئی قوم شرک پر جتنی شدت سے اصرار کرتی ہے اتنا ہی اس کا معاشرہ بگڑتا ہے کیونکہ شرک نت نئے خداؤں کی تشکیل کے ذریعہ قوم کو ہر گناہ اور ہر جرم کا جواز مہیا کرنے کی سہولت دیتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں چوری، ڈاکہ زنی، جوا اور قمار بازی، زنا اور شہوت رانی، کذب و افتراء، دھوکہ فریب وغیرہ جرائم اور معاصی کو مشرک معاشروں میں مذہبی اور قانونی سرپرستی ملتی آئی ہے ان سماجی برائیوں کے نتیجہ میں ظلم پروان چڑھتا ہے جو قوم کے اندر بھی سرطان کی طرح پھیل جاتا ہے اور قوم کے باہر سیاسی اقتصادی، تجارتی تعلقات میں بھی نظر آتا ہے ظلم کے نتیجہ میں عدل ختم ہو جاتا ہے اور معاشرتی عدم توازن پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اعلیٰ اور سیاسی طبقہ کے لوگ خود کو اپنے بنائے ہوئے قانون سے بھی بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور کمزور مجبور اور بے کس لوگ ظلم کی چکی میں پسنے لگتے ہیں مگر اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے کیونکہ کسی بھی قسم کا احتجاج خلاف قانون ہوتا ہے اور اسے خلاف تہذیب باور کیا جاتا ہے۔

عاد کے سربراہ اور چودھریوں کو قرآن حکیم میں جبارین (الشعراء ۲۶: ۱۳۰) کہا گیا ہے یعنی زبردست زورآور گردن کش اہل ظلم و جور امام طبری (جامع البیان ۸/۱۹: ۳۷۷) نے جبارین کے معنی بتائے ہیں وہ لوگ جنہیں اقتدار اور سطوت مل جاتی ہے تو وہ بے گناہ لوگوں کے قتل عام پر تل جاتے ہیں اس وقت جبارین ہتھیاروں اور کوڑوں سے بے گناہ لوگوں کے قتل عام پر کمر باندھ لیتے ہیں اور گرفت میں آجانے والوں پر کوڑے برساتے ہیں جب یک گمراہ معاشرہ ظلم و فساد کے اس مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے تو یہ انقلاب کا نقطہ ہوتا ہے انقلاب مثبت بھی ہو سکتا ہے اور منفی بھی اختیار خود اسی قوم کو دیا جاتا ہے۔

نبوت کا انقلابی رخ

اس انقلاب کی معاشرتی ضرورت اور روحانی قیادت کے اظہار کا نام قرآنی اصطلاح میں نبوت ہے غلط کار قوم تبدیلی اور اصلاح کی اس دعوت کو قبول کر لے تو تہذیب کا مثبت معیار قائم کرتی ہے قبول نہ کرے تو عذاب کی مستحق ٹھہرتی ہے قوم عاد کی بھاری اکثریت نے دوسری صورت پسند کی عاد کا ظلم و جور مستزاد تھا ان کے شرک اور گمراہی کے غرور کے عالم میں انہوں نے عذاب طلب کرنے کی حماقت کی عذاب کا آغاز پہلے تہدید و تنبیہ کے طور پر ہوا کہ تین سال تک پوری قوم میں نہ تو کوئی ولادت ہوئی اور نہ بارش کا ایک قطرہ آسمان سے ٹپکا (ابن ابی الدنیا/ العقوبات: ۴۱) اس وقت حضرت ہودؑ نے قوم کو مشورہ دیا (ھود ۱۱: ۵۲) کہ اللہ سے استغفار اور توبہ کرو تو چھاجوں پانی بھی برسے گا اور تمہاری تناسلی قوت بھی لوٹ آئے گی (پانی پتی /مظہری ۳۶: نسفی /مدارک ۲: ۱۳۱، مفتی محمد شفیع/ معارف القرآن ۴: ۶۴۱) مال، مویشیوں، زراعت اور قومی عزت میں اضافہ ہوگا۔ (آلوسی/روح المعانی ۱۲: ۸۱) اس کے جواب میں روسائے قوم نے گستاخانہ لہجہ اختیار کیا اور اپنے دیوتاؤں کو چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا مگر قحط سالی کے اس ہلکے عذاب سے قوم عاجز آ چکی تھی تو روسائے قوم نے قیل ابن عنز کی سرکردگی میں ۷۰ لوگوں کا ایک وفد مکہ روانہ کیا تاکہ وہاں حضرت آدمؑ کے تعمیر کردہ کعبۃ اللہ میں بارش کے لیے دعا کریں۔

مکہ پہنچ کر وفد کو اپنے سفر کا مقصد ہی یاد نہ رہا۔ بالآخر ایک مہینہ تک عیش شبانہ روز میں کھوئے ہوئے وفد کو رئیس مکہ کی دو گانے والی کنیزوں نے مقصد سفر یاد دلایا تو وفد کو بارش کی دعا کا ہوش آیا، اس دعا کے نتیجہ میں آسمان پر تین بادل نمودار ہوئے ایک سفید ایک سرخ اور ایک سیاہ اور غیب سے آواز آئی کہ ان میں ایک بادل منتخب کر لو عاد کے سربراہ وفد قیل ابن عنز نے سیاہ بادل منتخب کیا کہ کالی گھٹا خوب برساؤ ہوتی ہے (طبری/جامع البیان ۵/۱۲:۵۱۲: ابن کثیر ۸:۲۹۲) غیب سے دوسری آواز آئی کہ سیاہ بادل عادیوں میں سے کسی کو نہ چھوڑے گا۔ اور سب غارت ہوں گے وہ سیاہ بادل قوم عاد کے ایک میدان میں پہنچا جس کا نام المغیث تھا اسے دیکھ کر لوگوں نے خوشیاں منائیں کہ یہ بادل ان پر برسے گا مگر حضرت ہودؑ نے کہا یہ وہی دکھ پہنچانے والا عذاب ہے جس کا تم نے مطالبہ کیا تھا (ابن ابی الدنیا/ العقوبات ۴۰ پانی پتی/ مظہری ۱۰:۳۰۷) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مھدد نامی ایک عورت بادل کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئی ہوش میں آکر اس نے بتایا کہ ہوا کی شکل میں آگ کا بگولہ تھا . یہ فرشتے دھکا رہے ہیں اور گھسیٹے چلے آرہے ہیں (طبری/جامع البیان ۵/۱۲:۵۱۲: ابن کثیر ۸:۲۹۰۔۲۹۱: آلوسی /روح المعانی ۲۶:۲۷: ابن ابی الدنیا/العقوبات ۴۰)

ہولناک عذاب کی منظر کشی

بادل میں آگ کا بگولہ آندھی بنا اور ہر شے ہوا میں اڑنے لگی تو عاد کو عذاب اور تباہ کاری کا اندازہ ہوا۔ باد سموم کی شدت اور زہرناکی کا یہ عالم تھا کہ ریتیلی ہوا ان کی ناکوں کے ذریعے جسم میں داخل ہوتی اور بدن کو کاٹتی ہوئی فضلہ گاہوں سے باہر نکلتی تھی۔ (اندلسی/ بحر المحیط ۵: ۲۳۳) گھبرائے بولائے وہ سارے لوگ اندھا دھند بھاگے اور گھروں میں جا چھپے اور کھڑکیوں دروازوں کو تیغہ کر کے بیٹھ گئے مگر آندھی نے دروازے اکھاڑ پھینکے لوگوں کو زمین پر دے پٹکا اور مجرم قوم اپنے گھروں سمیت ریت کے اندر دفن ہوگئی وہ آندھی آٹھ دن سات رات مسلسل چلتی رہی مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ عاد کی سواریاں،

کارخانے، مویشی اور کوچ گاہیں (ظعینہ) سب پروں کی مانند زمین آسمان کے بیچ اڑ رہے تھے انسان اور جانور ہوا میں اڑکر آسمانی فضا تک جاتے پھر وہاں سے اوندھے منہ گرتے کہ سر الگ گرتا اور دھڑ الگ سارے کے سارے ایسے ہو گئے جیسے کھجور کے تنے الگ ہوں اور شاخیں الگ۔ ہوا نے اول سنگباری کی جس سے کفار کے تکبر سے بھرے ہوئے دماغ پھٹ گئے مذحجی سواروں کو سواریوں سمیت اڑا کر اوپر لے جاتی اور پھر زمین پر پٹخ دیتی تھی آندھی کے ہولناک زناٹوں کے ساتھ آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی یہاں تک کہ بے مثال مادی قوت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک و برباد ہوگئی (ابن کثیر ۸:۲۸۹۔۲۹۱: آلوسی/روح المعانی ۲۶:۲۴۔۲۶ پانی پتی /مظہری ۱۰:۳۰۷ مفتی محمد شفیع/معارف القرآن ۴:۶۴۲) سب ایک ہی وقت میں اس طرح ہلاک ہو گئے جیسے ایک ہی گھر کے اندر ہوں (اندلسی /بحر المحیط ۸:۶۵)

قرآن حکیم میں اس آندھی کو حسوماً (الحاقہ ۶۹:۷) کہا گیا ہے جس کا مطلب ایسی ہوا ہے جس میں ہر چیز گردش میں آگئی تھی (طبری/جامع البیان ۱۲/۵:۵۱۸) ابن ابی الدنیا (العقوبات: ۴۰) نے حسوما کا مطلب جڑ کاٹنے والی بتایا ہے سات دن بعد آندھی نے ابناروں ریت کے اندر مدفون لوگوں کے بدنوں سے مٹی اڑائی اور ہوا کے جھکڑوں نے ان کی لاشوں کو اڑا کر سمندر میں جا پھینکا یہاں تک کہ فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ (الاحقاف ۴۶:۲۵)= ان کے گھروں کے کھنڈروں کے سوا دیکھنے کو کچھ باقی نہ رہا (بغوی /معالم التنزیل ۴/۷:۲۶۴ بیضاوی /انوار التنزیل ۵:۱۸۴) اسی وجہ سے احقاف کے علاقوں میں عاد کے آثار اور پتھرائی ہوئی ہڈیاں نہیں ملتیں حالیہ کھائیوں میں معلوم ہوا ہے کہ عاد کی بستیاں چھ سو فٹ اونچے ریت کے تودوں کی تہوں میں دفن ہیں

صرصر اور صبا کا رمز

جتنی مدت آندھی چلتی رہی حضرت ہودؑ اور تقریباً چار ہزار مومنین سمندر کے کنارے ایک

باغ کے احاطہ (حظیرہ) میں بیٹھے تھے اور وہاں عاد کی بادِ سموم صرصران کے لیے بادِ صبا بن گئی تھی جس کے نرم جھونکے اہل ایمان کے لیے فرحت بخش تھے (طبری/جامع البیان ۵/۱۲:۵۱۲)
ہزار ہا سال بعد یہی کیفیت مومنین محمدیؐ نے جنگ خندق کے خاتمہ کے وقت چلنے والی آندھی کے موقعہ پر بھی تجربہ کی تھی: خندق کے پار آندھی کے جھکڑ اور بلا کی گرمی تھی اور مدینہ منورہ کی سمت بادِ صبا کے جھونکے اور خنک موسم تھا (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ / تاریخ ابن کثیر اردو ۲:۵۰۸)

بس ایک ہفتہ کے اندر سالہا سال اور کئی نسلوں کی انسانی محنت سے بنائی ہوئی تہذیب و تمدن، فوجی طاقت، سیاسی استیلاء و اقتدار، تجارت و اقتصاد سب کچھ بھولی بسری کہانی بن گیا۔

اپنے مادی علم و تہذیب و تمدن اور ترقی کے بارے میں انسان کی یہ احمقانہ خوش گمانی قوم عاد کی تباہی کے ساتھ ختم نہیں ہو گئی تھی ہر تہذیب اپنی انتہا پر اسی گمان میں رہتی ہے کہ اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا صدہا صدیوں سے انسان یہی ایک فرسودہ کہانی دوہراتا چلا آرہا ہے اور جب تمدنی ترقی کے کسی اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس تہذیب کے غلاموں کو خیال ہونے لگتا ہے کہ اس جیسا اس دنیا میں کبھی کوئی آیا تھا نہ آئے گا وران کی تہذیب کو کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (الشعراء ۲۶:۱۲۹) = گویا تم ہمیشہ رہو گے اور ایسے ہی رہو گے۔

اگر انسان کا یہ خیال درست ہوتا تو دنیا تہذیبوں کی تاریخ نہ پڑھا کرتی۔

کتابیات

۱ القرآن الحکیم

۲ البقرہ ۲ النساء ۴ الانعام ۶ لاعراف ۷ الانفال ۸ ھود ۱۱ الاسراء ۱۷ الکھف ۱۸ الشعراء ۲۶ النمل ۲۷ الاحزاب ۳۳ فاطرہ ۳۵ المؤمن/غافر ۴۰ فُصّلت ۴۱ الاحقاف ۴۶ الفتح ۴۸ الذاریت ۵۱ القمر ۵۴ الحاقہ ۶۹ الفجر ۸۹

۳ بائبل، توراۃ

۴ بائبل، انجیل

۵ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ تفسیر ابن عباس اردو حافظ محمد سعید احمد عاطف) مکی دارالکتب لاہور ۲۰۰۹ء

۶ طبری، امام ابن جریر، جامع البیان فی تاویل القرآن موسسۃ الرسالہ۔ بیروت ۲۰۰۰ء

۷ بغوی امام حسین ابن مسعود، معالم التنزیل دارطیبہ، بیروت ۱۹۹۷ء

۸ رازی، امام فخرالدین مفاتیح الغیب انٹرنیٹ اشاعت

۹ قرطبی، امام محمد الانصاری۔ الجامع الاحکام القرآن

۱۰ بیضاوی، امام عبداللہ انوارالتنزیل دارالفکر، بیروت

۱۱ نسفی، امام عبداللہ مدارک التنزیل وحقائق التاویل (اردو مولانا شمس الدین) مکتبہ العلم لاہور

۱۲ اندلسی، امام ابوحیان، بحرالمحیط دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۳ء

۱۳ ابن کثیر، حافظ عمادالدین۔ تفسیر ابن کثیر (اردو محمد جونا گڑھی) مکتبہ قدوسیہ لاہور ۲۰۰۶ء

۱۴ سیوطی، امام جلال الدین/محلی امام جلال الدین جلالین (اردو، مولانا محمد جمال بلند شہری/ جمالین فی شرح جلالین) پبلشرز کراچی ۲۰۱۱

۱۵ پانی پتی، امام قاضی محمد ثناءاللہ عثمانی۔ تفسیر مظہری دارالاشاعت کراچی ۱۹۹۹ء

۱۶ آلوسی، امام محمود روح المعانی داراحیاء التراث العربی بیروت

۱۷ تھانوی، مولانا اشرف علی۔ بیان القرآن ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۲۶ھ

۱۸ عثمانی، مولانا شبیراحمد تفسیر عثمانی دارالاشاعت کراچی ۲۰۰۷ء

۱۹ یوسف علی، عبداللہ دی ہولی قرآن، انٹرنیٹ ایڈیشن

۲۰ کاندھلوی ، مولانا محمد ادریس معارف القرآن مکتبہ المعارف شہداد پور سندھ پاکستان ۱۴۲۲ھ

۲۱ شفیع، مولانا مفتی محمد معارف القرآن ادارۃ المعارف کراچی ۲۰۰۵ء

۲۲ طبری، امام ابن جریر، تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری اردو) دارالاشاعت کراچی ۲۰۰۳)

۲۳ ابن خلدون تاریخ العمر نفیس اکیڈیمی کراچی ۲۰۰۳ء

۲۴ ابن ابی الدنیا، العقوبات (اردو عذاب الٰہی اور اس کے اسباب) بیت العلوم لاہور

۲۵ حموی، یاقوت، معجم البلدان دار صادر بیروت ۱۹۷۷ء

۲۶ ابن کثیر، ابوالفداء البدایہ والنھایہ (تاریخ/اردو) دارالاشاعت، کراچی ۲۰۰۸ء

۲۷ ندوی، مولانا سید سلیمان تاریخ ارض القرآن دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء

۲۸ غازی، مولانا حامد الانصاری۔ اسلام کا نظام حکومت، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۴۳ء

۲۹ سیوہاروی، مولانا حفظ الرحمٰن قصص القرآن، دارالاشاعت کراچی ۱۹۷۲ء

۳۰ Erich von Daniken, Chariots of the Gods. 1999 Berkley Books New York Nicholas Clapp. The Road to Ubar 2000 Souvenir Press London

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

ژاک لاکاں (Jacques Lacan)

ژاک لاکاں پیدائش ۱۳ اپریل ۱۹۰۱ء وفات ۹ ستمبر ۱۹۸۱) نے ابتدائی تعلیم پیرس میں حاصل کی۔ اس کا والد صابن اور تیل کا تاجر تھا۔ ژاک لاکاں فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تھا لیکن اس کی جسمانی کمزوری سدِ راہ بن گئی۔ اس کے بعد اس نے میڈیکل کے شعبے کا انتخاب کیا۔ میڈیکل کی تعلیم امتیازی حیثیت سے مکمل کرنے کے اس نے سائیکاٹری میں اختصاصی مہارت حاصل کی اور ۱۹۳۱ء میں ایک سائیکاٹرسٹ کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کی شادی ۱۹۳۴ء میں میری لوزی (Marie Louise) سے ہوئی جو نہایت کامیاب رہی اور اس کے تین بچے پیدا ہوئے جن کی تعلیم و تربیت میں اس کی بیوی نے اہم کردار ادا کیا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے ژاک لاکاں کو نفسیات اور فلسفے کے مضامین سے گہری دلچسپی تھی۔ زمانہ طالب علمی کے اس دور میں اس نے ممتاز ماہر نفسیات اور بابائے تحلیل نفسی سگمنڈ فرائڈ ۱۹۳۹۔۱۸۵۶ (Sigmund Freud) کی تصانیف کا عمیق مطالعہ کیا اور اس سے گہرے اثرات قبول کیے۔ تیورالوجی، سائیکوتھراپی اور تحلیل نفسی میں ستاروں پر کمند ڈالنے والے آسٹرین دانشور سگمنڈ فرائڈ نے لاشعور اور بچوں کی جنس کے موضوع پر جو تھیوری پیش کی اسے بیسویں صدی کی اہم ترین تھیوری کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۳۰ء میں سگمنڈ فرائڈ کو گوئٹے پرائز ملا۔ سگمنڈ فرائڈ کی شخصیت اور اس کے تحلیل نفسی کے نظریے کے بارے میں ژاک لاکاں نے کچھ مضامین بھی لکھے جنھیں قارئین نے بہت سراہا۔ سگمنڈ فرائڈ سے عقیدت کی بنا پر ۱۹۳۶ء میں فرائیڈین تحلیل نفسی تحریک (Freudian Psychoanalytical Movement) سے وابستہ ہو گیا۔ وہ اس تحریک کا انتہائی فعال، مستعد اور سرگرم کارکن تھا لیکن اس کی حق گوئی اور بے باکی اس کے ناقدین کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی

تھی اور وہ اسے اپنی راہ سے ہٹانے کی ہر وقت سازشوں میں لگے رہتے۔ایک راسخ العقیدہ محقق، زیرک نقاد، رجحان ساز فلسفی اور باکمال ماہر نفسیات کے طور پر اس کی پہچان ہو چکی تھی۔اپنے اصلی اور بنیادی مباحث، باریک بینی پر مبنی استدلال نفسیاتی تجزیہ کی تھیوری کے موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھ کر اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اس نے جو طرز ادا اختیار کی اس کی اوروں سے تقلید بھی ممکن نہ تھی۔اس کے حاسدوں نے جب اس کے تخیل کی جولانیوں اور فقید المثال کامرانیوں کو دیکھا تو وہ دل ہی دل سے جلنے لگے۔بے کمال لفاظ حشرات ادب ہر دور میں اہل کمال کے درپئے آزار رہے ہیں۔ژاک لاکاں کو معاشرے میں جو عزاحترام کا مقام نصیب ہوا، اسے دیکھ کر سب بے کمال سنگِ ملامت لیے نکل آئے اور اس کے درپئے پندار ہو گئے۔ان انتہائی تکلیف دہ حالات میں اُسے بین الاقوامی تحلیل نفسی ایسوسی ایشن سے الگ کر دیا گیا۔ژاک لاکاں نے جب تیر کھا کر کمیں گاہ کی جانب نظر دوڑائی تو اپنے ہی دستوں سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ سے اپنی قلبی وابستی اور والہانہ عقیدت کی وجہ سے ۱۹۶۴ء میں ژاک لاکاں نے پیرس میں اپنی ایک تنظیم قائم کی جس کا نام ایکول فرائیڈین (Ecole Freudienne) رکھا۔ سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی پر تحقیق وتنقید وتوضیح اس کی زندگی کا نصب العین بن گیا۔اس کے مقالات کا مجموعہ ایکرٹس (Ecrits) ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔اس کی کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی وہ شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر جا پہنچا اور پوری دنیا میں اس کے اشہب قلم کی جولانیوں کی دھوم مچ گئی۔اس کا مشارنہ صرف فرانس بلکہ پوری دنیا کے انتہائی بااثر اور رجحان ساز دانش وروں میں ہونے لگا۔ژاک لاکاں کی اس معرکہ آرا کتاب کا شمار بیسویں صدی میں شائع ہونے والی دنیا کی سو (۱۰۰) سب سے زیادہ موثر اور مقبول کتب میں ہونے لگا۔اس کتاب کے تراجم دنیا کی بڑی زبانوں میں کیے گئے اوران تراجم کی اشاعت سے نئے مباحث کا آغاز ہوا۔اس کی مشہور کتاب ایکرٹس (Ecrits) کا انگریزی زبان میں ترجمہ سب سے پہلے ایلن شریڈن (Alan Sheridan) نے ۱۹۷۷ء میں کیا۔اس کے بعد بروس فنک (Bruce Fink) نے بھی اسے انگریزی کے

قالب میں ڈھالا، یہ ترجمہ ۲۰۰۶ء زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آیا اور اسے عالمی سطح پر بے حد پذیرائی نصیب ہوئی۔ لسانیات کے نہایت اہم اور وسیع شعبے میں پس ساختیاتی فکر کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ژاک لاکاں کی خدمات کا ایک عالم معترف تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ژاک الاکاں کو غیر متوقع پریشانیوں اور ذہنی صدموں سے دو چار ہونا پڑا۔ عالم پیری میں جب اس کے اعضا مضمحل ہو گئے اور عناصر میں اعتدال عنقا ہو گیا تو کئی مار آستین اس پر ٹوٹ پڑے اور متعدد سانپ تلے کے بچھو اپنی نیش زنی سے اسے اذیت دینے لگے۔ یہ سب اس کے کینہ پرور، پُر عناد اور احسان فراموش شاگرد تھے جن کے بے قرینہ اور ناروا سلوک نے اس حساس تخلیق کار کی روح کو زخم زخم اور دل کو کرچی کرچی کر دیا۔ ایسے چربہ ساز، سارق، کفن دزد و قماش مسخرے جب حادثۂ وقت کے نتیجے میں غاصبانہ طور پر جام پر قابض ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو مے خانے کی توہین، رندوں کی ہتک اور انسانیت کی بے توقیری اور توہین و تذلیل ان کا وتیرہ بن جاتا ہے۔ ان محسن کش متفنی شاگردوں کا بڑھتے ہوئے منحرف المرکز رویے نے ژاک لاکاں کی زندگی اجیرن کر دی۔ ایام گزشتہ کی کتاب کی ورق گردانی کرتے وقت جب وہ ان شاگردوں پر اپنے الطاف و عنایات اور مروت و شفقت کا احوال دیکھتا تو اس کی آنکھیں بھگ بھیگ جاتیں۔ اگرچہ یہ المیہ اس کے لیے سوہان روح بن گیا تھا اس کے باوجود اس نے اپنے غم کا بھید کبھی نہ کھولا اور اس موضوع پر لب اظہار پر تالے لگا لیے۔

یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ قحط الرجال کے موجودہ دور میں اس بے حس معاشرے میں زیرک اور رجحان ساز دانش وروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ جب جاہل اپنی جہالت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وقت کے اس حادثے کو کس نام سے تعبیر کیا جائے۔ ان لرزہ خیز اور اعصاب شکن حالات میں ژاک لاکاں کو بھی سنگِ ملامت برداشت کرنے پڑے۔ سگمنڈ فرائڈ کے جس ماہر نفسیات کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا وہ ژاک لاکاں ہے اُسے تحلیل نفسی کے انتہائی متنازعہ ماہر کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ

موجود ہے کہ جہاں تک قارئین میں مقبولیت کا تعلق ہے ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ سگمنڈ فرائڈ کی اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن ایک فرائیڈین کی حیثیت سے جو شہرت اور مقبولیت ژاک لاکاں کے حصے میں آئی اس میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں۔ سگمنڈ فرائڈ کی تھیوری کو اپنے فکری سفر میں زادِ راہ بنانے والے اس نابغۂ روزگار دانش ور نے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند منصب تک رسائی حاصل کی اور جریدۂ عالم پر اس کا دوام ثبت ہو گیا۔ ژاک لاکاں کا خیال تھا کہ لاشعور کی تشکیل بھی بالکل اسی انداز میں ہوئی ہے۔ جس طرح زبان کی تشکیل ہوئی ہے۔ داخلی احتیاج ایک تخلیق کار کو ایسے قلبی اور روحانی اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے کہ جو اسے تخلیقِ فن پر مائل کرتا ہے۔ اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ سیرِ جہاں کے دوران اس کی جانِ ناتواں پر جتنے بھی موسم اترے ہیں وہ انھیں پیرایۂ اظہار عطا کرے۔ تخلیقِ ادب میں ایک تخلیق کار کی شعوری سوچ اور گہرے غور و خوض کا بے حد اہم کردار ہے جسے تحلیل نفسی کے ماہرین نے تخلیقی فعالیت کے لیے کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ تخلیق کار کی تخلیقی فعالیتیں اپنی اصلیت کے اعتبار سے نئے اور متنوع تجربات کے ابلاغ کو یقینی بنانے کا وسیلہ ہیں۔ اس نے سگمنڈ فرائڈ کے تصور کو آگے بڑھا کر اسے حیاتیاتی عمل سے لسانیات کی اساس پر استوار کرنے کی سعی کی۔ اس نے نفسیاتی موضوعات Id Ego Super Ego کو تحلیل نفسی منداز میں پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ژاک لاکاں نے تحلیل نفسی کی بنیاد پر جو تنقید لکھی وہ اس کا منفرد تجربہ تھا جسے عالمی سطح پر زبردست پذیرائی نصیب ہوئی۔ سگمنڈ فرائڈ نے ذہن کو شعور اور لاشعور میں تقسیم کیا ژاک لاکاں نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی پس ساختیات سے متعلق اس نے بیگانگی، موضوعیت، جنسی اختلافات، محرکات، قانون اور تفریح جیسے موضوعات پر نہایت دل نشیں اندا میں اپنے خیالات پیش کیے۔ بیسویں صدی کے فرانسیسی فلسفے، سوشیالوجی، تانیثیت، ادب، فنون لطیفہ نفسیات بالخصوص تحلیل نفسی پر ژاک لاکاں نے جن خیال افروز مباحث کا آغاز کیا، پوری دنیا میں اس کی بازگشت سنائی دی۔ ژاک لاکاں نے واضح کر دیا کہ متن فنا کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ

to the choice of sex akin to death and, on the whole, rather inhumn Diana perhaps...Actaeon too guilty to hunt goddess prey in which is caught o huntsman the shadow that you became let the pack go without hastening your step. Diana will recognize the hounds for what they are worth" (2)

ژاک لاکاں نے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ اس علام آب و گلِ میں ہر مرحلۂ زیست پر صداقت کی اثر آفرینی کا غلغلہ ہے۔ صداقت کی اقلیم کو اندیشۂ زوال نہیں۔ ژاک لاکاں نے یہ بھی واضح کیا کہ تحلیل نفسی کے اعجاز سے سماجی زندگی کا وسیع تر تناظر میں مطالعہ ممکن ہے۔ اس میں دیگر سماجی نظریات کی نسبت کہیں زیادہ وسعت، تنوع اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ تحلیل نفسی ہمیں جانچ پرکھ کی قوی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ لاشعوری خواہشات کے طلسم کا اسیر ہو جانے کے اسباب کی گرہ کشائی تحلیل نفسی ہی سے ممکن ہے۔ نیرنگیٔ زمانہ اور ہر عقدۂ تقدیر جہاں کی تفہیم میں تحلیل نفسی کلیدی کردار ادا کرتے ہے۔ رخش عمر مسلسل رو میں ہے اور انسان کا ہاتھ نہ تو باگ پر ہے ورنہ ہی اس کا پاؤں رکاب میں ہے۔ شقاوت آمیز ناانصافیوں اور ہلاکت خیزیوں کے موجودہ زمانے میں فرد کی بے چہرگی اور عدم شناخت کا مسئلہ روز بروز گھمبیر صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ان لرزہ خیز او اعصاب شکن حالات میں تحلیل نفسی زندگی کا وسیع تر تناظر میں جائزہ لینے کی راہ دکھاتی ہے۔ ژاک لاکاں نے اپنے تجزیاتی مطالعہ سے یہ واضح کر دیا کہ سائیکی کس طرح افراد کے فکر و خیال کی دنیا پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے زیر اثر افراد کی فعالیت کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ زندگی کے مختلف پیچیدہ مراحل پر سائیکی جس انداز میں رنگ جماتی ہے ژاک لاکاں نے اپنے تجربات، مشاہدات اور تجزیات کے وسیلے سے اسے پرکھنے کی سعی کی ہے۔ انسانی تجربات کو ژاک لاکاں نے لسانی تناظر میں جانچنے کا منفرد تجربہ کیا جس کے نتائج پر وہ مطمئن تھا۔

ممتاز ماہر لسانیات سوئیر (۱۸۵۷۔۱۹۱۳ Ferdinaaaand de Saussure) کے خیالات پر ژاک لاکاں نے گرفت کی اور ان پر نظر ثانی کرتے ہوئے وہ دلیل دی کہ نشان مستحکم

نہیں ہوتا بلکہ ہکم تغیر پذیر رہتا ہے اور جہاں تک الفاظ اوران کے مفاہیم کا تعلق ہے یہ بھی تخمین وظن کی حیثیت رکھتے ہیں ژاک لاکاں نے لفظ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔اس چیز کوجس کی نمائندگی کے لیے لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے اسے ثانوی اہمیت کا حامل سمجھا۔ ایغو کے عکس کو زیر بحث لاتے ہوئے ژاک لاکاں نے بہت دلچسپ نتائج اخذ کیے۔اس نے آئینہ کواس مقصد کے لیے استعمال کیا اوراپنے موقف کی احسن طریقے سے وضاحت کی۔آئینہ کے مرحلے کا طریق کار ایک ایسا عمل تھا جس میں اس نے دو اقدار کو مدنظر رکھا پہلے درجے پر اس نے تاریخی قدر کو رکھا۔یہی وہ قدر ہے جو بچے کی ذہنی نشوونما میں فیصلہ کن مور ثابت ہوتی ہے۔اس کے بعد اس نے دوسری قدر کو رکھا جو بڑھتی ہوئی عمر اور جسم کی نشوونما ہے۔سوچ کے ساتھ ان کا جو چولی دامن کا ساتھ ہے ژاک لاکاں نے اسے اجاگر کیا ہے۔اس اہم تعلق کو متشکل کر کے ژاک لاکاں نے تحلیلِ نفسی کے موضوع پر اپنے خیالات کی موثر انداز میں وضاحت کی ہے ژاک لاکاں نے زبان کو اپنی شناخت کا وسیلہ سمجھا اور اپنی ذات کو لسانیات کی اتھاہ وسعتوں میں یوں ضم کر دیا کہ دونوں یک جان و قالب دکھائی دیتے ہیں۔اس نے اس بات پر اصرار کیا کہ جب بھی علم، ادب، لسانیات اور فلسفہ کے موضوعات پر تاریخی تناظر میں بات کی جائے گی تو یہ امر چنداں اہمیت کا حامل نہیں کہ اس کی ماضی میں کیا حیثیت تھی یا زمانہ حال میں وہ کس منصب پر فائز ہے یا اس وقت وہ کس مرحلۂ زیست سے گزر رہا ہے۔اور اسے کن مسائل اور دشواریوں کا سامنا ہے۔مورخ کو مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے کہ آنے والے دور میں تخلیق کار کے خیالات کو کس طرح سمجھا جائے گا۔اس کی ساری جدوجہد کا محور مستقبل کے لیے بہتر حکمتِ عملی مرتب کرنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے آئینہ گفتار کے ذریعے قاری کو آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے تاکہ اقتضائے وقت کے مطابق مستقبل کی فکری منہاج کے تعین کی اُمید بر آئے اور اصلاح احوال کی کوئی صورت نظر آئے۔

کثیر التصانیف ایک دانش ور کی حیثیت سے ژاک لاکاں نے اپنی وقیع تصانیف سے علم و ادب کی ثروت میں جو اضافہ کیا اسے تاریخ ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔اس کا پیچیدہ مگر

بصیرت افروز اسلوب قاری کو فکر و خیال کی حسین وادیوں کی سیر کراتا ہے۔ اس کی تحریر کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معانی کا طلسم ہے جس سے ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی کی کیفیت سامنے آتی ہے اور مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا۔ الغو الاصل فلسفیوں کے افکار کی عمارت کو پس ساختیات کے حرف صداقت کے تیشے سے منہدم کرنے میں ژاک لاکاں نے جس انہماک کا مظاہرہ کیا وہ اس کا بہت بڑا اعزاز و امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ سگمنڈ فرائڈ کے بعد ژاک لاکاں نے تحلیل نفسی پر سب سے زیادہ وقیع کام کیا۔ تاریخ ہر دور میں اس کے اہم کام اور عظیم نام کی تعظیم کرے گی۔ ژاک لاکاں کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں۔

(1) Anxity (2) Ecrits (3) The Seminar of Jacques Lacan 10 Valumes, (4)The Triumph of Religion (5)On the name of Father (6) The four fundamental concepts of psycho-Analysis. (7) The Ethics of psycho-Analysis (8) My Teaching

ژاک لاکاں نے پامال راہوں سے بچ کر اپنے لیے ایک نیا اسلوب منتخب کیا۔ اس نے فکر انسانی کی پرواز، تخیل کی جولانیوں اور مستعمل علامات میں ایک واضح فرق کی جانب متوجہ کیا۔ معاصر تنقیدی تھیوری پر ژاک لاکاں کے تصورات کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ژاک لاکاں کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ اس نے فرائڈ کے نظریات کی توضیح کو نصب العین بنایا۔ وہ خود کو فرائڈین سمجھتا تھا اور اس پر وہ مطمئن بھی تھا لیکن اس کے نظریات صرف فرائڈ تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ فرائڈ کے نئے مطالعات پیش کر کے از سرِ نو اس کے نظریات کے بارے میں متنوع مباحث کا آغاز کرتا ہے۔ اس کا یہ اسلوب اپنی الگ شناخت رکھتا ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لاکانین مکتبۂ فکر ہے جس میں نئے زمانے نئی صبح و شام پیدا کرنے کی بت کی گئی ہے۔ پس ساختیات کے مباحث میں اس کا دبنگ لہجہ اس کی مستحکم شخصیت کی پہچان ہے۔ ژاک لاکاں نے اپنے ذہن و ذکاوت کی جولانیوں سے ایک موزوں لسانی ماڈل کا تصور پیش کیا جس کے وسیلے سے سماجی زندگی کے جملہ نشیب و فراز اور ارتعاشات کا احاطہ ممکن ہے اور معاشرے میں انسانی

اس کی تاثیر قاری کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ اپنے ڈسکورس کے بارے میں ژاک لاکاں نے لکھا ہے:

"My discourse proceeds in the following way sustained only in its topological relation with others"(۳)

ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کے نظریۂ لاشعور کی وضاحت کی اور اس کے بعد اسی کی اساس پر اپنے منفرد انداز میں لاشعور کو پیش کیا۔ سگمنڈ فرائڈ کے بحرِ خیالات کا پانی اس قدر گہرا تھا کہ وہ خود بھی اس کی غواصی کر کے لاشعور کے بارے میں حقائق کے گہر ہائے آب دار برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ژاک لاکاں نے زندگی بھر سگمند فرائڈ کے تصورات تک رسائی اور ان کی تفہیم کی مقدور بھر کوشش کی۔ سگمنڈ فرائڈ کے وہ تصورات جن کی گُتھیاں سُلجھانے میں خود سگمنڈ فرائڈ کو بعض پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کے باعث تامل رہا، ژاک لاکاں نے ان پر از سر نو غور و خوض کیا، نئے مطالعات پر توجہ دی اور متعدد نئے مباحث کا آغاز کیا۔ سگمنڈ فرائڈ کے ساتھ ژاک لاکاں کی والہانہ محبت اور قلبی وابستگی بھی عجب گُل کھلاتی ہے جو بعض اوقات آشفتہ سری کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ جب وہ سوز و ساز کے عالم میں ہو تو سگمنڈ فرائڈ کے تعریف و توصیف اور تشریح و تفہیم کے نادر پہلو زیرِ بحث لاتا ہے اور جب اس پر پیچ و تاب کی کیفیت کا غلبہ ہو تو وہ سگمنڈ فرائڈ کے متن کی تشریح کے دوران نہ صرف اصل متن کو پس پشت ڈال دیتا ہے بلکہ اس پر تنقید بھی کرتا ہے اور اپنا الگ زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ مروج تنقیدی نظریات کے بارے میں ژاک لاکاں نے ہمیشہ اپنے تحفظات کا برملا اظہار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تمام نظریات رومانویت اور رجعت پسندی کی اساس پر استوار ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ فکر و خیال کو ان کے حصار سے نجات دلا کر لامحدود وسعتوں سے آشنا کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اپنے خیالات کی تونگری، جدت اور تنوع کو بروئے کار لاتے ہوئے ژاک لاکاں نے لاشعور اور زبان کے امتزاج سے متکلم موضوعات کا جو نظریہ پیش کیا وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نے افکارِ تازہ کی مشعل تھام کر سفاک ظلمتوں کو کافور کر کے جہانِ تازہ کی جانب فکری سفر جاری رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ لاشعور کی تفہیم پر بالعموم سنجیدہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اس نے سگمنڈ فرائڈ کے نظریۂ لاشعور کے بارے میں پائے جانے

والے اختلاف آرا کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ اس کا کہنا ہے۔

"The Freudan unconcious has nothing to do with these called forms of unconcious that preceded it, not to say"

ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کی از سر نو توضیح کر کے ان جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔ سگمنڈ فرائڈ نے لاشعور کو متشکل کرنے کی جو کاوش کی وہ ایک منفرد سوچ کی مظہر ہے۔ لاشعور کی ساخت کا حوالہ دے کر سگمنڈ فرائڈ نے فکر و نظر کے نئے دریچے وا کر دیئے۔ سگمنڈ فرائد کے معاصرین اور اس کے بعد آنے والے دانش ور لاشعور کے اہم ترین موضوع پر اس کے خیالات کی اہمیت و افادیت کا احساس و ادراک نہ کر سکے۔ ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ لاشعور کے بارے میں صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"Freuds unconcious is not at all the romantic unconcious of imaginative creation it is not the locus of the divinties of night. This locus is no doubt not entirely unrelated to the locus towards which freud tums his gaze but the fact that jung who provides a link with the terms of the romantic unconcious should have been respudiated by freud is sufficient indication that pcho analysis is introducing something other...(۵)

سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ لاشعور کی وضاحت کرتے ہوئے ژاک لاکاں نے اس جانب اشارہ کیا کہ سگمنڈ فرائد کے معاصرین اور ناقدین اس کے اسلوب کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ لاشعور کے بارے میں سگمنڈ فرائڈ کے تصورات انتہائی پیچیدہ کیفیات کے مظہر ہیں۔ اس موضوع پر حقائق کی گرہ کشائی عام قاری کے بس سے باہر ہے سگمنڈ فرائڈ نے لاشعور کی ساخت کا جو منظر نامہ قاری کے سامنے رکھا ہے وہ اس قدر سوچ کا مظہر ہے کہ اسے پڑھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور لاشعور کی ہمہ گیر قوت اس پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا اور وہ

سوچنے لگتا ہے کہ کون سی اُلجھن کو سلجھانے کی سعی کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خوف فرائڈ
کے بحر تخیل کی گہرائی اس قدر تھی کہ وہ خود بھی اس کی غواصی کر کے وہاں سے گہر ہائے آب دار
برآمد نہ کر سکا اس نے لاشعور کی ساخت کا جو تصور پیش کیا وہ خود اس کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا۔
اس نے اساطیر اور مابعد الطبیعیات کا حوالہ دے کر اپنے لیے عافیت کی راہ تلاش کر لی اور قاری
سرابوں میں سرگرداں پھرنے پر مجبور ہو گیا۔ سگمنڈ فرائڈ نے لاشعور کے بارے میں جو خیالات پیش
کیے وہ اس کے فکری میلانات کے آئینہ دار تھے۔ اس کی علمی سطح فائقہ ان سے عیاں تھی لیکن عام
قاری کی اس تک رسائی ممکن نہ تھی۔ لاشعور کی دیوی کی جستجو میں تو ع سگمنڈ فرائڈ یقیناً کامیاب ہو
گیا لیکن اس دیوی کے بے پناہ حسن و جمال، جاہ و جلال، تاب و تواں اور حشر سامانیوں کی تاب نہ
لا سکا اور اس کے بعد محو استعجاب رہا۔ ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کے لاشعور کے بارے میں پیش
کیے گئے تصورات کی وضاحت اس انداز میں کی کہ اپنی گل افشانیٔ گفتار سے قاری کو ایک جہانِ تازہ
میں پہنچا دیا۔ ژاک لاکاں نے لاشعور کے مباحث میں زندگی کی جمالیاتی اور اخلاقی اقدار کو ہمیشہ
پیش نظر رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے اعجاز سے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔
ژاک لاکاں نے اس امر پر توجہ مرکوز رکھی کہ تخلیق فن کے لمحوں میں قارئین کے لیے راحت اور
مسرت کی جستجو کو شعار بنایا جائے اس سلسلے میں فرائڈ نے کہا تھا:

"انسان کی بنیادی خواہش یہ ہے کہ لذت یا خوشی حاصل کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے
کہ اس چیز کا انتخاب کیا جائے جس سے خوشی حاصل ہو۔" (۶)

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ژاک لاکاں نے اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کو
مثبت شعور و آگہی سے متمتع کرنے اور اس کے لیے مسرت اور راحت کی جستجو کو ہمیشہ اہم خیال کیا۔
وہ زندگی بھر ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے پرورش لوح و قلم میں مصروف رہا۔ اس
نے پس ساختیات اور تحلیل نفسی جیسے اہم موضوعات کو اپنے اسلوب کی اساس بنایا اور قارئین کے
لیے مسرت کی تلاش کا عمل جاری رکھا۔ ذہنی دباؤ اور اعصابی تناؤ کی کیفیت میں اس کی تحریریں

فکر و نظر کو مہمیز کر کے جمود کا خاتمہ کر کے سوچ بچار، سعی پیہم اور تحقیق، تنقید پر آمادہ کرتی ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ نے لاشعور اور تحلیل نفسی کے موضوع پر جن بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے، ژاک لاکاں نے اس کی تشریح کرتے وقت تمام اہم نفسیاتی امور کو پیش نظر رکھا۔ ورق ورق اور تہہ در تہہ موضوعات تک رسائی ایک کٹھن مرحلہ تھا لیکن ژاک لاکاں سگمنڈ فرائڈ کے ۱۹۲۰ء پیش کیے جانے والے لاشعور اور تحلیل نفسی کے چشم کشا تصورات کے اس مرحلے کو نہایت حسن اسلوبی سے طے کیا ہے۔ سگمنڈ فرائڈ نے فرد کی سائیکی کے مطالعہ کے دوسرے مرحلے میں ایک خاص انداز فکر اور نمونہ سامنے رکھا ہے۔ اس کے مطابق فرد کی سائیکی تین عوامل اڈ (id)، ایغو (Ego) ، اور سپر ایغو (Super ego) میں منقسم دکھائی دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے سگمنڈ فرائڈ نے جسے اڈ کا نام دیا ہے وہ ہی لاشعور سے قریبی تعلق رکھتی ہے تاہم ان تینوں کو باہم مربوط سمجھنا چاہیے، ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کی رحلت کے بعد نفسیات اور تحلیل نفسی کے موضوع پر فکر پرور مباحث کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے تحلیل نفسی جیسے اہم موضوع پر حقائق کی تفہیم کی راہ دکھائی۔ اس نے چشم بینا پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ تحلیل نفسی کے بارے میں پائے جانے والا ابہام دور کیا جائے اور اس بات کا تعین کیا جائے کہ تحلیل نفسی کیا نہیں ہے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ تحلیل نفسی کے موضوع پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا تحلیل نفسی سے کوئی تعلق بھی ہے۔ اس نے حقائق کی جستجو میں جس انہماک کا ثبوت دیا وہ اس کی ذہنی اُپج اور بصیرت کا ثبوت ہے۔

ژاک لاکاں کی تحریروں کے بارے میں عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ ان کی تہہ تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ژاک لاکاں جس شدت کے ساتھ سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کی تشریح و توضیح پر زور بیان صرف کرتا ہے، اس سے زیادہ شرعت کے ساتھ سگمنڈ فرائڈ کے نظریات پُر اسراریت کے پردوں میں نہاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان حالات میں قاری کسی واضح نتیجے تک پہنچنے کے بجائے تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے پر مجبور ہے۔ ایک ماہر نفسیات تحلیل نفسی کو موزوں طور پر فرد کے لاشعور کی کیفیت، تضادات

اور ارتعاشات کی تہہ تک پہنچتا ہے اور ان کے تدراک پر توجہ مرکوز رکھتا ہے لاشعور کے زیر اثر
شعور کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تحلیل نفسی میں انھیں کلیدی اہمیت کا حامل سمجھا
جاتا ہے۔ ایک تخلیقی فن کار محض فن ہی کو منصۂ شہود پر لانا اپنا نصب العین نہیں بناتا بلکہ اپنی تخلیقی
فعالیتوں اور بصیرتوں کے معجزنما اثر سے نئی صداقتوں تک رسائی کی نوید بھی سناتا ہے۔ روشن
مستقبل کے خواب دیکھنا کسے عزیز نہیں خوابوں کی خیاباں سازیاں فرد کو اپنی گرفت میں
لے لیتی ہیں۔ خواب سے خیال کا معاملہ بھی تحلیل نفسی کا اہم موضوع ہے۔ ژاک لاکاں
نے لاشعور کی بحث میں اس بات کی جانب توجہ مبذول کرائی کہ لاشعور کی تشکیل بھی اسی
انداز میں ہوتی ہے جس انداز میں زبان کی نمو کے عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔
ژاک لاکاں نے جدید لسانیات کے اصول وضوابط کی روشنی میں تحلیل نفسی کے مطالعہ کی
جس سعی کو اپنا نصب العین بنایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سوئیر نے نشان اور نشان نما کے
موضوعات پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ افکار تازہ کی مثال ہے جس سے جہان تازہ تک
رسائی کے امکانات سامنے آئے۔ اپنے مضمون " The insistence of letter in
the unconcious" میں ژاک لاکاں نے اس جانب اشارہ کیا ہے۔ یہ مضمون
ڈیوڈ لاج (David Lodge) کی تالیف (Modern Criticism and Theory)
میں شامل ہے۔ اپنے اس فکر انگیز مضمون میں ژاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کے لسانیات
کے بارے میں نفسیات اور لاشعور سے متعلق افکار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"Freud shows usn in every possible way that image s value as signifier has nothing whatever to do with what it signifies giving asan example Egyption Hieroglyphics in which it would bwe sheer buffoonery to pretend that in a given text the frequency of a vulture which isan aleph or a chick which is a vau and which indicates a form of the verb to be or a

plural prove that the text has anything at all to do with these omithological specimens freud finds in this script certain uses of the signifier which are lost in ours such as the use of determinatives where a categorical figure is added to the literal figuration of a verbal term but this is only to show us that even in this script the so called ideogram is a letter."(۷)

ژاک لاکاں نے اس انگارۂ خاکی کو وحدت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ہم مجبوروں پر مختاری کی تہمت ناحق لگا دی گئی ہے۔ قادر مطلق کی منشا کے مطابق فطرت کے تقاضوں سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک مسلسل عمل کا مظہر ہے۔ رخشِ عمر مسلسل رو میں انسان کا نہ تو ہاتھ باگ پر ہے اور نہ ہی اس کے پاؤں رکاب میں۔ کاروانِ ہستی کا تیز گام قافلہ رہ عدم کی جانب گامزن ہے۔ فرد کی زندگی میں تغیر و تبدل کا غیر مختتم سلسلہ جاری رہتا ہے جو متعدد تضادات اور ارتعاشات کا مظہر ہے۔ انسان اس دنیا میں مانند شرار آتا ہے اور اس کی ہستی ناپائیدار کسی بھی وقت دم دے کر اسے چنگاری کی طرح راکھ میں بدل سکتی ہے۔ انسان کو اپنی حقیقت اور اصلیت کا یقین ہونا چاہیے۔ اگر یقین عنقا ہونے لگے تو تہذیبی و تمدنی انتشار و انحطاط کو نوشتۂ تقدیر سمجھ لینا چاہیے۔ اسے یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ عالمِ وجود میں آتے ہی انسان سب سے پہلے لسانی عمل کا آغاز کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت نومولود کا رونا نہ صرف اس کی زندگی کی علامت ہے بلکہ طویل اور پیچیدہ لسانی عمل کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔ فرد کی فکری منہاج کے تعین و تفہیم میں لسانیات اور تحلیل نفسی کا کردار بہت اہم ہے۔ تحلیل نفسی کو ژاک لاکاں نے ایک ایسا وقیع اور آبرومندانہ آلے سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے وسیلے سے شخصیت اور لسانی معائر کی تفہیم ممکن ہے۔ اس نے سنجیدگی، متانت اور ثقاہت وشعار بنا کر حریت فکر کا علم بلند رکھا۔ اس نے جس بے تکلفی اور بے ساختگی، کو اپنے اسلوب کی اساس بنایا وہ اس کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ پس ساختیات اور لاشعور کے موضوعات پر اس کے افکار کی لامحدود وسعت ذہن و ذکاوت کو جلا بخشی ہے۔

ژاک لاکاں

تخلیق ادب کے بارے میں یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ تخلیق کار کے داخلی محرکات کی مطابقت تخلیقی عمل کو نمو بخشتی ہے۔ تخلیقی عمل کو اوج کمال تک پہنچانے میں متعدد لاشعوری محرکات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تخلیق فن کے لمحوں میں خون بن کر رگ سنگ میں اُتر جانے کی صلاحیت جذب دروں اور وجدان کی ایک لہر مرہون منت ہے۔ وجدان کی یہ لہر اس قدر مسحور کن ہوتی ہے کہ تخلیقی فن کار دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کی شان دل ربائی کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اظہار وابلاغ کی صورت میں الفاظ جو دھنک رنگ منظرنامہ پیش کرتے ہیں ان کے پس پردہ زبان وبیان پر خلاقانہ دسترس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ رنگ، خوشبو اور حسن وخوبی کے تمام استعاروں کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے۔ ژاک لاکاں نے ادب اور تحلیل نفسی کے موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس کی منفرد سوچ اور بصیرت کے مظہر ہیں۔ ژاک لاکاں نے ادب اور تحلیل نفسی کے بارے میں پہلے سے مروج ومقبول تصور کو لائق اعتنا نہ سمجھا۔ اکثر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ تحلیل نفسی کو ادب سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا جب کہ ادب کو تحلیل نفسی سے فیض یاب ہونے کے متعدد مواقع ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر فنون لطیفہ کی تخلیق، انا کی ماہیت اور تخلیق فن کے پس پردہ کار فرما لاشعوری محرکات کے بارے میں تحلیل نفسی ہی خضر راہ بن کر ید بیضا کا معجزہ دکھاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے عوض ادب تحلیل نفسی کو کچھ عطا کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہے۔ ژاک لاکاں نے اس تاثر کو یک طرفہ، ناکافی، مبہم اور ناقابل تسلیم سمجھتے ہوئے اپنا الگ نظریہ پیش کیا۔ اس نے یہ بات زور دے کر کہی کہ لاشعور کی خاص زبان کا مطالعہ یقیناً ممکن ہے۔ اس کے بعد ادب کا مطالعہ بھی لاشعور کے مطالعہ کے لیے اپنائے جانے والے خاص معائر کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اس وسیع وعریض کائنات میں حسن ودل کشی اور محبت کی کبھی کمی نہیں رہی۔ لیکن کائنات کے اسرار ورموز کی گرہ کشائی میں تا حال کامیابی نہیں ہو سکی۔ انسانیت کے وقار اور سر بلندی پر بالعموم توجہ نہیں دی گئی۔ سگمنڈ فرائڈ کے دور سے لے کر زمانہ حال تک انسانی زندگی کا محور وہ چیز نہیں رہی جو وقت کا اہم ترین تقاضا تھا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ فرد کی تحلیل نفسی پر اس قدر بھرپور

توجہ دی جائے کہ وہ اپنی حقیقت کا شناسا ہو سکے۔ ہر زبان کے ادب اور فنون لطیفہ میں تحلیل نفسی کو لاشعور سے تعبیر کرتے ہوئے ژاک لاکاں نے اذہان کی تطہیر و تنویر اور فکر و خیال کو مہمیز کرنے کی ایک منفرد سوچ کو پروان چڑھانے کی سعی کی۔ ژاک لاکاں کی ان خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس دنیا میں چراغ زیست ہمیشہ فروزاں رہے گا، فصل بہار کی رنگینیاں اور دل کشیاں بھی جاری رہیں گی۔ کئی تابندہ ستارے غروب ہوں گے اور ان کی جگہ نئے ستارے طلوع ہوتے رہیں گے۔ جبین دہر پر حسین خیالات کی افشاں کی تابانیوں کا سلسلہ بھی جاری رہے گا لیکن عصر حاضر میں ایسا رجحان ساز فلسفی کہاں سے لائیں جسے ژاک لاکاں جیسا کہا جا سکے۔ زندگی بھر خرد کی گتھیاں سلجھانے والا یہ تخلیق کار عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب سدھار چکا ہے۔ اس کی حیات کے افسانے تاریخ کے طوماروں میں دب کر ابلق ایام کے سموں کی گرد میں اوجھل ہو جائیں گے لیکن اس کے لسانی اور فلسفیانہ افکار کی سدا بہار بوقلمونیوں اور جدت کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مجھے عبدالمجید سالک مرحوم کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ژاک لاکاں اپنے مداحوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے

ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں جنوں کی مشکلیں جب حل ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے

ماخذ

1 Jacques Lacan Ecrits, Translated by Bruce Fink, Narton & Company London 2006, page 362

2. do page 362

3. Dylan Evans an introductory of Lacanian Psychoanalysis Routledge London 2006, page 80

4. Jacques Lacan. The four fundamental concepts of psychoanalysis translated by Alan Sheridan, Norton & Company London, page 24

5 -----do------ page 24

6 بہ حوالہ محمد حسن عسکری ستارہ یا بادبان، مکتبہ سات رنگ، کراچی، طبع اول، ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۰۰

7. David Lodge Modern Criticism and theory, Pearson, Singapore 2004 page 7

تنویر پھول۔ امریکہ

تاریخِ وفات ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

(برادرم اویس جعفری صاحب نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ معروف افسانہ نگار ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق نیو جرسی میں انتقال کر گئے اللہ تعالیٰ اُن کی تمام مرحومین کی اور ہم سب کی مغفرت فرمائے، آمین)

تاریخ ہجری: ''دیدِ آصف الرحمٰن طارق، افسانہ نگارِ نیک نہاد'' (۱۴۳۶ ہجری)

قطعۂ تاریخ عیسوی

مضمحل باغِ ادب ہے رحلتِ آصف سے پھول !
نامور اہلِ قلم اور بزمِ اُردو کے رفیق
مخلص و اخلاق مند اور پاک دل تھی اُن کی ذات
''آصف الرحمٰن طارق ، اطہر و مردِ خلیق''

(۲۰۱۵ عیسوی)

سلطانہ مہر

ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق کے افسانے اور ٹکسالی اردو

افسانہ نگار آصف الرحمٰن طارق سے میری ملاقات غالباً سن دو ہزار میں ہوئی تھی مجھے نیویارک میں مقیم شاعر مسرور جاوید اور نامور قطعہ نویس خالد عرفان نے میری دو کتابوں سخن ور دوم اور سخن ور سوم کی تعارفی تقریب کے حوالے سے نیویارک میں مدعو کیا تھا۔ کالم نویس محترم واصف کے صاحبزادہ کی شادی میں آصف بھائی سے ملاقات ہوئی تھی لیکن میری کتاب گفتنی اول (نثر نگاروں کا تذکرہ) کے حوالے سے ان سے خط و کتابت تھی۔ معروف شاعرہ حمیرا رحمٰن نے ان کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ آصف بھائی جب بھی گوشہ نشین تھے اور اب بھی ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ اکیلا آدمی ۲۔ جھلنگا پلنگ اور ۳۔ بلبلے کا وزن

ان تین مجموعوں میں ۲۹ افسانے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں میں کسی ادیب کا تعارفی مضمون موجود نہیں۔ خود مختصراً طارق بھائی نے اپنے بارے میں جو لکھنا تھا لکھ دیا۔ اس کے باوجود کہ کئی افسانہ نگاروں سے ان کی خوب یاد اللہ ہے۔ دوستانہ ہے۔ میں نے گفتنی اول میں ان کے افسانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ان کے افسانوں میں قاری کو کہیں نہ کہیں کوئی ایک گوشہ یا کوئی ایک کردار ایسا مل جاتا ہے جس میں اُسے اپنی جھلک دکھائی دے جاتی ہے یا وہ اس گوشے میں ایک تماشائی کی حیثیت سے موجود رہتا ہے۔ کم وقت میں اور کم الفاظ میں کہہ دینے کا ہنر آصف الرحمٰن طارق ہی جانتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ جہاں کلاسیکی افسانوں کا تاثر قائم رکھتے ہیں۔ وہیں جدید تقاضوں کو بھی ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔"

ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "اکیلا آدمی" مطبوعہ مئی ۱۹۹۷ء کا پہلا افسانہ "گلی کا المیہ" ایک

گہرا تاثر لیے ہوئے ہے۔ زبان آسان نکھری ستھری اور دہلی کی غریب گلیوں کا تعارف جس سلیقے سے انھوں نے کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ قاری خود کو افسانہ نگار کے ساتھ انہی گلیوں میں گھومتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ گلی میں بکھرے اور سمٹے کوڑے کے ڈھیر کے ساتھ افسانے کے ایک کردار خواجہ بلگرامی کی بے حسی کا نقشہ افسانہ نگار نے بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ کوڑے کے ڈھیر پر منہ مارنے والی گائے کے بعد چند بچوں کا اس ڈھیر سے اپنا رزق چننا ہی گلی کا اصل المیہ ہے۔ اور آصف طارق نے جس انداز میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے وہی اس افسانے کی اصل خوبصورتی ہے۔

اس مجموعے کا ایک اور افسانہ "نظام سقہ" ہے۔ ایک دن کی بادشاہت کا آرزومند۔ جو اس افسانے میں جلال دین کے کردار میں موجود ہے۔ افسانہ پڑھتے جائیے آپ کے خون کی گردش تیز ہو جائے گی اور آپ بے چینی سے افسانے کے اختتام تک پہنچ جانے کی خواہش کریں گے اور پھر جب قاری افسانے کے اختتام تک پہنچتا ہے تو اس کے منہ سے ایک آہ نکل جاتی ہے۔ اپنی بے بسی پر اور جلال دین کی بے بسی پر بھی۔

اس مجموعے کا اگلا افسانہ "پلنگ" ہے۔ افسانے کا راوی خط لکھنے کے معاملے میں کاہل ہے مگر اس کی بیوی جب اس کی ماں کے ہاں مقیم ہے اور وہ نئے آنے والے مہمان کے سلسلے میں بیوی کو متواتر خط لکھتا ہے تو اس کی ماں نے اپنے خط میں ایک جملہ لکھا جو حاصل افسانہ ہے۔

"مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میری بہو کے یہاں آنے سے سعودی عرب کی ڈاک کا نظام ٹھیک ہو گیا ہے۔"

آگے کردار نگاری کے ایک دل نشیں انداز میں آصف نے ایک عورت، ایک ماں کا جو روپ پیش کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

اس مجموعے کا آخری افسانہ "خاندانی ہے" اس افسانے میں بھی زبان کا ذائقہ ہے۔ اور خوبصورت محاوروں کا استعمال بھی ہے۔ جیسے۔ "توشہ دان کھنگالا تو آدھی روٹی اور سالن کا بچا کچا لب وھڑا شوربہ پڑا تھا۔ جس سے ایک ڈاڑھ بھی گرم نہ ہوئی۔۔۔ اندھیرا اس قدر واضح تھا کہ ہاتھ کو

ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔۔ مزاروں اور مجاوروں کو ہتھیلی ہتھیلی کا پھپھولا بنائے رکھتے ہیں۔۔۔ پھر جب قاری کہانی کے اختتام تک پہنچتا ہے تو افسانہ ''خاندانی'' کا راز آشکار ہوتا ہے۔ موضوع ۱۹۹۷ء کا ہے۔ نیا نہ ہونے کے باوجود ایسا نیا پن لیے ہوئے ہے کہ بے ساختہ افسانہ نگار کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

''جھلنگا پلنگ'' مطبوعہ ۲۰۰۷ء کی چاروں کہانیاں اپنے میں ایک معاشرتی واد سموئے ہوئے ہیں۔ مغربی دنیا میں جھلنگا پلنگ کہاں ہوتے ہیں مگر جھلنگا پلنگ کے سے کردار تو اس معاشرے میں بھی موجود ہیں۔ افسانہ نگار نے کس سلیقے اور خوبصورتی سے ان کرداروں کی تجزیہ نگاری کی ہے کہ ہر افسانہ اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہے اور اس سے قاری نظر نہیں چرا سکتا۔

اس افسانے کا آخری پیرا پڑھنے والے کو سوچ کے جھلنگے پن کو ایک نئی ادوائن کی طرح کس دیتا ہے۔ گو ادوائن کا استعمال اب عام نہیں مگر تشبیہ'' کی خوبصورتی نے اس لفظ کو دوام بخش دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''ایک دفعہ انھوں نے کہا تھا کہ دنیا ان کو ایک جھلنگا پلنگ سمجھتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ خود دنیا کی ''ادوائن'' کس کر رکھ دیں'' اور جہاں تک پلنگ کے جھلنگا ہونے کا تعلق ہے وہ جھلنگا پلنگ ہرگز نہ تھے۔ یہ تو صرف ان کی سوچ تھی جس نے ان کا جھلنگا پلنگ بن کر رکھ دیا تھا ورنہ سچ پوچھیں تو ان کی ادوائن تو ہم سب سے زیادہ کسی ہوئی تھی اور اگر پلنگ کی ادوائن کسی ہوئی ہو تو پھر پلنگ کا بان صراحی کی طرح ہوتا ہے۔ کہ کان لگا کر سنیں تو سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔

اس پیراگراف کو پڑھنے کے بعد کیا قاری جھلنگا پلنگ ادوائن۔ بان اور صراحی کے استعاروں کو اپنی روزمرہ زندگی سے الگ کر سکتا ہے۔۔؟

طاقت اور مکاری کے ہنر کو آزما کر کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا کی مثال تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کا تجزیہ آصف الرحمٰن طارق کے افسانے ''یا اہل القبور'' میں واضح ہے۔

افسانہ 'خاندان' اور 'زنگ یا لوہا' میں خوبصورت محاورہ اور ٹکسالی زبان کا استعمال کہانی کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ جدید افسانوں میں اب یہ زبان پڑھنے کو نہیں ملتی۔ مگر جو کلاسک ادب

کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں وہ آصف الرحمٰن طارق کے افسانوں کو محض زبان اور بیان کا چٹخارہ لینے کے لیے بار بار پڑھیں گے کم از کم ان محاوروں کو یاد کرنے کے لیے ہی یہ افسانے پڑھنا لازمی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے پان کے حوالے سے زندگی برتنے کے ایک نئے ذائقے سے بھی اپنے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔

ان کا افسانوی مجموعہ ''پہلے کا وزن'' میں (مطبوعہ مارچ ۲۰۰۶ء) کے ساتوں افسانے ہمارے ''آس پاس کی حقیقتوں کی کہانیاں ہیں اور معنوی اعتبار سے بھاری بھرکم کہانیاں ہیں جب کہ ''بلبلے کا وزن'' تو بلاشبہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر مقصد کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔

آصف بھائی آج کل ''عاشق علی دودھ والا'' کے عنوان سے ایک طویل مختصر افسانہ لکھ رہے ہیں جس کا پہلا باب میں نے پڑھا ہے مگر اس وقت اس پر کچھ کہنا بہت ہی قبل از وقت ہوگا۔ ہاں مگر میں آصف بھائی کے ایک سوانحی مضمون ''فَبِأَيِّ ءَالَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَان۔ کے بارے میں ضرور چاہوں گی۔ میں نے آصف بھائی سے کہا کہ وہ اس مضمون کو اشاعت کے لیے کسی جریدے میں ضرور بھیجیں جب کہ انھوں نے اس مضمون کی ابتدا میں ہی لکھ دیا ہے کہ یہ مضمون انھوں نے صرف اور صرف اپنے بہن بھائیوں اور اپنے بچوں کے پڑھنے کے لیے لکھا ہے اور یہ آصف بھائی کی محبت ہے کہ انھوں نے مجھے بھی اپنی فیملی میں بہن کی حیثیت سے شامل کر کے میرے مطالعہ کے لیے بھی مجھے بھیج دیا ہے۔

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ہی میں نے آصف بھائی سے کہا کہ یہ ''فیض'' صرف اپنے بہن بھائیوں اور بچوں تک محدود نہ رکھئے بلکہ جس کے بھی زیرِ مطالعہ یہ مضمون آئے گا وہ بلاشبہ فیضیاب ہوگا۔

بہت کم قارئین کو معلوم ہوگا کہ آصف بھائی کا دل ۳۳ فیصد کام کر رہا ہے۔ دو تین بار وہ سرجنوں کی نیک کارفرمائیوں سے گزر چکا ہے۔ مگر آصف بھائی کے ایمان کی قوت نے اُسے دھڑکنیں عطا کی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کی شریک حیات قیصر جہاں کی محبت اور عزم نے وہ سنبھالا دیا ہے کہ آصف بھائی زندگی کے ہر محاذ پر کامیاب ہیں۔ ان کے اس مضمون سے میں تھوڑا

سا حوالہ دینا چاہوں گی تا کہ آصف بھائی کے ایمان کی قوت کا ایک چھوٹا سا رخ سامنے آجائے۔ وہ اس مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے دیگر نعمتوں کے علاوہ دو تحفے ایسے دیے ہیں جنھوں نے ہر آڑے وقت میں میری مدد کی۔ ایک تو یہ کہ میرے دل میں پیسے کی ذرا سی بھی محبت نہیں ہے۔ ورنہ جس طرح کویت کی تجارت ہاتھ سے نکلنے کے بعد میں پہاڑ کی چوٹی سے نیچے آیا ہوں وہ ایک ایسا حادثہ تھا جو آسانی سے مجھے زمین کے اندر لے جا سکتا تھا۔ دوسرا تحفہ یہ ہے کہ مجھے موت سے خوف بالکل نہیں آتا۔ مگر میں سسکتی ہوئی زندگی سے ڈرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ چلتے پھرتے اٹھا لے۔''

پھر انھوں نے اپنے دل کے دوسرے آپریشن کا ذکر کیا جس کے لیے ڈاکٹروں نے کہا کہ ان کے دل میں اتنی سکت نہیں کہ وہ دوسرے آپریشن کا متحمل ہو سکے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹروں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ بند ہوئی رگوں کو بھی Blocked Vessels کو Stents کے ذریعے کھولا جائے۔ اس آپریشن کے بعد معلوم ہوا کہ دل میں اب اتنی سکت نہ تھی کہ وہ جسم کے سب حصوں کو قدرتی حساب سے خون پہنچائے چنانچہ ایک گردے نے خون نہ ملنے کی وجہ سے سکڑنا شروع کیا اور ناکارہ ہو گیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ ایک گردے کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ گھومتا پھرتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ Pace Maker کے حوالے سے خدا نے ایک لیڈی ڈاکٹر میری قسمت میں لکھ دی ہے چنانچہ موت بھی اس لیے گوارا کہ ''آتا نہیں۔ آتی ہے۔''

میں اکثر سوچتا ہوں کہ زندگی کے ساتھ چومکھی لڑنے کی یہ طاقت مجھے کیسے ملی۔ کیا میں ایسا ہی تیس مار خاں ہوں؟ تب مجھ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ قوت تو مجھے خدائے برتر کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ مزید کرید سے مجھ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی قوت کا جو پرزہ مجھ میں لگا رکھا ہے یہ تمام کھیل اسی پرزے کا ہے۔ اور اس کو تقویت اور سہارا میرے

خاندان نے دیا۔ دینے والی ذات تو وہی ایک ہے تاہم اس کو جلا دینے میں میری بیوی، میرے بچوں، میری بہوؤں، میرے تمام بہن بھائی ان کی بیویوں، بھابھیوں اوران کے بچوں کا برابر کا ہاتھ ہے۔ میری بیوی ایسی ہے کہ اس کی سانسیں میری سانسوں کے ساتھ چلتی ہیں۔ رات زور سے کروٹ بھی بدلوں تو گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔ میری ان تمام مشکلات کے باوجود میرا ہاتھ تھامے ہوئے اور مجھے گرنے نہیں دیتی۔ مالی اعتبار سے جب مجھ پر قلندری دور آیا تو معاش کی گاڑی میں جُت گئی۔ اگر قیصر نہ ہوتی تو شاید میں بہت مختلف حالات میں ہوتا اولاد ایسی کہ امریکہ میں رہنے کے باوجود اپنے اپنے دلوں میں مشرقیت کا لبادہ رکھے ہوئے ہیں باپ کو باپ سمجھتے ہیں۔ Old man نہیں۔ اچھے انسان ہیں اور اچھے مسلمان بھی۔ میری ایک ہُوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمہ وقت میرے کمرے کی چوکھٹ پر ڈیرہ ڈالے رکھتے ہیں۔ مرحبا صد مرحبا۔ آفرین صد آفرین۔

مرے خدا نے مجھے چاہتوں کا باغ دیا — مہک رہے ہیں مرے گھر میں پھول سے بچے

اور پھر میری بہوؤیں۔ کہکشاں اور راحمہ۔ ان دونوں نے بیٹیاں ہونے کا حق ادا کر دیا۔ (طارق بھائی۔ جیسے میری بہو عظمیٰ اور وقار میرا بیٹا آپ کی طرح میرے دل سے بھی ان دونوں کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔)

نمبرون کہ آصف الرحمٰن طارق نے اس مضمون میں خود کو اللہ تعالیٰ کا ہر لمحے شکر گزار رہتا کر خود کو ایک خوش قسمت انسان ثابت کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا دل اب ۲۹ فیصد کی سیڑھی سے اتر کر ۱۹ فیصد کی سیڑھی پر آ گیا ہے۔ مگر آفرین ہے اس پر کہ رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ ڈاکٹروں نے ان کے دل میں لگے ''پیس میکر'' میں ایک اور تار کا اضافہ کرنے کے لیے مزید ایک آپریشن کی تجویز پیش کی ہے اور اس کے لیے ۲۷ جولائی ۲۰۰۶ء کی تاریخ مقرر کی تھی۔ یہ آپریشن بھی ہو گیا۔ طارق بھائی رو بصحت ہیں اور نئی کہانیاں تخلیق کرنے میں مگن ہیں۔

ہم سب کی دعا ہے کہ وہ اسی طرح فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن '' کی مکمل تصویر بن کر ہم سب کو بھی اسی نقشِ قدم پر چلنے کی دعا میں یاد رکھیں۔ آمین۔

اشرف سہیل

اردو ادب اور ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق کے افسانے

اردو ادب میں مرزا غالب، سرسید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے افکار سے علمی اور ادبی رجحانات عام ہوئے۔ اس کے بعد رومانوی اور حقیقت نگاری کی تحریریں مقبول ہوئیں۔ انقلاب روس سے قبل ہی اردو ادب میں حقیقت نگاری کی تحریک نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک بنارس کے ہفت روزہ ''آواز حق'' میں منشی۔۔پریم چند کا ناول ''اسرار معید'' قسط وار شائع ہو چکا تھا۔ ''گوشہ عافیت'' میں منشی پریم چند نے زمیندار اور کاشتکار کے رویوں کو اجاگر کیا ''چوگانِ ہستی'' میں انہوں نے مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ بیان کی اور طبقاتی کشمکش کا نقشہ کھینچا۔

۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں سید سجاد ظہیر احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر۔۔کی ادبی کاوشوں کو یکجا کیا گیا۔ ''انگارے'' کی اشاعت پر روایت پسند حضرات کا آگ بگولا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ ایک مخصوص طبقے کی طرف سے اس کتاب پر اور مصنفین پر اخبارات میں بہت کچھ لکھا گیا۔ لہٰذا مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے ''انگارے'' کی بندش کے احکامات جاری کیے۔ ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' شائع ہوا اور اس کی اشاعت کے بعد مقصدیت اور سماجی افادیت کی راہیں اہل قلم پر کھلتی چلی گئیں۔

اس کے بعد طبقاتی کشمکش، بھوک، افلاس اور عدم استحکام ہمارے تخلیق کاروں کے موضوع بنتے رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سر وزیر حسن کے نامور فرزند سید سجاد ظہیر نے ۱۹۳۵ء میں چند ہم خیال ادیبوں کو ''نانکنگ ریسٹورنٹ لندن'' میں مدعو کیا اور مصنفین انجمن کی بنیاد رکھی۔ دوسری جانب مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، علامہ نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر عابد حسن نے بھی

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پریم چند، علی سردار جعفری اور مجنون گورکھپوری کے ہمنوا ہونے میں کوئی پس وپیش نہیں کی۔اس طرح اردو ادب کے، یہ پھول افسانہ نگاری اور شاعری میں ادب کی خوشبو بکھرتے رہے اور اردو ادب ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔

ادھر ادب ترقی کی منازل طے کرتا ہوا دور حاضر میں داخل ہوا۔ افسانہ غزل کی طرح مختصر وقت میں زندگی کے ریزے ریزے جمع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور افسانے کا تخلیق کار غزل کے شعر کی طرح ایک ہی تخلیقی جست میں اپنی سوچ کو الفاظ میں ڈھالنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اردو افسانے کے منظر نامے میں یہ بات یقیناً متاثر کرتی ہے کہ اب افسانوں کے تخلیق کار اس صنف کی طرف شاعری کے راستے نہیں آرہے۔ بلکہ افسانہ ہی ان کے اظہار کی اولین ترجیح ہے۔ افسانوں میں جدیدیت کی جو رو آئی ہے اسے موجزن رکھنے میں بھی افسانہ نگاروں کا حصہ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ دراصل افسانہ نگاروں کی نئی کھیپ میں بھی آپ کو تحریر کا قدیم انداز نظر آئے گا۔ دراصل افسانے کا خیال کہانی کے بطن سے ابھرتا ہے اور بعض اوقات افسانے کا شکستہ فریم خالصتاً ادب کو پیش کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ آج کے افسانے میں اگر حقیقت کا ٹھوس زاویہ سامنے نظر آتا ہے تو عصری ردعمل کو تجدید میں سمیٹے اور حقیقی صورت حال کو بے چہرہ اور ٹائپ کرداروں کی زبان میں پیش کرنے کا رجحان بھی غالب حیثیت میں موجود نظر آتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی، ممتاز مفتی، مشتاق یوسفی، قرۃ العین حیدر، گوپی چند نارگ، قاضی عبدالستار، قدسیہ بانو، دیوندر ستھارتھی، نشاط فاطمہ، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، اوبندر ناتھ اشک، فرخندہ لودھی انتظار حسین، رام لعل، غلام ثقلین رضوی، جیلانی بانو، امرتا پریتم، جوگندر پال، بلراج کومل، منشا یاد، مظہر الاسلام، تقی حسین خسرو، مشہود اشعر۔۔زیتون بانو، اصغر ندیم سید اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ بہت سے گمنام ادیب ادب کی دنیا میں مختلف نوع کے رنگوں کی آمیزش سے کہکشائیں مرتب کر رہے ہیں، جو آپس میں متصادم ہوئے بغیر اپنے اپنے مدار میں گردش کرتے ہوئے ادبی دنیا کو منور کیے ہوئے ہیں۔

افسانہ اپنی ارتقائی منازل طے کر چکا اور روز بروز اس کے لکھنے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قلم، قرطاس اور قاری سے رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اسے آپ امریکہ میں بسنے والوں کی خوش قسمتی ہی کہہ سکتے ہیں کہ ادب کی اس پنیری کی آبیاری کرنے کے لیے ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق ہم میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب افسانوں میں کھو کر چند لمحوں کے لیے ہی سہی اپنے آپ کو ماضی کے دھندلکوں میں تلاش کرتے نظر آئیں گے۔ ڈاکٹر طارق نے افسانہ نگاری کو ایک ایسا اسلوب دیا ہے کہ پڑھنے والا افسانے کے ہر کردار میں اپنے آپ کو بھی موجود پاتا ہے۔ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قدیم لفظوں کے استعمال میں مہارت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق کی اب تک تین کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''اکیلا آدمی، ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی دوسری کتاب ''بلبلے کا وزن'' تیسری کتاب ''جھلنگا پلنگ'' ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر طارق افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک منفرد طرز تحریر لیے ہوئے ہیں اور اس کا اندازہ آپ کتب کے ... م سے بھی کر سکتے ہیں۔ دراصل ڈاکٹر طارق ادب کے اس چراغ کو اب تک روشن کیے ہوئے ہیں جو انقلاب فرانس کے بعد روشن کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر طارق کے افسانے حقیقت سے قریب تر ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔ انہوں نے نہ تو اپنی روایات سے منہ موڑا اور نہ ہی اپنی ثقافت سے۔ حالانکہ ان کی کتب میں شائع شدہ کئی افسانے آج سے ۲۵۔۳۰ سال پہلے تخلیق کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر طارق نے افسانہ نگاری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ آپ کے افسانوں میں ادب کے ساتھ ساتھ تہذیبوں کو سمجھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے مشکل الفاظ کا سہارا لیے بغیر سادہ الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہہ جانے کا فن جانتے ہیں۔ وہ آج بھی قدیم اردو میں جدید خیالات کو بڑی ہی خوبصورتی سے ڈھال لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں آپ کو ایسے الفاظ بھی ملیں گے جو آج کل استعمال نہیں کیے جاتے۔ وہ کسی بھی چیز کی تمہید باندھنے میں خوبصورت لفظوں کا سہارا لینے میں استاد مانے جاتے ہیں۔ اپنے ایک افسانے ''پاندان'' میں پاندان کی تعریف

ملاحظہ ہو۔

''چھوٹی دادی کی پٹاری کا تام جھام دیکھنے کے قابل تھا۔ پٹاری کیا تھی عمر عیار کی زنبیل تھی۔ جانے کیا الم غلم بھر رکھا تھا ایک نظر میں تو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوتا کہ یہ اندھے کنویں کی مانند ہے۔ تہہ تو جیسے ہے ہی نہیں، مکھاؤں کی ایک قطار نظر پڑتی تھی جو ایک گول دائرے میں آگے پیچھے رکھی ہوئی تھیں، کوئی منجھلی لکھیائیں تو کوئی بڑی تو کوئی بہت چھوٹی۔ مکھائیں بے حد قرینے سے تانبے کے گول گول حلقوں میں لٹکی ہوئی تھیں۔ تمام کی تمام کلھیائیں منقش تھیں اور ان پر گود گود کے کام کیا گیا تھا۔ ہر ایک کلھیا پر بہت سلیقے سے ایک گنڈی دار ڈھکنا ہوتا۔ ڈھکنا بھی منقش کتھے اور چونے کی کلمیوں میں چھوٹی چھوٹی چمچیاں بھی رکھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی پرانے زمانے کے ہاتھ سے جھلنے والے گول سرے کی پنکھیوں کو چھوٹا چھوٹا کر کے تانبے کا بنا دیا ہے۔'' کسی افسانے میں پاندان کی اس طرح تفصیل بیان کرنا یہ صرف ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق ہی کا خاصہ ہے۔

ڈاکٹر طارق عجز و انکسار کا مجسمہ ہیں۔ وہ نہ تو اپنے آپ کو ادیب مانتے ہیں اور نہ ہی افسانہ نگار جب کہ وہ افسانوں کے ساتھ ساتھ مقالے لکھنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ یہی ان کا بڑا پن ہے کہ وہ افسانے کی دنیا میں قد آور شخصیت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسلط نہیں کرتے۔ ان کی بیگم ڈاکٹر قیصر طارق بھی اعلیٰ ادبی ذوق رکھتی ہیں اور قدم بقدم ادبی سرگرمیوں میں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ ہم نئے لکھنے والوں کو بالکل مفت مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر طارق کی امریکہ میں موجودگی سے فائدہ اٹھائیں اور ان کے تجربے کو کیش کروا کر ''ادب دوست'' ہونے کا ثبوت دیں۔ اجالوں کا راج قائم کریں۔ ڈاکٹر طارق اردو ادب کی ایک تاریخ ہیں۔ ان کی منکسر المزاجی اپنی جگہ لیکن ان کے افسانے خود بولتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔ خداوند کریم ڈاکٹر صاحب کو صحت و زندگی عطا فرمائے اور وہ ادب کی دنیا میں روشن ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں۔ آمین۔

رفیع اللہ۔(امریکہ)

”آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے“

ہم دونوں کی ملاقات کویت میں ۱۹۹۳ء میں ہوئی تھی وہ وہاں بھی اردو کی محفلیں اپنے گھر میں منعقد کرتے تھے۔ اتفاق سے ہم دونوں جب امریکہ آئے تو ایک ہی شہر میں آکر آباد ہوئے۔ اردو کی محفلوں کا سلسلہ انھوں نے یہاں بھی جاری رکھا۔ بقول ان کے ان کی سرشت میں اللہ نے شاعری کا پرزہ نہیں رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شعری محفلیں تو منعقد ہوتی ہی رہتی ہیں مگر نثر کی جانب توجہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ خاکے، افسانے، فکاہیہ مضامین، مقالے، تنقیدی مضامین سننے اور سنانے پر زور دیتے تھے اور اپنے اور دوستوں کے گھروں پر ہفتہ وار بے تکلف محفلیں منعقد کرتے تھے جن میں مرد، خواتین اور نوجوان بھی شریک ہوتے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھاتے تھے۔ اردو ادب کے وکیل تھے اور ان محفلوں کی نظامت وہی کرتے تھے۔ ہزاروں شعر یاد تھے۔ بتاتے تھے کہ ان کی دادی نے انھیں بچپن میں گلستاں اور بوستان جیسی کتابیں پڑھائی تھیں۔ دعا کیجئے کہ قیصر طارق کو اللہ صبر جمیل عطا فرمائے۔

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی

حلقہ ارباب ذوق کی آصف الرحمٰن طارق کے ساتھ 'شامِ افسانہ'

نیویارک: ۷ اپریل ۲۰۰۷ء حلقہ ارباب ذوق نے ہندوپاک اور امریکہ کی معروف شخصیت اور مقبول افسانہ نگار'' آصف الرحمٰن طارق'' کے ساتھ شام افسانہ منعقد کی ناظم جلسہ جناب طاہر خان نے پاکستان قونصلیت کے پریس اتاشی اور معروف شاعر شفقت خلیل سے جلسے کی صدارت اور مہمان خصوصی کے لیے'' آصف الرحمٰن طارق' صاحب سے گزرش کی۔ جلسہ گاہ نیویارک، نیو جرسی اور لانگ آئی لینڈ کی ادبی شخصیتوں اور معزز ہستیوں سے بھری ہوئی تھی۔ طاہر خان کی دلکش نظامت سے'' شام افسانہ'' کا آغاز ہوا۔ قیصر طارق نے جو مہمان خصوصی کی شریکِ حیات ہیں اپنے شریک زندگی پر مضمون ادب نواز حضرات کی نذر کیا۔ محترمہ'' قیصر طارق نے سادگی اور خوش اسلوبی سے اپنا مضمون پڑھتے ہوئے فرمایا کہ ہماری شادی کے دوسرے ہی دن انہوں نے نہایت رازداری سے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جس نے میرا خون خشک کردیا۔ یہ بات انہوں نے بے حد اعتماد کے ساتھ کہی تھی۔ اور کہا۔'' دیکھو قیصر تمہارے ساتھ میری یہ دوسری شادی ہے'' ظاہر ہے کہ نئی نویلی دلہن جب اس طرح کی بات سنے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔۔۔۔ پھر کہا گھبراؤ مت میری پہلی شادی اردو سے ہوچکی ہے محترمہ قیصر طارق نے مضمون پڑھتے ہوئے پھر کہا کہ وکٹوریہ روڈ پر کتاب کی دوکان کے مالک جناب محبوب نے بتایا'' طارق کو اردو کی کتابیں پڑھنے کا ہمیشہ سے بہت شوق تھا اور اسی شوق کی بدولت وہ کھنچے کھنچے میری دکان پر آتے تھے مگر طرفہ تماشہ یہ تھا کہ ان حضرت کی جیب ان کے شوق کا ساتھ نہیں دیتی تھی محبوب صاحب نے کہا اگر تمہارے پاس کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں ہے اور تم چاہتے ہو کہ کتابیں پڑھو تو ایک کام کرو۔ جب بھی تمہیں کالج سے فرصت ملے تم ادھر میری دوکان پر آجایا کرو اپنی پسند کی کوئی کتاب یا کوئی رسالہ لو اور دکان میں بیٹھ کر اس کو پڑھ لیا کرو۔ پھر محترمہ قیصر طارق نے فرمایا کہ'' رات بِرات ان کی آنکھ

کھل جائے اور نیند نہ آئے تو نزلہ مجھ پر گرتا ہے اور مجھے جگا دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کیا وقت ہوا ہے بس یہ کہتے ہیں کہ۔ بیوی نیند نہیں آرہی ہے۔ جاگنا تو ہے ہی لو شعر سنو۔ بعد ازآں طاہر خان نے ہندوپاک اور امریکہ کی معروف مشاعرہ زرین یٰسین کو مضمون پیش کرنے کی دعوت دی۔ زرین یاسین نہ صرف شاعری میں حسنِ کلام رکھتی ہیں بلکہ نثر میں بھی حسن اسلوب اور حسنِ بیان رکھتی ہیں۔ زرین یاسین نے اپنا مضمون ''آصف الرحمٰن طارق اکیسیوں صدی کا داستان گو'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اور فرمایا کہ آصف الرحمان طارق کے افسانوں میں وہ داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ جو داستانیں ہماری زندگی کے قریب نظر آتی ہیں الفاظ کا استعمال محاوروں کی بندش، موزوں اور پس منظر میں ہمیں ایک سچائی نظر آتی ہے اور جس طرح سے آصف الرحمٰن طارق نے پاکستان سے سعودی عرب اور پھر امریکہ کا سفر کیا ہے ان کے افسانوں میں مشرق اور مغرب کی ملی جلی تہذیب ملتی ہے اور سچائی تو یہ ہے کہ ان کے قلم سے ایک صحیح اسلامی تہذیب نمایاں ہوتی ہے اور پھر فرمایا کہ آصف الرحمٰن طارق کے افسانے جیسے 'پاندان'، 'جھانگا پلنگ'، 'امریکن لڑکی'، 'گرتی دیواریں'، 'اکیلا آدمی'، وغیرہ افسانے اسلوب بیان اور سادگی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اور کہا کہ جس طرح سے ان کی زندگی کا سفر مشرق سے مغرب رہا اسی طرح ان کے افسانے مشرق و مغرب کی عکاسی کرتے ہیں۔ طاہر خان نے معروف اور بلند مرتبہ ادبی شخصیت شاعر، دانشور اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک پروفیسر یونس شرر کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی۔ پروفیسر یونس شرر نے اپنے مقالہ میں کہا کہ آصف الرحمٰن طارق اردو افسانہ کے بلند اور مایہ ناز افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے فن کی ہر خوبی کو لیے ہوئے ہیں خاص کر کردار نگاری وغیرہ۔ پروفیسر یونس شرر نے فرمایا کہ آصف الرحمٰن ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں مشرق اور مغربی تہذیب کا ایک ملتا جلتا معاشرہ پیش کیا ہے۔ طاہر خان نے ہندوپاک اور امریکہ کے مشہور دانشور انشاء پرداز اور شاعری کے ساتھ ساتھ پرخلوص شخصیت کے مالک واصف حسین واصف سے گزارش کی کہ وہ اپنا مضمون پیش کریں۔ جناب واصف حسین واصف نے ''خاکہ'' پیش کیا اور اس خاکہ میں اپنے تاثرات کا

اظہار کیا۔ واصف حسین واصف کا ''خاکہ'' اپنے شوخ وشنگ انداز کے ساتھ پُرمغز تھا فرماتے ہیں طارق سے ملنے جلنے کا دورانیہ کم وبیش دس برسوں پر محیط ہے دس سال قبل میرے ایک عزیز دوست نے کہا'' آیئے آپ کو آصف الرحمٰن طارق سے ملوائیں میں نے کہا تین افراد سے، کہنے لگے نام تین ہیں۔ شخص ایک ہے'' طارق کی ابتدائی تعلیم کراچی کے ماڈل ہائی اسکول میں ہوئی یہ اسکول اگر ٹاٹ کا اسکول نہ تھا تو ٹھاٹ کا اسکول بھی نہ تھا۔ جناب واصف حسین واصف نے اپنے ''خاکہ'' میں فرمایا کہ طارق کا شادی کے بعد فوری طور پر ہنی مون کے لیے سعودی عرب چلے جانا بادی النظر میں بڑا عجیب لگتا ہے بادی النظری ہماری کم نظری ہے مگر طارق کی بالغ النظری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔'' طارق بہت صاف دل کے انسان ہیں اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جب ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تو دل سے کوئی اجنبی حسینہ برآمد نہیں ہوئی۔ طاہر خان نے ''شام افسانہ'' کے مہمان خصوصی محترم '' آصف الرحمٰن طارق سے گزارش کی کہ وہ اپنا ایک افسانہ پیش کریں محترم '' آصف الرحمٰن طارق'' نے افسانہ ''پاندان'' کے عنوان سے پیش کیا افسانے میں کردار نگاری واقعات ،افسانہ کے ساتھ ساتھ پرانی تہذیب ملتی ہے دلّی کی محاوراتی زبان کا استعمال اور اسلوب بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب اور ایک گھریلو ماحول ملتا ہے مہمان خصوصی کا یہ افسانہ افسانہ نگاری کے بلند معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ طاہر خان نے ادب نواز حضرات سے اظہار خیال کے لیے دعوت دی۔ جن میں باجی نصرت انور، جناب شاہد کا مڑید، صوفی مشتاق، شہریار جلیس اور ڈاکٹر شفیق نے'' افسانہ پاندان کی خوبیوں کے متعلق اظہار خیال کیا۔ ادب نواز حضرات کے اظہار خیال کے بعد طاہر خان نے ''شام افسانہ'' کے صدر محترم شفقت خلیل صاحب کو صدارتی خطبہ کے لیے گزارش کی محترم شفقت خلیل نے محترم '' آصف الرحمٰن طارق کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اردو زبان کے متعلق یہ کہا کہ یہ زبان ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس زبان کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا اور اردو میں جو مٹھاس اور محبت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ نثری نشست کے اختتام کے بعد طاہر خان نے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ معروف شعراء اکرام میں جناب محمد اسلم سانگلہ، یوسف خان،

آنند آہوجا، شیر طالب، آغا رفیق، ڈاکٹر شفیق زرین، یاسین مقسط، ندیم واصف، حسین واصف، پروفیسر یونس شرر اور صدر مشاعرہ محترم شفقت خلیل نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ حلقہ ارباب ذوق نے شروع ہی میں طعام کا انتظام کیا تھا تاکہ سامعینِ جلسہ لذت طعام سے جلسہ کو لذت بخشیں۔

ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق

”کیا آپ یونیورسٹی میں اردو پڑھا رہے ہیں؟“

چونکہ میرے پاس اردو کی کوئی باقاعدہ ڈگری نہیں ہے اس لیے کسی بھی یونیورسٹی نے مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ مگر اردو میری گھٹی میں پڑی ہے اس لیے باز نہیں رہتا۔ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے کچھ طالب علم جمع کر لیے ہیں جن کو اعزازی طور پر اردو پڑھا دیتا ہوں۔ یونیورسٹی نے مجھ پر کرم کیا اور اتنی اجازت دے دی کہ یونیورسٹی کے ایک کمرے میں طالب علموں کو جمع کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں۔

اب تک اردو کے لیے 'کیا' کِیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ میں بھلا اردو کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ الٹا اردو نے میری نوک پلک درست کی ہے۔

کتنی کتابیں لکھی ہیں؟ الحمدللہ۔ اب تک نو (۹) کتابیں لکھ چکا ہوں۔ دسویں پر آج کل کام کر رہا ہوں۔ اِن ۹ میں سے ۴ شائع ہو چکی ہیں۔ تفصیل یہ ہے۔ (۱) اکیلا آدمی (۲) بلبلے کا وزن (۳) جھانگا پلنگ (۴) اندازِ کماں داری

باقی کتابیں جو تیار ہیں اور شائع ہونے کے انتظار میں ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

پانچویں کتاب۔ ”نور کے مینارے“ ربّ العزّت کا یہ کرم ہے کہ اس نے مجھے ایک بے مثال خاندان میں پیدا کیا۔ ہر چند کہ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ صرف اور صرف ”فبای آلاءِ ربکما تکذبان“ والی بات ہے۔ میری ننھیال ڈپٹی نذیر احمد کی اور ددھیال میر ناصر علی کی ہے۔ ان دونوں حضرات کو کون نہیں جانتا۔ اس سے زیادہ کسی کی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ اس کتاب

میں میں نے اپنے بزرگوں کے متعلق لکھا ہے۔ یہ کتاب میں نے اپنی نئی پود کے لیے لکھی ہے تا کہ ان کو یہ بات باور کراسکوں کہ بے شک میرے بزرگ نور کے مینارے تھے۔

چھٹی کتاب۔۔۔'منزل منزل' یہ بھی رب الکریم کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اتنی استطاعت دی کہ پیٹ بھر کے دنیا کی خاک چھان سکوں۔ پانچ بار زمین کے گرد چکر لگا چکا ہوں۔ روس۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے سوا دنیا کے تمام ممالک دیکھ چکا ہوں۔ جہاں جہاں گیا اس کی یاد داشتیں رپورتاژ کی شکل میں لکھدی ہیں۔ یہ سفرنامے نہیں ہیں۔

ساتویں کتاب۔۔۔'کوہِ گراں' یہ بھی اوپر والے کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ایسے ہزاروں مواقع سے نوازا کہ میں اردو کی چند چید ہستیوں سے ملاقات کرسکوں۔ نام تو بہت سے ہیں مگر چند نام یہ ہیں۔

۱۔فیض ۲۔جگر ۳۔احمد فراز ۴۔مشتاق یوسفی ۵۔جمیل جالبی۔ یہ میرے استاد ہیں جنہوں نے مجھے اردو پڑھائی ۶۔جمیل الدین عالی۔ ۷۔حمایت علی شاعر ۸۔رضی اختر شوق میں نے اس کتاب میں ان حضرات کے حوالے سے لکھا ہے۔

آٹھویں کتاب۔۔۔'دِلی دِلی۔کویت۔کویت' یہ وہ داستانِ امیر حمزہ ہے جو بتاتی ہے کہ دلی اور کویت سے ہمیں کس طرح بھگایا گیا اور اس دوران ہم پر کیا کیا نہ گزری۔؟

نویں کتاب۔۔۔'زہرِ ہلاہل' یہ افسانوں کا مجموعہ ہے

دسویں کتاب۔۔ آجکل لکھ رہا ہوں۔ اس میں تنقیدی مضامین ہیں

کتنے افسانے لکھے ؟ لگ بھگ ۱۰۰ پہلا افسانہ طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۵۱ء میں لکھا

ادبی محفل کے متعلق کچھ بتائیں: میں نے ادبی محفل تقریباً ۳۰ (تیس) سال قبل کویت میں شروع کی تھی۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس کا واحد مقصد احباب میں اردو کا شوق پیدا کرنا ہے۔ اس میں ہر صنف کا ادب پیش کیا جاتا ہے۔ پھر باقاعدہ مثبت تنقید ہوتی ہے۔ مگر کسی کے بخیے

نہیں ادھیڑتے۔ دوسری بڑی وجہ میری آنے والی نئی پود ہے جن میں مَیں اِس محفل کے ذریعہ اُن کے دلوں میں اردو کی عظمت اُجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ اور بحمد اللہ۔ میری ادبی محفل کی وجہ سے کئی بچے اور بچیاں نہ صرف اردو پڑھنے لگے ہیں، بلکہ ان میں سے بہت سوں نے لکھنا بھی شروع کر دیا اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر میرا پوتا جو ابھی ۸ سال کا ہے اور جس کا نام یازان Yazaan ہے وہ اپنی عمر کے مطابق اردو میں کہانیاں لکھتا ہے۔ اور میری ادبی محفلوں میں سناتا ہے۔ بلکہ میری ادبی محفل کا افتتاح اسی کی کہانی سے ہوتا ہے۔

اپنے اوپر مضامین کی کاپیاں میرے متعلق بہت سے احباب نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند بھجوا رہا ہوں۔ یہ فہرست قدرے طویل ہے۔ ان میں سے چند کو تو میں جانتا تک نہیں۔ مگر آپ ان کی کسی بات کا یقین نہیں کیجیے گا۔

ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق

(۱) بنام محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

برادرم اویس۔ امید ہے بخیر ہوں گے

مشتاق یوسفی کی طرح مجھے بھی اپنے اوپر کچھ لکھنے سے اُلجھن ہوتی ہے۔ یہ پہلی بار ہے کہ آپ کے حکم پر اپنے متعلق کچھ لکھ رہا ہوں، کوشش یہ کی ہے کہ خود اپنا ڈھول نہ پیٹوں ورنہ یہ لگے گا کہ اپنی کنڈی خود اڑا رہا ہوں۔ اللہ آپ کو مع بھابی صاحبہ دین۔ دنیا۔ صحت اور ایمان کی دولت سے مالا مال کرے۔

(نوٹ) ایک افسانہ "کنگرے" بھجوا رہا ہوں منصور صاحب کا خط تیار ہے۔ اگلی ڈاک میں بھجوا دوں گا۔

(۲) بنام محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

برادرم اویس

حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ اپنا ایک افسانہ "خاندانی۔۔۔" اور قیصر کا ایک فسانہ "میرے شہر میں امن ہو گیا" بھجوا رہا ہوں۔ یہ افسانہ میں نے تقریباً پچیس (۲۵) سال پہلے لکھا تھا۔ مگر ابھی تک کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔ قیصر نے چند افسانے پاکستان میں دہشت گردی کے تناظر میں لکھے ہیں۔ اور بہت خوب لکھے ہیں۔ میں ان کے دیگر افسانے بھی آپ کو بھجواؤں گا۔ آپ کو پسند آئیں گے۔ قیسر کا یہ افسانہ الاقرباء کے معیار پر اترے گا تو مجھے خوشی ہوگی۔

کئی نئے افسانے لکھے رکھے ہیں۔ Fair کرنے میں کاہلی، سستی اور صحت سب مانع آتے ہیں۔ جیسے ہی خوش خط لکھ دوں گا آپ کو الاقرباء کے لیے ارسال کر دوں گا۔

آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ آپ دیارِ غیر میں بیٹھ کر اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

لکھتے بھی بہت خوب ہیں۔ کیا شاعری اور کیا نثر۔ آپ کی نثر پڑھ کر خود سے شرمندگی ہوتی ہے۔
اللہ آپ کو خوش رکھے، صحت، دین اور ایمان کے ساتھ۔

خیر اندیش

طارق

(۳) بنام سید منصور عاقل۔ اسلام آباد (پاکستان)

منصور بھائی۔ السلام علیکم

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی معافی کا خواستگار ہوں۔ بے حد تاخیر سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا''

باعثِ تاخیر میری کاہلی، سستی اور علالت ہے۔ آپ روشن ضمیر ہیں مجھے یقیناً معاف فرمائیں گے۔۔۔ آپ نے مجھے انعام کے لائق سمجھا۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ ورنہ 'من آنم کہ من دانم'۔۔ میں اس اعزاز☆ کا ہرگز مستحق نہیں ہوں۔ آپ نے ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔ آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کچھ باتیں الاقرباء کے حوالے سے کروں گا مگر مور ناچتا ہے تو اپنے پنجوں کو دیکھ کر بیٹھ جاتا ہے، جیسے ہی صحت اجازت دے گی کچھ لکھنے کی جسارت کروں گا۔ آپ سے ملنے کو بھی بہت دل چاہتا ہے۔ مگر ڈاکٹروں کے ظلم کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ سفر کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتے ورنہ سلام کرنے ضرور حاضر ہوتا۔

الاقرباء آپ کی وجہ سے تابندہ ہے۔ کاش میں آپ جیسا کوئی کام کرسکتا۔ بھائی اویس کی عنایات بدستور ہیں۔ اللہ ان کو بھی خوش رکھے۔

☆ مرحوم نے یہ خط اُس وقت تحریر فرمایا تھا جب اُنھیں گزشتہ برسوں میں ایک بار سال کے 'بہترین افسانہ نگار ایوارڈ' کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

عزیز جہاں ادا جعفری

(وہ جو چپ چاپ بھری بزم سے اُٹھ کر چل دیں)

علم وادب کی وہ شمع فروزاں جس نے بائیس اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں (اُتر پردیش۔ بھارت) سے زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اُن کی والدہ نے اپنی جس ہونہار بچی کا نام عزیز جہاں رکھا تھا۔ واقعی عزیزِ جہاں ثابت ہوگی۔ ادا جعفری نے نو سال کی عمر میں پہلا شعر کہہ کر اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ ان کی ذات سفاک ظلمتوں میں ماہتاب کے مانند تھی۔ حیف صد حیف نوّے سال چھے ماہ اور گیارہ دن اپنی تابانیوں سے اکنافِ شعروادب کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور کرنے کے بعد بارہ مارچ ۲۰۱۵ء کو یہ ماہتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ ان کی وفات کی خبر سنتے ہی ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ وہ کچھ عرصہ سے علیل تھیں اور کراچی کے ایک شفاخانے میں زیر علاج تھیں۔ ان کی وفات پر ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ اردو شاعری میں تانیثیت کا ایک درخشاں عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔ انسانیت کے وقار اور سربلندی کو نصب العین بنا کر حقوق نسواں کے لیے انتھک جدوجہد کرنے والی حریتِ فکر کی عظیم مجاہدہ دائمی مفارقت دے گئی۔

گزشتہ سات عشروں میں حق گوئی و بے باکی کو شعار بنا کر حریت ضمیر سے جینے کے لیے اُسوۂ شبیر کو پیشِ نظر رکھنے والی زیرک، فعال اور مستعد ادیبہ ہماری بزم ادب کو اس طرح سوگوار کر گئی کہ اب طلوع صبح بہاراں کے امکانات خیال وخواب محسوس ہوتے ہیں۔ فرشتۂ اجل نے اس ذہین، مخلص، جری اور دردمند تخلیق کار کے ہاتھوں سے قلم چھین لیا جس نے وطن اہلِ وطن اور پوری انسانیت کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت کو شعار بنایا۔ معاشرتی زندگی میں خواتین کے ساتھ روا رکھی جانے والی شقاوت آمیز ناانصافیوں کے خلاف ایک قلم بہ کف مجاہدہ کی حیثیت سے ادا

جعفری نے جس طرح تخلیقی سفر جاری رکھا وہ اُن کا بہت بڑا اعزاز و امتیاز ہے۔ تیشۂ حرف سے فصیل جبر کو منہدم کرنے کا جو اسلوب انھوں نے پیشِ نظر رکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ معاشرے کے پسے ہوئے مظلوم طبقات کے ساتھ بالعموم اور خواتین کے ساتھ بالخصوص انھوں نے ایثار، خلوص، اخلاق و مروّت اور دردمندی کی اساس پر جو قلبی تعلق استوار کیا، ہر عہد میں اس کی بازگشت سنائی دے گی۔ جدید اُردو شاعری کی وہ پہلی خاتون شاعرہ تھیں جنھوں نے تانیثیت کے موضوع پر پہلی بار کھل کر اپنا مافی الضمیر پیش کیا۔ اپنے عہد کے ممتاز ادبی مجلے ''رومان'' سے اپنے تخلیقی ادبی سفر کا آغاز کرنیوالی اس نابغۂ روزگار شاعرہ نے عالمی سطح پر خواتین کے مسائل کو اپنے افکار کی اساس بنا کر لوحِ جہاں پر اپنا نقشِ دوام ثبت کر دیا۔ اپنے دور کے مایۂ ناز شعرا اثر لکھنوی اور اختر شیرانی سے اکتساب فیض کرنے والی منفرد اسلوب کی حامل اُردو زبان کی اس یگانۂ روزگار ادیبہ نے حمد، نعت، غزل، آزاد نظم، ہائیکو، مختصر مضمون نگاری اور متنوع تخلیقی تجربات سے مزین اپنے منفرد اسلوب کی دھاک بٹھا دی۔ جدید اُردو شاعری میں تانیثیت کے موضوع پر ادا جعفری نے اپنے منفرد اسلوب میں جس فقید المثال طرزِ فغاں کو اپنایا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسی کو خواتین تخلیق کاروں نے طرزِ ادا اور تخلیقِ ادب کے سفر میں زادِ راہ قرار دیا۔

ادا جعفری کی شادی لکھنو میں اُنتیس جنوری ۱۹۴۷ء کو نورالحسن جعفری سے ہوئی جو اس وقت متحدہ ہندوستان کی سول سروس (ICS) میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ادا جعفری کا خاندان کراچی پہنچا۔ ادا جعفری کے شوہر نورالحسن جعفری ایک وسیع المطالعہ ادیب تھے۔ اُردو اور انگریزی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ معاشرتی زندگی مسائل اور علمی و ادبی موضوعات پر ان کی اردو اور انگریزی زبان میں تحریریں اور کالم اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے صدر کے منصب جلیلہ پر بھی فائز رہے۔ اس عرصے میں پاکستان کے ممتاز ادیبوں سے ان کے قریبی تعلقات مسلسل پروان چڑھتے رہے۔ اُن کے حسن اخلاق کی وجہ سے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ تین دسمبر ۱۹۹۵ء کو نورالحسن جعفری نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ادا جعفری نے تخلیق فن کے لمحوں میں خوں بن کے رگِ سنگ میں اُترنے کی جو سعی کی اس کے اعجاز سے اُن کی شاعری قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آفرینی سے لبریز ہوگئی۔ ان کی موضوعاتی نظمیں بہت مقبول ہوئیں ان میں بیت المقدس میں نہتے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے صیہونی مظالم پر ان کی صدائے احتجاج ''مسجد اقصیٰ'' جیسی معرکہ آرا نظم کی صورت میں آئی تو قارئین ادب میں حالات کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے میں مدد ملی۔ عجز و انکسار ان کی فطرت ثانیہ تھی اس لیے اپنے عہد کی عظیم شاعرہ اور باکمال ادیبہ کی حیثیت سے ستاروں کو چھو لینے کے باوجود انھوں نے احساس تکبر سے اپنا دامن کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ سب احباب کے ساتھ اخلاق و اخلاص کے ساتھ پیش آنا زندگی بھر اُن کا شیوہ رہا۔ اردو ادب میں خواتین نے روشنی کے جس سفر کا آغاز کیا اس کے ابتدائی نقوش ماہ لقا بائی چندا کی تخلیقات میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد جن ممتاز خواتین نے اس سمت میں اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا ان میں زاہدہ خاتون، شروانیہ، نجمہ تصدق حسین، آمنہ عفت، رابعہ نہاں، اور اب بانو وفا، قرۃ العین حیدر، حجاب امتیاز علی، فضل بانو، عصمت چغتائی، رضیہ بٹ، بانو قدسیہ، پروین شاکر، فاطمہ حسن، زاہدہ حنا، ممتاز شیریں، انتیا غلام علی، نیلوفر عباسی، شاہین زیدی، صدیقہ بیگم، کشور ناہید، اختر ریاض الدین، فہمیدہ ریاض، صفیہ اختر اور امرتا پریتم کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ادا جعفری کی شاعری طلوع صبح بہاراں کے وقت تازہ ہوا کے اولین جھونکے کے مانند ہے جس سے قریۂ جاں معطر ہو جاتا ہے۔

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے، میرا نام ہی آئے   آئے تو سہی، برسرِ الزام ہی آئے

لمحاتِ مسرت ہیں تصور سے گریزاں   یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

یادوں کے وفاؤں کے عقیدوں کے غموں کے   کام آئے جو دنیا میں تو اصنام ہی آئے

باقی نہ رہے ساکھ ادا دشتِ جنوں کی   دل میں اگر اندیشۂ انجام ہی آئے

ادا جعفری کی یہ غزل پاکستان کے نامور گلوکار اُستاد امانت علی خان کی آواز میں قومی نشریاتی

اداروں پر پیش کی گئی۔ آج بھی یہ غزل بہت مقبول ہے اسے سُن کر اُردو زبان و ادب کے شیدائیوں کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔ ادا جعفری کی شاعری بلا شبہ ساحری کی حیثیت رکھتی ہے اس کے ساتھ ہی اُستاد امانت علی خان کی آواز سُن کر دل کے تار بھی بجنے لگتے ہیں۔

ادا جعفری نے دنیا بھر کی خواتین کو معاصر ادب میں اپنا اہم کردار ادا کرنے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے خواتین کی تخلیقی فعالیت کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اردو کی پہلی خاتون نقاد اور زیرک تخلیق کار ممتاز شیریں (پیدائش: ۱۹۲۴-۹-۱۲، وفات ۱۹۷۳-۳-۱۱) کی تنقیدی بصیرت، وسیع مطالعہ، عالمی ادبیات پر کامل دسترس اور وسیع النظری کی وہ بہت بڑی مداح تھیں۔ ممتاز شریں کے ساتھ ان کا معتبر رابطہ زندگی بھر برقرار رہا۔ ممتاز شریں کے سانحۂ ارتحال پر اپنی نظم "تم تلاوا" میں ادا جعفری نے اپنے جذبات حزیں کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

وہ جو چپ چاپ بھری بزم سے اُٹھ کر چل دیں یوں دبے پاؤں کہ جیسے کبھی آئیں نہ گئیں

دنیا بھر میں ادا جعفری کے اسلوب کے لاکھوں مداح موجود ہیں۔ انہوں نے پوری دنیا کی خواتین کے ساتھ خلوص و مروّت اور ایثار و درد مندی کی اساس پر جو عہدِ وفا استوار کیا، اُسے علاج گردشِ لیل و نہار سمجھتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں بے حسی کا عفریت معاشرتی زندگی کے اُفق پر منڈلا رہا ہے۔ جوہر قابل کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ ادا جعفری کو اس بات کا قلق رہا کہ ہماری سماجی زندگی میں اقدار و روایات کی زبوں حالی نے گھمبیر صورت اختیار کر لی ہے۔ اُن کے اسلوب میں خواتین کے مسائل کو ابتدا ہی سے تزکیہ نفس کے ایک موثر وسیلے کی حیثیت حاصل رہی وہ زندگی بھر ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے پرورشِ لوح و قلم میں مصروف رہیں اور ان کے دل پہ جو گزری اُسے زیب قرطاس کرنے میں انھوں نے کبھی تامل نہ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تانیثیت کا موقر اور معتبر حوالہ ان کے منفرد اسلوب میں اس طرح رچ بس گیا کہ اسے ان کی زندگی کے محور کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ معاشرتی زندگی میں خواتین کو جن کٹھن مسائل اور صبر آزما حالات کا سامنا ہے، ان کی لفظی

مرقع نگاری وہ اس فنی مہارت اور تپاک جاں سے کرتی رہیں کہ قاری ان کے تجربات و مشاہدات کو اپنی قلبی اور روحانی کیفیات سے ہم آہنگ محسوس کرتا ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات کو پورے خلوص اور دردمندی کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھال کر وہ قلبی اور روحانی راحت کے احساس سے سرشار ہوتیں۔ ان کی شاعری وشتِ زندگی میں ثبوتِ نمو اور پیہم سفر کی درخشاں مثال ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ زندگی جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں کی ایک صورت ہے، خانہ فرہاد میں اُجالا شرر تیشہ کا مرہون منت ہے۔ زندگی کی حقیقی معنویت کی تفہیم پر ادا جعفری نے اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ زندگی میں محنت، لگن اور انتھک جدوجہد ہی کامیابی کا وسیلہ ہے۔

احوال ایک سفر کا

اجنبی سبزہ زاروں میں

حدِ نظر تک بنفشہ کے پھول

اجنبی تو نہیں تھے، نہ ہیں

وہ تو راہِ سفر کے اُجالے بھی تھے

ہم سفر بھی لگے

داستانیں سُناتے بھی تھے

اور سُنتے بھی تھے

اب کے موسم تمھیں یاد کرتے رہے

اور میں چُپ رہی!!

ادا جعفری ایک کثیر التصنیف ادیبہ تھیں اُن کی تصانیف درج ذیل ہیں:

میں ساز ڈھونڈتی رہی (۱۹۵۰)، شہر در شہر (۱۹۶۷)، غزالاں تم تو واقف ہو (۱۹۷۲)، سازِ سخن بہانہ ہے (۱۹۸۲)، موسم موسم (کلیات ۲۰۰۲) جو رہی سو بے خبری رہی (خود نوشت)، سفر باقی ہے (زندگی کے آخری دنوں کی شاعری)۔ اس کے علاوہ ادا جعفری نے مشفق خواجہ اور جمیل الدین عالی کی تحریک پر اُردو زبان کے کلاسیکی شعرا کے کلام کا انتخاب ”غزل نما“ (۱۹۸۷) میں مرتب کیا جو اُن کے ذوقِ سلیم کا مظہر ہے۔ اس انتخاب کو دنیا بھر میں زبردست پذیرائی نصیب ہوئی۔

ادا جعفری کی شاعری میں تہذیبی و ثقافتی اقدار و روایات کے تحفظ پر زور دیا گیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے موجودہ زمانے میں اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ فرسودہ اور پامال اسالیب

کی کورانہ تقلید کے بجائے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اظہا وابلاغ کے لئے نئے اسالیب کی جستجو ناگزیر ہے۔ان کی شاعری میں احساس اظہار کی دھنک رنگ کیفیت قاری کے لیے ایک دل کش تجربہ ہے۔ اُن کے منفرد اسلوب میں خُوب سے خُوب تر کی جستجو، آئینہ دار ایک ارتقائی کیفیت کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے۔گزشتہ سات عشروں میں ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی میں جو نشیب وفراز آئے ہیں، اُن کے باعث زندگی کی اقدار و روایات کی کایا پلٹ گئی ہے۔ادا جعفری کے اسلوب میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں اُنھوں نے ادبی روایات کو ایک پیہم رواں عمل سے تعبیر کیا جو اقتضائے وقت کے مطابق تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہو کر فکر ونظر کو مہمیز کرنے کا وسیلہ ہے۔ادا جعفری نے سماجی زندگی میں خواتین کے موثر اور فعال کردار کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اس کا معاشیات اور اخلاقیات کے ساتھ انسلاک کر کے فکر ونظر کے نئے دریچے وا کر دیئے۔انھوں نے واضح کیا کہ خواتین کے شعور کا اپنے گرد ونواح کے حالات اور تہذیب ومعاشرت سے جو گہرا تعلق ہے وہ انہی عوامل کے مدار میں گھومتا ہے۔ادا جعفری نے دنیا بھر کی خواتین پر زور دیا کہ وہ مثبت اور تعمیری کاموں پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں اور کسی قسم کی تخریب سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔اس نوعیت کے مثبت اندازِ فکر کے اعجاز سے نار کو بھی گلزار بنایا جا سکتا ہے۔

اپنے خداداد ذہن وذکاوت، بصیرت اور دِل ونگاہ کے سوز سے ادا جعفری نے اپنی شاعری کو سوزِ دروں سے مزین کیا۔ان کی شاعری میں تانیثیت کے حوالے سے سوزِ غم کا دل نشیں انداز قاری کو ایک نئی دُنیا میں پہنچا دیتا ہے۔سوزِ غم، سوزِ دروں اور خلوص و دردمندی سے متمتع ان کا اسلوب اپنی ابد آشنا اثر آفرینی کی بنا پر سنگلاخ چٹانوں اور جامد و ساکت پتھروں کو بھی موم کر دیتا ہے۔یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ادا جعفری نے خواتین کے حالات کی جو لفظی مرقع نگاری کی ہے اس کی قلب اور روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آفرینی ہر دور کی شاعری میں اپنا رنگ جمائے گی۔

صاف گوئی بڑا قہر تھی، جُرم تھی استعاروں میں اُن کو جتاتے رہے
رنگ و بُو کی جگہ دُھول ہے خاک ہے پھول گُلزار سے خار کھاتے رہے

یہ فخر تو حاصل ہے، بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی ترے ساتھ چلے ہیں

تھے کتنے ستارے کہ سرِ شام ہی ڈوبے
ہنگام سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں

اک شمع بُجھائی تو کئی اور جلالیں
ہم گردشِ دوراں سے بڑی چال چلے ہیں

شکوہ بھی کیجئے تو کہاں ہے روا ہمیں
سب کچھ ملا ہے ایک خوشی کے سوا ہمیں

پانی میں ڈوب کر بھی چٹانیں وہیں رہیں
اور ہم کہ جذب دل پہ بھروسا رہا ہمیں

دل داغ داغ ہے تو بہاروں کا کیا قصور
دھوکا فصلِ رنگ پہ خود ہو گیا ہمیں

ہونٹوں کو مُسکرانے کی عادت سی پڑ گئی
دل بھی کہے میں ہوتا تو کیا تھا بُرا ہمیں

ادا جعفری کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کا ایک عالم معترف ہے۔ انھیں جن اعزازات اور ایوارڈز سے نوازا گیا ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ ان کے مقبول شعری مجموعہ ''شہر درد'' پر ۱۹۶۷ء میں ''آدم جی ایوارڈ'' دیا گیا۔

۲۔ حکومت پاکستان نے ان کی علمی، ادبی اور قومی خدمات پر ۱۹۸۱ء میں ''تمغۂ امتیاز'' عطا کیا

۳۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے ۱۹۹۴ء میں انھیں ''بابائے اُردو ایوارڈ'' عطا کیا

۴۔ ادا جعفری کو ''قائد اعظم ادبی ایوارڈ'' ۱۹۹۴ء میں ملا

۵۔ ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی کی طرف سے انھیں ''سرٹیفکٹ آف میرٹ'' سے نوازا گیا۔

۶۔ حکومت پاکستان نے محترمہ ادا جعفری کی سات عشروں پر محیط ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۲ میں اُنھیں ''پرائڈ آف پرفارمنس'' سے نوازا۔

۷۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی طرف سے ۲۰۰۳ء میں ''کمالِ فن'' ایوارڈ عطا کیا گیا

ادا جعفری نے مظلوم، محروم اور مجبور خواتین سے جو پیمان وفا باندھا، زندگی بھر اُسے استوار رکھا۔ ان کے منفرد اسلوب کی ہم زباں ممتاز خواتین میں بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، خالدہ حسین، زاہدہ حنا، پروین ملک، پروین شاکر، بلقیس قمر سبزواری، خدیجہ مسرور، ہاجرہ مستور، عصمت چغتائی،

جمیلہ ہاشمی، رضیہ مشکور، فاطمہ حسن، فرزانہ اعجاز، رضیہ بٹ، شبنم شکیل، کشور ناہید اور ممتاز شریں شامل ہیں۔ ادا جعفری کی نظم "شہر آشوب" عصری آگہی اور مثبت اندازِ فکر کو پروان چڑھانے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں اس وقت حالات نے جو رُخ اختیار کر لیا ہے اس کے تناظر میں یہ نظم اُردو شاعری میں تانیثیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

شہر آشوب

ابھی تک یاد ہے مجھ کو
خون کے دھبے نہ ہوتے تھے
مرے آنگن میں خیمے تھے دعاؤں کے
دھوئیں کے ناگ کا پہرا نہ ہوتا تھا
یقین آئے نہ آئے میرے بچوں کو
گئے وقتوں کی باتیں ہیں
گئے وقتوں کا قصہ ہے
مرے بچوں کو شاید ہی یقیں آئے
کہ برگِ گل کبھی قدموں تلے روندا نہ جاتا تھا
در و دیوار کے اوپر
ہوا برگشتہ گام آتی نہ تھی پہلے
کسی آسیب کا سایا نہ ہوتا تھا
یقیں اغوا نہ ہوتا تھا
سبھی تنہا تھے لیکن یوں کوئی تنہا نہ ہوتا تھا
مرے آنگن میں نقشِ پا سجے تھے
ابھی تک یاد ہے مجھ کو

ادا جعفری کی شاعری میں یہ واضح پیغام ہے کہ آج ہمیں ہوا کی دستک کو سن لینا چاہیے۔ ہمیں فطرت کی سخت تعزیروں سے غافل نہیں رہنا چاہیے آنے والی رُت بہت کڑی ہے۔ خواتین کے لیے اُن کا پیغام یہ ہے کہ حصار جبر کی اندھی فصیل کو منہدم کرنے کے لیے کُو بہ کُو بیداری کا پیغام پہنچانا ہوگا۔ بے چہرہ لوگوں اور بے در گھروں میں حوصلے اور اُمید کی شمع فروزاں کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس وقت پاکستانی معاشرے میں خواتین میں احساس ذمہ داری اور بیداری کی جو لہر پیدا ہو گئی ہے وہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔ اس کے بنیاد گزاروں میں ادا جعفری کا نام کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ ادا جعفری کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت قاری متعدد علامات،

نشانات، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا ہے۔ ادا جعفری کی شاعری میں دیوار، برگِ گل، غنچہ، منصور، کانٹے، کلی، کرن، زہر، تیرگی، زندگی، موت، کلیاں، شہر، روح، بدن، تقدیر، سایہ، چراغ، دھوپ، ڈھول، خوشبو، بہار، خزاں، نگاہ، خواب، تعبیر، زخم، گھنگھور گھٹا، ایسے الفاظ ہیں جن کا اردو غزل کی رمزیت اور ایمائیت کی روایت سے گہرا تعلق ہے۔ ایک زیرک، فعال اور مستعد ادیبہ کی حیثیت سے ادا جعفری نے حق گوئی، بے باکی اور حریت فکر کی روایت کو پروان چڑھانے کی مقدور بھر سعی کی۔ ان کی شاعری میں زندگی کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرنے کا جذبہ قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ انسانیت کا وقار اور سر بلندی انھیں بہت عزیز ہے۔ ادا جعفری نے جس دردمندی سے فروغ گلشن اور طلوع صبح بہاراں کی امید رکھی اور ہوائے جور و ستم میں بھی شمع وفا کو فروزاں رکھا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ رجائیت کی علم بردار تھیں اور بے یقینی کے مسموم اثرات سے نجات حاصل کرنے کی آرزو مند تھیں۔

میراثِ آدم

وہ جو انسان ہیں
آج کی موت بس آج کی موت ہے

اک کلی کے لیے، اک کرن کے لیے
زندگی موت سے کب خجل ہو سکی

زہر پیتے رہے، جی گنواتے رہے
تیرگی قسمت آب و گل ہو سکی

غم رسیدہ نہ ہو، دِل گرفتہ نہ ہو

ادا جعفری نے زندگی کی حیات آفرین اقدار کو اپنے اسلوب میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ حریتِ ضمیر اور حریت فکر کا علم بلند رکھا، جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے حرفِ صداقت لکھنا اپنا نصیب العین بنایا حقیقت نگاری کی شمع فروزاں رکھی اور کسی مصلحت کے تحت جبر کے سامنے سپر انداز ہونے کا تصور بھی نہ کیا۔ انھوں نے فرد کی انفرادی اور معاشرے کی اجتماعی زندگی کے بارے میں حقائق بیان کرتے وقت الفاظ کو کبھی فرغلوں میں لپیٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ نہایت واشگاف

الفاظ میں کلمۂ حق ادا کیا۔ان کے اسلوب میں زندگی کے بارے میں اجتماعی شعور کی جو برق رفتار قومی اور مسحور کُن کیفیت ہے وہ اُن کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

ماں

گردِ صدیوں کے سفر کی مرے بالوں میں اٹی	پاؤں چھلنی ہیں، نگہ زخمی ہے دل ہے خالی
کہیں کُچلے ہوئے سر ہیں کہیں بے روح بدن	ہے اِدھر بھوک اُدھر ہے فقط آسائشِ تن
اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ ممتا کا جنوں	کٹ ہی جائے گا شب تار کا اک روز فسوں
دیکھو نادان ہے، نادان سے مایوس نہ ہو	آخر انسان ہے، انسان سے مایوس نہ ہو

ادا جعفری نے گزشتہ سات عشروں میں معاشرتی زندگی کو درپیش مسائل کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ تخلیقِ فن کے لمحوں میں اُنھوں نے جس والہانہ انداز میں بے لوث محبت کے جذبات کو قوت متخیلہ کی اساس بنایا ہے وہ دلوں کو ایک ولولۂ تازہ عطا کرتا ہے۔ادا جعفری کے اسلوب میں فکر و خیال کی رفعت، جذبوں کی صداقت، زبان و بیان کی ندرت اور اظہار کی شائستگی اور پاکیزگی کا معیار اس قدر ارفع ہے کہ قاری اُن کی شاعری کے مطالعہ سے قلبی اور روحانی سکون محسوس کرتا ہے۔تانیثیت کے ہمہ گیر موضوع پر افکارِ تازہ کی نقیب ادا جعفری کی شاعری قاری کو ایک جہانِ تازہ کی سیر کراتی ہے۔معاشرتی زندگی کے تلخ تجربات، مشاہدات، تضادات، ارتعاشات اور تاثرات جب ادا جعفری کے فکر پرور اور بصیرت افروز اسلوب کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو قاری پر فکر و نظر کے متعدد نئے دریچے وا ہوتے ہیں۔ان کا موثر، دل کش اور منفرد اسلوب انسانی فطرت سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے اور قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ادا جعفری کی تخلیقی فعالیت جہد و عمل کی مظہر ہے۔ان کے اسلوب میں سچے جذبات کا سیل رواں بے یقینی، جمود، بے عملی، مصلحت اندیشی اور کاہلی کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ان کی شاعری قاری کے جذبات و احساسات کی اس قدر موثر انداز میں تنظیم کرتی ہے کہ امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا کی نمو کے امکانات

روشن تر ہوتے چلے جاتے ہیں

غمِ عشرت سے ترساں عشرتِ غم لے کے آئے ہیں　　گدایانِ تہی کاسہ دو عالم لے کے آئے ہیں
اسی در پر ستارے تھے شگوفے تھے بہاریں تھیں　　بڑا ہی ظرف ہے اُن کا جو شبنم لے کے آئے ہیں
ہمیں تو بر ہمی نکہت گُل بھی قیامت ہے　　قیامت ہے کہ خود تقدیر برہم لے کے آئے ہیں

جو تھے خدائے عزم و یقیں آج کیوں اُنھیں　　بے چارگی دستِ دعا راس آگئی
ہر خواب دل فریب سے آنکھیں چُرا گئے　　بیگانگیٔ اہلِ وفا راس آگئی
طے کر سکے نہ آپ تمنا کے مرحلے　　اہلِ جنوں کو لغزشِ پا راس آگئی

دل کو اندازِ تغافل کے بھی سائے تھے بہت　　پھر بھی نادان ترا سایۂ در مانگے ہے
دل بدل جاتے ہیں، انسان بدل جاتے ہیں　　کوئی دیوانہ وہی شام و سحر مانگے ہے
آپ سے دل کو توقع تھی پذیرائی کی　　ہائے نادان کہ پھولوں سے شرر مانگے ہے

تخلیق ادب کے وسیلے سے ادا جعفری نے قارئینِ ادب کو اپنی زندگی کے حالات اور تجربات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اسلوب میں ان کی ذات ایک ارفع مقام پر فائز دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے اسلوب میں اپنی ذات کو الگ اور جداگانہ حیثیت دی ہے۔ اپنے اسلوب میں اپنی ذات کے بجائے انھوں نے حیات و کائنات کے مسائل کو اوّلیت دی۔ اپنی شاعری کے وسیلے سے انھوں نے خواتین پر زور دیا کہ وہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی دنیا آپ پیدا کریں اور اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر پورے اعتماد سے تعمیرِ وطن کے کاموں میں شامل ہو جائیں۔

ادا جعفری نے عدم کے کوچ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا لیکن وہ قارئین ادب کے دل میں تاابد موجود رہیں گی۔ ان کی عظیم الشان علمی، ادبی اور قومی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ تاریخ

ہر دور میں ان کی فقید المثال ادبی کامرانیوں، اشہب قلم کی جولانیوں اور مستحکم شخصیت کی اعجاز بیانیوں کی بنا پر اُن کے نام کی تعظیم کرے گی۔ ان کے بعد بھی ہر بزم وفا میں ان کی عظمتِ خیال ہی کو موضوع گفتگو کی حیثیت حاصل رہے گی۔ ان کے زندہ الفاظ اُن کے منفرد اسلوب اور ابد آشنا تخلیقی وجود کا اثبات کریں گے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی ایک فریب نظر کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اردو زبان وادب کے قارئین اپنے دلوں کو ان کی یاد سے آباد رکھنا اپنا مطمح نظر بنائیں گے اور یوں اپنی انجمنِ خیال سجائیں گے۔ زندگی اور اس کی حقیقت کے بارے میں ادا جعفری کے یہ اشعار میرے جذبات حزیں کی ترجمانی کرتے ہیں:

سب سے بڑا فریب ہے خود زندگی ادا　　اس حیلہ جُو کے ساتھ ہیں ہم بھی بہانہ ساز

سانس کی بات ہو کہ آس ادا　　سب کھلونے ہیں ٹوٹ جانے کو

حجلۂ ناز سے آتے ہیں بُلاوے اب کے　　آخری بار چلو۔ آخری دیدار کرو

شاید ادھر سے قافلۂ رنگ و بُو گیا　　خوشبو کی سسکیاں ہیں ابھی تک ہواؤں میں

پُوچھے گی کس سے اب کے صبا گھر کا راستہ　　ہم نے تو اپنا نقشِ قدم تک مٹا دیا

آرزو صبا جیسی، پیرہن گلوں سا تھا　　زندگی امانت تھی، درد خود مسیحا تھا

ڈاکٹر عطش درّانی

مزدورِ دانش

حوادث زمانہ اوڑھے چھوٹے قد کی ایک بردبار بھاری سی شخصیت، چہرے کے سیاہ رنگ پر چیچک کے نشیب و فراز کی اوٹ سے جھلکتی ہوئی تیز اور بے قرار نگاہیں ملیشیا یا کھدر کی پوشاک پہنے، سادہ سی واسکٹ اور ایک ایسی ہی غالب جیسی ٹوپی زیب تن کیے تا حیات ایک مزدور شاعر کہلانے اور کتابوں ہی کے بیوپار میں لگے رہنے والے اُستاد جو بڑے بڑے مشاعرے لوٹتے اور منشی فاضل وادیب فاضل کا کورس کرنیوالوں کے ممتحن بنے رہتے۔ یہ تھے حضرت احسان دانش۔

وہ جس انداز سے جفاکشی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مقام تخلیق تک پہنچے وہ حیرت خیز بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ جسم و جاں کے رشتوں کو سنبھالنا اور قلم کی آبرو رکھنا آسان نہیں۔ یہ احسان دانش ہی کا کام تھا کہ انھوں نے بادِ مخالف کے تھپیڑوں کے سامنے اپنی قامت کو اُستوار رکھا اور پھر قائم بالذات ہو کر بڑی جرأت و بے باکی سے پرورشِ لوح و قلم کی۔

احسان دانش نچلے اور محروم طبقے کی صحیح نمائندگی کرنے اور فیض کے برعکس خود بھی مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے اُردو کے ایک قادر الکلام اُستاد شاعر تھے۔ ادب اور شاعری نازک طبعی اور نازک خیالی کے تقاضوں سے معرض وجود میں آتی ہے۔ حقیقی تجربات نے یہ الہامی نزاکت انھیں ودیعت کر دی تھی۔

ان کا مسکن یونانی مفکرین کی ذاتی اکادمیہ کا سا منظر پیش کرتا رہا تھا، جہاں لوگ حصول علم کے لیے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ لاہور انارکلی بازار کی ایک بالائی منزل ہی میں براجمان ایسے استاد اس زریں رومانوی عہد میں کم ہی دیکھنے میں آتے تھے جو ہماری نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

اُن کی زندگی بس حیات مستعار ہی تھی۔ قناعت کا جو سبق انھوں نے بچپن میں سیکھا، وہی زندگی بھر کا سرمایہ بنا رہا۔ ان کا صبح کا ناشتہ چائے کی ایک پیالی اور رس یا پاپے اور دن میں صرف ایک بار سہ پہر کو کھانا، جس میں دہی اور سرخ مرچ کی کثرت ہوتی۔ زندگی ان کے نزدیک شاید صرف گزارنے کے لیے اور کھانا صرف زندگی کے لیے تھا۔ ذات کی نمود و نمائش شاید ان کا مقصود نہیں تھا۔ فرماتے ہیں:

کم نظر آتا ہو جن سے طول چادر کا مری   میرے ارمانوں نے پاؤں اتنے پھیلائے نہیں

اگرچہ انھوں نے شاعری کے علاوہ کتابوں کو کاروبار اور ذریعۂ معاش بنایا تھا۔ مگر اس طرف زیادہ کاروباری انداز سے متوجہ نہ ہو سکے زیادہ انحصار مشاعروں ہی پر تھا۔ کہا کرتے تھے۔

وہ اور ہیں جنھیں فکرِ معاش رہتی ہے   مری تلاش میں رہتا ہے آب و دانہ مرا

ان کی زندگی ان کے اپنے ہی اس قطعے کی مرہون رہی

تیری فہرست دُعا میں ہیں زر و جام و صنم   رازِ جام و صنم و زر میری تحقیق میں فاش

میرے آگے کوئی سلطانِ زمن ہو کہ فقیر   مجھ کو رہتی ہے فقط جوہرِ ذاتی کی تلاش

ان کی آپ بیتی اپنے اندر تجربات کا وسیع سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ''جہانِ دانش'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب تک شاید اس پائے کی کوئی دوسری کتاب شائع نہیں ہوئی۔ گو ایسی آپ بیتیوں کی روایت ضرور آگے بڑھی ہے۔ بات یہ بھی نہیں کہ احسان صاحب کوئی بالکل ہی بے نیازانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحبانِ وسائل اور ارباب بست و کشاد کے ایک حد تک ممنون بھی رہتے تھے۔ وہ بھی ان کے معترف ہوا کرتے۔ ایک قصیدہ انھیں شالیمار باغ کے پاس پلاٹ، انعامات، تمغے اور نیشنل لائبریری میں ان کی کتابوں کی فروخت بھی دلوا گیا تھا۔

حضرت احسان دانش سے میرا تعارف اس زمانے میں ہوا جب میں بی اے کی تیاری کر رہا

تھا۔ یہ میرے پھوپی زاد بھائی سید محمد ظفر قادری کی وساطت سے ہوا جو لقمان سین کے دوسرے بیٹے تھے سخن طراز ہوا کرتے تھے اور انھیں احسان صاحب سے تلمذ حاصل تھا۔ میرے پھوپھا سید محمد عبداللہ شاہ قادری کے عُرس کے موقع پر کمالیہ کے موضع قادر بخش شریف میں محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوا کرتی تھی۔ تب ادب پروری اور ادب فہمی کا دور عروج پر تھا۔ اس لیے میرا متاثر ہونا لابدی تھا۔ میں نویں جماعت سے شعر و سخن کے میدان میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے ایک غزل لکھ کر احسان صاحب کے سامنے کر دی۔ انھوں نے کوئی اصلاح تو نہ دی اور نہ کوئی رائے۔ صرف ایک لمبی سی ''ہوں ں ں''۔ بس مجھے حوصلہ ہوا اور بذریعہ خط ایک دو غزلیں اصلاح کے لیے بھجوا دیں۔ متوازن ساخطِ شکستہ میں لکھا جواب آیا۔ ''ابھی تم اس مرحلے پر ہو کہ ادب کی جو بھی کتاب ملے، پڑھ ڈالو، مطالعہ خود بخود راہ پر ڈال دے گا'' ساتھ ہی میری غزل پر قلم بھی پھرا ہوا تھا۔ مگر کچھ اپنی طرف سے شعر بھی لکھے ہوئے تھے۔ ایک غزل کا مطلع یوں تھا:

محفل میں اہل دل کی یہ اکثر سنا گیا　　　پروانے خاک ہو گئے شمع کا کیا گیا

پھر میں لاہور آ گیا۔ سید قاسم محمود کے ساتھ۔ ماہنامہ ''معلومات'' کی ادارت اور نیشنل بک سنٹر/کونسل میں ماہنامہ ''کتاب'' کی ادارت میں معاونت، ترجمہ، تدوین، تحریر، عمر ابھی بیس برس بھی نہ ہوئی تھی۔ دن رات ادبی ہوا دن میں اُڑ رہا تھا۔ ان سب مرحلوں سے گزرتا تو کبھی انارکلی بازار میں احسان صاحب کے بالاخانے پر بھی حاضری دیتا۔ رفتہ رفتہ دو چار غزلوں کا ذخیرہ ہو گیا۔ احسان صاحب بعض جملوں پر میری پختگی اور گرفت سے بہت متاثر تھے۔ میں بھی محفل میں اکثر لفظ، قواعد، لغات، زبان کے حوالے سے کچھ پوچھنے کی جسارت کرتا رہتا۔

احسان صاحب خاص کر پرانی کتابوں کی تجارت کرتے تھے۔ ہر اتوار کو انارکلی بازار سے پہلے فٹ پاتھوں پر پرانی کتابیں ڈیرہ ڈالے ہوتی تھیں۔ ہیرو کتاب فروش ان میں بہت اہم تھا۔ میں بھی اس سے پرانی کتابوں، نادر نسخوں کی فرمائش کیا کرتا تھا۔ مگر پتا چلا کہ اگر واقعی کتابیں چاہئیں تو صبح نماز کے بعد پو پھٹتے ہی آجایا کروں۔ احسان صاحب اسی وقت آتے ہیں

اور سب کچھ سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ وہ بہت بڑے کتاب شناس ہیں۔ پھر تو ہمیں جو کتاب دیکھنا ہوتی خاص طور پر لغات اور قواعد یا حوالے کی کتابیں، وہ احسان صاحب کے ذخیرے میں ملتیں۔ جب ان کا سارا ذخیرہ خریدنے کی فرمائش نیشنل لائبریری اسلام آباد نے کی تو انھوں نے مجھے فہرست بنانے کا حکم دیا۔ کام بہت زیادہ تھا۔ کئی دن لگے۔ اس دوران میں کتابوں کو کھول کر سونگھ کر دیکھ بھی لیا کرتا اور اہم باتیں نوٹ کر لیتا۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم کے موضوع پر میرے مقالات اور کتاب انھی نوٹس پر مشتمل ہیں۔ اس موضوع کو میں نے اپنا ڈاکٹریٹ کا پہلا موضوع بھی بنایا تھا۔ اتنا مواد بہت تھا۔ احسان صاحب کا انتخاب کافی تھا۔

حضرت احسان دانش کی اس بالانشینی میں حاضری کا بھی ایک انوکھا طریقہ تھا۔ ناصر زیدی، مقبول جہانگیر، حنیف شاہد، انجم رحمانی، آغاز برنی، جان کاشمیری، راز کاشمیری جیسے کئی لوگ اس محفل میں میرے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ آداب ملاقات ایک روایت بن گئے تھے۔ ہر ملاقاتی انار کلی بازار میں ان کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھے ہوئے گھڑی والے سے احسان صاحب کی موجودگی کا پوچھا کرتا۔ اثبات میں جواب ملنے پر وہ اُلٹے قدموں واپس ہوتا اور سامنے باٹا کی دکان کے پیچھے چائے والے کو چائے کا آرڈر اور پیسے دے کر واپس آتا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ سانس قابو میں لانے کے بعد آواز لگاتا:

"احسان صاحب!"

"ہوں ں ں"

جواب ملتا تو آگے بڑھ کر ہال میں داخل ہو کر بغلی دروازے کے چھوٹے سے کمرے میں جھانکتا۔ احسان صاحب لکڑی کے تخت پر براجمان ہوتے۔

"آؤ میاں!" اور حاضر ہونے والا علیک سلیک کے بعد تخت کے سامنے بچھے فرش/چٹائی پر بیٹھ جاتا۔ احسان صاحب اونگھنے لگتے۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد حاضرین میں سے کسی کی آواز آتی

"چائے"

چائے والا چائے دے کر جا چکا ہوتا اور اس کے بعد پھر خاموشی کو اس طرح توڑا جاتا۔

''اُستاد!! ''

''ہوں ں ں ں''

''یہ فلاں شعر/ مصرعے میں۔۔۔ یہ جو باندھا گیا ہے، کیسا ہے؟''

''وزن سے خارج ہے۔۔۔۔'' ''ترکیب غلط ہے۔۔۔''

جواب ملتا۔ پھر ایک ذرا سی خاموشی کے بعد احسان صاحب گویا ہوتے:

''البتہ اس موضوع کو فلاں نے یوں، فلاں نے یوں، فلاں نے

اس طرح سے اور فلاں نے اس طرح سے باندھا ہے۔۔۔''

کبھی کبھی لفظوں کے اشتقاق، مترادفات، ہم قافیہ پر، علم بیان پر گفتگو چھڑتی تو ذرا سا طویل مگر دوٹوک جواب پاتے۔ انھی محفلوں سے میری شعری، ادبی، لسانی آبیاری ہو رہی تھی۔

احسان صاحب کسی اور کو کم ہی اصل اور فطری شاعر مانتے تھے۔ ان کے نزدیک محض جمالیاتی مشترکات تلاش کرتے رہنا شاعری نہیں، انسان کے مسائل اصل موضوع ہیں۔ یہ سب اشتراکیت کے موضوعات تھے، مگر احسان صاحب اشتراکی نہیں تھے۔ شاید اسی لیے اس اصل مزدور شاعر کو لینن پرائز کے لیے منتخب کرتے کرتے حفیظ اور پھر فیض کی طرف رُخ کر لیا گیا۔ ویسے بھی احسان صاحب شعر و سخن کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شاعر بننے کے لیے جس وسیع تر مشاہدے اور کثیر تر مطالعے کی ضرورت ہے۔ نوآموز اس کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ''جہانِ دگر'' میں دوسروں پر ان کے تبصرے اس امر پر شاہد ہیں۔ اس سب کے باوجود احسان صاحب اُستادی اور عظمت کے جس مقام پر ہیں اسے کسی طور بھی کم نہیں کیا جا سکتا۔ المیہ یہ ہے کہ ابھی ادب شناسی ایسے نکات کو سامنے نہیں لا سکی تھی کہ اس پر غروب کے سائے منڈلانے لگے ہیں۔۔۔

راولپنڈی کے ایک مشاعرے کے لیے لاہور سے کچھ شعراء کو مدعو کرنے کے لیے گلزار نسیم

حضرت احسان دانش سے ملے اور مدعا عرض کیا۔

انھوں نے سوال کیا ''آپ کتنے پیسے دے سکیں گے؟''

گلزار نے کہا ''آپ کو تین سو روپے دیے جا سکیں گے۔''

''بھئی یہ تو بہت کم ہیں'' احسان صاحب نے کہا۔

''جناب یہ زیادہ سے زیادہ رقم ہے۔ اسی رقم کو قبول کرتے ہوئے حفیظ جالندھری صاحب نے بھی شمولیت کا وعدہ کیا ہے۔'' گلزار نسیم بولے۔

''حضرت کہاں خان بہادر اور کہاں مزدور شاعر احسان'' احسان صاحب بولے ''لیکن بندہ نواز میں اپنے مقام سے کسی طور پر گرنا نہیں چاہتا۔ پانچ سو سے کم نہ لوں گا۔ میں بہت چھوٹا سہی، اور حفیظ صاحب لاکھ بڑے شاعر سہی۔ مگر یاد رہے دودھ کتنی مفید اور عمدہ شے ہے لیکن فروخت گلی گلی ہوتا ہے اور شراب کتنی بدنام اور مہلک سہی مگر بکتی اپنے مقام پر ہے۔''

پروفیسر منور ابن صادق صاحب کے ساتھ ایک دفعہ حاضری تھی۔ پروفیسر صاحب نے پوچھا ''کسی واقعے کے تاثرات، احساسات اور جذبے سے آپ کس حد تک متاثر ہو کر شعر کہہ لیتے ہیں؟ کیونکہ آپ کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ آپ حقیقی تجربات وحوادث کے شاعر ہیں'' کہنے لگے ''واقعہ اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ پھر اشتباہات، اشتراکات اور دوسرے واقعات کے فکر و تصور اور تانے بانے چلتے رہتے ہیں فوری طور پر کوئی شعر نہیں ہوتا۔''

ظفر قادری صاحب اپنے ارادت مند گلوکار مہدی حسن کی معیت میں فلم ساز کی طرف سے آ نکلے تو ایک فلم میں احسان صاحب سے گیت لکھنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے یہ گیت تو لکھ دیے مگر شاید یہ ان کا میدان نہ تھا۔

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنھیں دہرتی ہے   رو رو کے گزرتی ہیں راتیں آنکھوں میں سحر ہو جاتی ہے

اس گیت میں ان کا یہ مصرع: ''مجری کے ملائم کونے کو دانتوں میں دبا کر بل دینا'' ہمیں ''شمع'' کو یاد دلاتا ہے، جو 'جہانِ دانش' کا مرکزی محرک کردار ہے لیکن انھوں نے

ایک شعر اپنی اہلیہ کے لیے بھی کہا تھا:

عمر کا سورج سیہ بالوں کو چاندی دے گیا　　دل مگر اس دودھیا شعلے کا شیدائی بھی ہے

ان کے بعض اشعار تاریخی، تلمیحی اور فکری مقاماتِ بلند کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بار جدہ میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ماہر القادری شاید صدارت کر رہے تھے۔ احسان دانش ایک غزل پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے تو بہت داد ملی

چوکھٹے قبر کے خالی ہیں انھیں مت بھولو　　جانے کب کون سی تصویر سجا دی جائے

ماہر القادری یہ شعر سن کر پھڑک اُٹھے۔ مکرر مکرر کی فرمائش کرتے اور جھک کر دل پر ہاتھ رکھتے۔ اسی عالم میں گر پڑے اور بعد ازاں اس دارفانی سے رخصت ہو گئے۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون

فالج سے بحال ہونے کے بعد اگرچہ مایوسی اور ڈپریشن طبیعت کا حصہ ہوتا ہے۔ مگر میں نے احسان صاحب کو تب بھی فکرِ سخن میں غلطاں پایا۔ ان کا ایک نعتیہ شعر اسی تفکر سے برآمد ہوا۔ میرے خیال میں اُردو کے نعتیہ ذخیرے کے دامن میں اس سے قیمتی جوہر کوئی اور نہیں

دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز　　میں جانتا ہوں موت ہے سُنت حضورؐ کی

اس شعر کی آمد کا تذکرہ بھی انھوں نے اپنی خودنوشت کی دوسری جلد 'جہانِ دگر' میں تفصیل سے کیا ہے۔

حضرت احسان دانش تصوف، باطنی علوم، رُشد و ہدایت اور داخلی کمال و جمال سے بھی متعلق رہے۔ مگر کسی سلسلے سے کبھی منسلک نہ ہوئے حالانکہ ایک شخص خود انھی کو مرشد مانتے مانتے صاحب کشف و کرامات ہو چکا تھا۔ ایک بار قادر بخش شریف میں عرس کے موقع پر ایک عقیدت مند نے پوچھا۔

"احسان صاحب! آپ تو پیروں فقیروں کے بڑے ماننے والے ہیں۔ کیا آپ بھی کسی

مرشد سے بیعت ہیں؟"

"نہیں" احسان صاحب نے استفہامیہ چہرہ بنا کر جواب دیا۔

"پھر تو آپ کو کسی نہ کسی کا مرید ہو جانا چاہیے۔" اس نے کہا۔ دراصل وہ اپنے مرشد کی بات کرنا چاہتا تھا۔

"وہ کیوں؟" احسان صاحب نے سوال کیا۔

"وہ اس لیے جناب کہ جس طرح دنیا کی عدالتوں میں مقدمہ لڑنے کے لیے وکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح یوم حشر ہمیں اپنا مقدمہ کسی کامل کی وساطت سے پیش کرنا ہوگا۔" اس نے دلیل سے جواب دیا۔

"اور ۔ ۔ ۔" احسان صاحب چہک کر بولے "جب سزا ملتی ہے تو اس وکیل کو تو نہیں بلکہ اس شخص کو جو ایک کونے میں موکل کے طور پر چپ چاپ کھڑا ہوتا ہے۔"

ایسا ہی ایک بار کسی نے آپ سے حج وعمرہ کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے کہا کہ ایسا تو نہیں سوچا۔ اس نے کہا کہ ضرور جانا چاہیے۔ خاص طور پر مدینہ منورہ میں حاضری دینا تو افضل ہے۔ آپ چہک کر بولے "ہاں بھئی! کبھی رسول اللہؐ نے مشاعرہ کروایا اور زادِراہ بھیجا تو ضرور جاؤں گا"۔

اتفاق کی بات ہے کہ ظفر قادری اور نواز قادری صاحب نے انھیں حج وعمرہ بھی کرایا اور اسی دوران اتفاق سے مدینہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا اور اس میں اُن کی صدارت بھی کروائی گئی۔ بلانے والے کا نام بھی احمد تھا۔ اس کی کپکپاتی روداد انھوں نے 'جہانِ دگر' میں درج کی ہے۔

ایک محفل میں مقبول جہانگیر نے سید عترت زیدی کی وفات کی خبر سناتے ہوئے احسان دانش سے کہا:

"جوش صاحب تو ضرور اس جنازے پر آئے ہوں گے۔"

اس پر احسان دانش صاحب چہک کر بولے:

"اُدْہہ اوہ شخص تو اپنے جنازے پر نہ آئے گا، عترت کے جنازے پر اسے کیا خاک آنا ہے۔"

اس محفل میں کسی جھوٹے شخص کا ذکر چھڑا تو احسان صاحب فرمانے لگے۔ اجی اس کی کیا بات کرتے ہیں؟ وہ شخص تو صرف اتنا جھوٹ بولتا ہے جتنا نمک میں آٹا۔"

احسان صاحب کے ساتھ مشاعروں میں بھی شرکت کا دم بھرا۔ جون ۱۹۷۸ء میں ادارۂ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں ایسے ہی ایک مشاعرے کا اہتمام کرنے کا موقع ملا۔ استادِ محترم پروفیسر منور ابن صادق صاحب نے کہا "اگر احسان دانش صاحب کو لے آؤ تو۔۔۔" میں نے کہا "پھر ان کے شاگردوں کی ایک تعداد بھی ساتھ آئے گی۔" آغاز برنی بھی اس مشاعرے میں آئے۔ بعد ازاں انھوں نے "بزمِ دانش" کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی شائع کیا۔ جو کچھ ہی عرصہ چلا۔

جب مجھے "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادارت سنبھالنے کا موقع ملا تو اپنے پیش روؤں کے طریقوں کو جانچنے کے بعد جس طرح سید قاسم محمود نے ممتاز مفتی اور حفیظ جالندھری جیسے لوگوں کی آپ بیتیاں قسط وار شائع کرنا شروع کی تھیں، میں نے بھی ایک "آپ بیتی" نمبر نکالنے اور آپ بیتیوں کی قسطیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے جب احسان صاحب نے اپنی آپ بیتی 'جہانِ دانش' مجھے اپنے دستخطوں کے ساتھ عطا کی۔ میں نے اس کی تلخیص "سیارہ ڈائجسٹ" مارچ ۱۹۸۰ء کے "آپ بیتی نمبر" میں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اجازت مل گئی۔ خلاصہ کر کے دکھایا اور اسے شائع کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا۔ اس کی جلد دوم جہانِ ثانی کے اقتباسات کی اشاعت کے لیے بھی مچلنا شروع کر دیا۔

احسان صاحب 'جہانِ دانش' کی یہ دوسری جلد بیشتر لکھ چکے تھے۔ بہت سے چکر لگوانے کے بعد اس کا کوئی مسودہ تو کیا ملتا۔ الٹا انھوں نے مجھ سے میرے حالات اور ارادوں پر تحریر طلب کر لی۔ چند صفحات تو پہلے ہی لکھ کر دے چکا تھا۔ ابھی اور کی کمی تھی۔ انھی تحریروں کو دیکھ کر انھوں نے میرے بارے میں بھی چند پیرے اسی جلد میں "میرے خود ساز ساتھی" کے باب میں شامل کر دیئے۔ دوسرے چھ افراد تھے مسکین علی حجازی (صدر شعبہ صحافت، پنجاب یونیورسٹی) زاہد ملک

(ایڈیٹر اخبار ''پاکستان آبزرور'')، محمد ابراہیم (ایک طالب علم) عباس احمد عباسی (بی بی سی کے پروڈیوسر اور اسسٹنٹ سیکریٹری انجمن ترقی اردو)، شباب کیرانوی (ادیب اور فلمساز) اور محمد حنیف شاہد (ادیب اور لائبریرین اور ٹیکنکل سیکشن، پنجاب پبلک لائبریری)۔ اس حوالے سے ایک بار گفتگو رہی کہ احسان صاحب نے صرف انھی لوگوں کو اپنے خودساز ساتھی کہا ہے جو انھی کی طرح حالات کی سنگینی سے نہ صرف عہدہ برآ ہوئے بلکہ تلاشِ معاش و دو، حیثیت کے ایک بالکل دوسرے منقلب میدان میں جا کر اُبھرے اور ٹھہرے۔ شوخیِ گفتار نے مجھ سے کہلایا:

''احسان صاحب! حالات کی سنگینی اپنی جگہ مگر تعلیم کا سلسلہ تو میں نے چھوٹنے نہیں دیا۔ ہر دو سال بعد اگلے مرحلے، بی اے، پھر ایم اے کے امتحانات دیے اور پاس کیے اور ایک ہی علمی تعلیمی سطح پر اُبھر آیا ہوں۔''

احسان صاحب نے ایک جگہ لکھا تھا کہ انھوں نے انگریزی طرز کے بال پھر کبھی نہیں بنوائے تھے۔ ان کا مدعا شاید اس سے کچھ اور ہو۔ ایک بار ایسا ہی تذکرہ ہو رہا تھا تو میں نے انھی کی کتاب طبقات میں ایک صفحے پر چھپی ہوئی ان کی تصویر سامنے کر دی اور کہا:

''اُستاد! پھر یہ کیا ہے؟''

'طبقات' اُن کے فلسفیانہ اظہار کی مضمون بندی تھی جو رسمی منطق کی باقاعدہ تعلیم نہ پانے کے باعث مربوط نہ تھی۔ یہی صورت حال ان کی مرتبہ اُردو مترادفات کی تھی، جو لغت نویسی اور رسائی (Acess) کی تکنیک سے دور تھی۔ ویسے یہ کام مرکزی اُردو بورڈ کے ایڈیٹروں کے کرنے کا تھا۔ خود انھوں نے بھی اُردو کا ایک لغت تیار کرنے کی داغ بیل ڈالی رکھی تھی جو شاید زمانے کے نشیب و فراز کا شکار ہو گئی۔

میرے ساتھ ان کے تلطف اور مہر کے کئی شواہد ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں میں نے مکتبۂ زرّیں کے نام سے کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا تو اس کا افتتاح انھی سے کرایا۔ اس تقریب میں مقبول جہانگیر اور حنیف شاہد بھی اُن کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ انھیں اس بات سے بے حد خوشی

ہو رہی تھی کہ بالآخر میں بھی کتابوں کے کاروبار میں آن پڑا ہوں۔ وہ تو دعائیں دے کر رخصت ہوئے کہ "کتاب کا کام تو کسی چوہے کے بل میں بھی کرو گے تو لوگ تم تک پہنچیں گے۔" مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

کئی کئی روز چکر لگانے کے بعد اور مل جانے والے مسودے کی فوراً ہی عکسی نقل کروا کر میں ان کی پوتھی سے اپنے مطلب کی تحریریں حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ "سیارہ ڈائجسٹ" میں آٹھ دس دلچسپ و عجیب واقعات کی قسطیں شائع کیں۔ پورا مسودہ تو اب میری نظر سے گزر چکا تھا۔ میرے خیال میں اس کی تدوین درکار تھی۔ بعض افراد پر دو تین الگ الگ وقتوں کے نوٹ لکھے ہوئے تھے جو میرے خیال میں یکجا ہونا چاہیے تھے۔ بعض کی تفصیل، تشریح یا حاشیہ درکار تھا۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

احسان صاحب فالج کے حملے سے جانبر تو ہو گئے مگر مایوسی اور ڈپریشن نے انھیں بس بٹھا کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنی شادی کے بعد اہلیہ کے ساتھ بھی حاضر ہوتا رہا۔ مگر جلد ہی وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون)

وقت گزرتا رہا۔ کوئی بیس برس بعد ان کے بیٹے ڈاکٹر فیضان دانش کو آپ بیتی کی دوسری جلد شائع کروانے کا خیال آیا تو وہ مسودہ جوں کا توں (اغلاط سمیت) ۲۰۰۱ء میں "جہانِ دگر" کے نام سے شائع ہو گیا۔ "سیارہ ڈائجسٹ" میں جہانِ ثانی کی شائع شدہ بعض قسطیں کتاب میں شامل نہیں کی گئیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ نیز ان میں جو تدوین کی گئی تھی، وہ بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی۔

"جہانِ دانش" بھی دوبارہ شائع ہوئی۔ "جہان، دانش" تو اب ناپید ہے مگر اس کا جو مُلخص میں نے شائع کیا، اسے احسان صاحب کی منظوری حاصل تھی۔ اس لحاظ سے یہ بھی ایک تاریخی چیز ہے اور اصل کتاب کے بازار میں نہ ہونے کے علی الرغم ایک فوری ضرورت پورا کرتی ہے۔ تلخیص کا بنیادی نقطۂ حوالہ "دلچسپی" اور اس دلچسپی کا تسلسل ہے۔

احسان دانش کی آپ بیتی (دونوں جلدوں) پر تنقید و استحسان کا ایک طویل سلسلہ ہونا چاہیے

تھا۔ یہ صرف ایک مزدور شاعر بننے کا قصہ نہیں، ایک علم دوست شخص کی داستان بھی ہے، جو جسم و ذہن پر پھیلے ہوئے عُسرت و جہالت کے کانٹے چن کر آگے بڑھا۔ مفلسی کے گرداب میں پھنسے ہوئے ایک ادیب کی کہانی ہے جو معاشرے کا رہنما بھی ہے اور بلند نگہی سے افراد اور معاشرے کا تجزیہ کرتا، رائے قائم کرتا اور مستقبل کی لکیریں اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی آپ بیتی حسن و محبت کی کہانی بھی اور ایک ایسا افسانہ بھی ہے جو فکر و تخیل کی راہیں وا کرتا ہے۔ اس کے بارے میں احسان صاحب نے جہانِ دگر کے شروع میں فرمایا کہ اس کے بعد ادبی حلقوں میں جرأت ہوئی اور لوگوں نے اپنے سوانح کے معاملے میں سچ بولنا شروع کر دیا۔

اُسلوب کے لحاظ سے جہانِ دانش اُردو کی بہترین آپ بیتی ہے۔ جس نے جوش کی یادوں کی برات جیسی آپ بیتیوں کا غلو پلٹا۔ خودستائی اور غلو کی یہ بڑی مضبوط اور مستحکم روایت تھی، جو حفیظ جالندھری اور سید قاسم محمود تک چلی آئی۔ پھر دیوان سنگھ مفتون اور گیان چند شاطر جیسے لوگوں کی آپ بیتیاں آنا شروع ہوئیں، جو حقیقت نگاری کی اس روش کی پیروی میں تھیں، جس کا آغاز احسان دانش نے کیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریا آبادی اور ملا واحدی کی آپ بیتیاں پہلے ہی ایسے ہی رنگ میں تھیں۔ سادہ مگر رومانی اسلوب کی یہ آپ بیتی اُردو ادب کی پیشانی پر جھومر کے طور پر یاد رہے گی۔

مجھے زندگی بھر یہ احساس رہا کہ اردو کے اس واقعی مزدور شاعر اور اُردو کی اس بہترین آپ بیتی کے حوالے سے مجھے کوئی تحسینی تنقیدی کردار ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ ابتداء میں کسی رسالے کا احسان دانش نمبر شائع کرنے کے لیے میں نے لوگوں سے مضامین لکھوانا شروع کیے بلکہ کتابت بھی کروا لیے۔ ان دنوں میں لاہور سیکریٹریٹ میں مجلس زبان دفتری کے رسالے ''اُردو نامہ'' کا ایڈیٹر تھا۔ مگر یہ مضامین اس رسالے کے دائرہ کار میں نہیں آتے تھے۔ مجھے مقتدرہ قومی زبان میں آنا پڑا تو یہ سارا مال مولانا نعیم صدیقی کے رسالے ''سیارہ'' کے ایڈیٹر فضل من اللہ صاحب کے سپرد کر آیا۔ بعد ازاں انھوں نے ''گوشۂ احسان دانش'' کے نام سے انھیں شائع بھی کر دیا۔ مگر میں مزید کچھ نہ کر سکا۔ ان میں بھی میرا کوئی مضمون شامل نہیں تھا۔

ڈاکٹر گل ناز بانو

تصورِ وقت ''آگ کا دریا'' کے تناظر میں

'آگ کا دریا' قراۃ العین حیدر (مرحومہ) کا شاہکار ناول ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اگرچہ ناول کے میدان میں وہ اس سے پہلے ہی قدم رکھ چکیں تھیں ان کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' اور دوسرا ''سفینۂ غمِ دل'' شائع ہو چکا تھا لیکن 'آگ کے دریا' نے اُردو ناول کی تاریخ میں ان کا درجہ بلند کر دیا سابقہ تخلیقات میں ان کے ہاں فکر و فن کی جو صلاحیتیں ملتی ہیں وہ تمام یکجا ہو کر اس ناول کی تخلیق میں نمودار ہوئیں۔ گویا سابقہ فکری کرنیں پوری آب و تاب اور مکمل کہکشاں کا روپ دھار کر اس ناول میں در آئیں۔

یہ ایک رجحان ساز ناول ہے۔ اس ناول نے اُردو ناول نگاری کے فن کو وسعتوں اور نئی جہتوں سے ہمکنار کیا بعد کے ناول نگاروں نے اس کو نشانِ راہ بنا کر اپنی تخلیقات پیش کیں۔ جن میں 'انسان مر گیا'، 'وشت سوس'، 'خدا کی بستی'، 'تلاش بہاراں'، 'شکست'، 'آنگن'، 'لہو کے پھول'، 'اداس نسلیں'، اور خصوصاً 'سنگھم' منظرِ عام پر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد کی لکھی ہوئی کوئی بھی تخلیق اس ناول تک رسائی نہ پا سکی 'سنگھم' میں نو سو سال کی تاریخ، تہذیب کا بیان ہے جب کہ آگ کے دریا میں ڈھائی ہزار سال کی تاریخ و ثقافت کو احاطہ کیا گیا ہے۔

'آگ کا دریا' مصنفہ کی تمام تر فکری صلاحیتیوں کا نچوڑ ہے۔ یہ ناول قراۃ العین کی تخلیقی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ۷۸۶ صفحات پر پھیلے ہوئے اس ضخیم ناول میں معیّن منصوبے اور منضبط کہانی کے ساتھ ساتھ پوری شرح و بسط سے فرد، زمانہ، وقت، فطرت، موت، ازل، ابد، مادہ، روح، تہذیب و ثقافت، تغیرات و انقلابات زمانہ ان تمام نکات کو انتہائی بلیغ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے ''وقت'' کو بنیاد ٹھہرا کر تمام واقعات اسی کے تار سے منسلک کیے

ہیں۔ چنانچہ ''وقت کے تصور'' کو واضح کرنے کے لیے ٹی ایس ایلیٹ کی ایک نظم کو تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ:

''مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو/ خاتمہ کہیں نہیں ہے صرف اضافہ ہے/ مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھٹتا ہوا تسلسل/ یہ لمحے مستقل ہیں جس طرح وقت مستقل ہے/ وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رہتا ہے/ کرم کے پھل کا خیال نہ کرو آگے چلو/ الوداع نہیں بلکہ۔۔۔۔ آگے بڑھو'' [1]

قراۃ العین کوئی فلسفی نہیں۔ فلسفے کے بجائے تاریخ سے ان کے فن کو مناسبت ہے حقیقت یہ ہے کہ اس ناول میں بھی انہوں نے تاریخ کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لیے بعض فلسفیانہ خیالات کو بھی اپنی زبردست ذہانت اور گہرے تعقل سے پیش کیا ہے۔ جن میں ایک ''تصور وقت'' ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یقیناً اردو کی باخبر اور صاحب مطالعہ افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کے وسیع اور متنوع تجربات میں علوم و فنون اور جدید افکار و خیالات سے واقفیت بھی ہے جو انہیں اپنی حدود میں قابل ذکر دانشور بناتی ہے۔ اس ناول میں ''وقت'' ایک مجسم شخصیت ہے وہ انسان کا رفیق، نگراں اور معاون ہونے کے ساتھ ساتھ مخالف اور رقیب بھی ہے وہ کہتا ہے:

''میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں سارے فیصلے سارے ارادے میری وجہ سے خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں ابھی تم پر اور بھی مصیبتیں آئیں گی لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھا دوں گا۔ اب مجھ سے صلح کر لو میں اب بھی موجود ہوں۔'' [2]

'آگ کے دریا' میں دریا علامت ہے وقت کی۔ دریا وقت کی طرح رواں دواں اور اس کی لہریں لمحوں کی طرح مسلسل ہیں وقت اور دریا دونوں کے دھارے اپنے جلو میں بے شمار چیزوں کو لیے بہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم جیسے دنیا پرستوں کو اس حقیقت کا شعور نہیں۔ اس ناول میں 'گوتم نیلمبر' کا گروہ شروع سے ہی اس پر یہ راز منکشف کرتا ہے:

''وقت کے سامنے کوئی رشتہ نہیں، کوئی منطق، کوئی طاقت، وقت پر تمہارا قابو نہیں رہ سکتا۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا ہے۔'' [3]

اور اسی طرح کہتا ہے کہ:

''وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا وقت سے تم بچ نہیں سکتے۔'' [۷]

''وقت'' ناول کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں گوتم نیلمبر کی ذہنی وفکری کشمکش اور کائنات وفطرت کے مختلف اسرار و رموز کو جاننے کے کرب و اضطراب کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ شراوستی کے قریب پرشوتم آشرم میں گیان ودیا حاصل کرنے کے لیے آیا ہوتا ہے۔ اس کے بے چین ذہن میں مختلف سوالات ابھرتے ہیں۔ کہ وقت کیا ہے؟ اس کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت ہے کیا وقت خدا ہے؟ کیا یہ کبھی ختم بھی ہوتا ہے کہ نہیں؟ وہ دکھ سکھ اور نروان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ وہ ایک فلسفی کردار ہے جو ان سوالات کے جوابات پانے کے لیے ذہنی وفکری اذیت میں مبتلا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف گوتم ہی اس کشمکش میں مبتلا نہیں بلکہ وہ اپنے ساتھ اس ناول کے قاری کو شاملِ جستجو کرتا ہے۔ اور وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی وقت، موت، زندگی، خوف اور خود انسان کیا ہے؟ لیکن مصنفہ نے ان تمام سوالات کے جوابات بڑے تشفی بخش انداز میں پورے ناول میں جابجا دینے کی کوشش کی ہے۔ وقت اور انسان کے متعلق ان کا یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ وقت تبدیلی تغیر اور تجدید کا نام ہے۔ وقت ایک ایسی حقیقت ہے جو قائم و دائم ہے۔ یہ سب کچھ فریب نظر ہے۔ اصل حقیقت وقت ہے وقت سب کو متاثر کرتا ہے۔ اور خود ویسے کا ویسا رہتا ہے۔ یہ وقت ہی ہے جو گوتم کو مختلف روپ دیتا ہے۔

ودیارتی، مصور، بت تراش، گائیک، کلاکار، ڈرامہ نگار، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ذمہ دار افسر، بیوروکریٹ سفارت کار بنا تا ہے۔ یہ مسلّم حقیقت ہے کہ وقت کا دریا اپنی تند و تیز لہروں کے باوجود بھی انسان کو نہیں لپیٹ سکتا وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ انسان وقت کی طرح مختلف روپ بدل کر آئے گا۔ وقت انسان کو ختم بھی کرتا ہے اور دوبارہ جنم بھی دیتا ہے۔ گویا کہ وقت اور انسان لازم و ملزوم ہیں اسی لیے تو ناول کے آخر میں گوتم کہتا ہے کہ:

''میں تیری سطح پر کھڑا ہوں میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے کوئی زخم نہیں

لگے ہیں سالم ہوں مجھے کوئی ختم نہیں کرسکتا۔" ۵

اسی "وقت" نے گوتم کو ختم کیا تو ابوالمنصور کمال الدین کو پیدا کیا۔ گوتم ہندو تہذیب و معاشرت کا علمبردار تھا وہ ایسی تہذیب کا فرد تھا جو کسب علم کے لیے نفس کشی کو ضروری سمجھتے تھے جو سرجو کی ندی تیر کر پار کرتا ہے اور جس کی تعلیم میں ماس اور عورت سے کنارا کشی کا درس دیا جاتا ہے۔ جب کہ منصور نئی تہذیبی اور معاشرتی صداقتوں کو پیش کرتا ہے۔ یہ ہندوستان کی سرزمین پر مشرق وسطیٰ سے وارد ہوتا ہے۔ اور اس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کر لیتا ہے۔ یہ ناول کا دوسرا دور ہے۔ جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور پھر ان کی یہاں حکومت قائم کرنے کو مختصراً بیان کیا ہے اور یہی منصور مختلف نشیب و فراز سے گزرتا ہوا بالآخر بھارت کی سرحد پار کر کے نئے ملک جا بستا ہے۔

ناول کے تیسرے دور میں سرل ایشلے انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور ان کی اجارہ داری کی نمائندگی کرتا۔ یہ ناول کا آخری حصہ جدید تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان سارے ادوار میں وقت ساتھ ساتھ چل رہا ہے کئی تہذیبیں اجڑیں کئی نئی قائم ہوئیں ان تمام حالات میں "وقت" بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس ناول کی کہانی کسی ایک شخص کی سرگزشت نہیں اور نہ ہی کسی ایک طبقے، گروہ یا کسی خاص ماحول و حالات میں رہنے اور بسنے والوں کی کہانی ہے بلکہ یہ ایک ایسی سرگزشت آدم ہے جسے قرن با قرن نئے نئے ماحول اور تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور جس نے نئی نئی تہذیب، ثقافت اور فلسفوں کو جنم دیا جو ہر لحہ "وقت" کے عجیب و غریب اور ناقابل فہم طلسم میں گرفتار رہا۔

یہ فکر و فن دونوں حوالوں سے اردو ادب کا شاہکار ناول ہے۔ اتنے وسیع کینوس پر پھیلے ہوئے ناول کو انتہائی منظم پلاٹ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تمام واقعات تسلسل کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ فلسفیانہ افکار کے ساتھ ساتھ وسیع تناظر میں تقسیم ہند، معاشرتی مسائل اور استحصالی اقدار کو بھی موضوع بنایا گیا۔ واقعات کی عمدہ ترتیب کے علاوہ ناول میں قابل تحسین بات لکھنوی تہذیب کی عکاسی اور مناظر کی عمدہ جلوہ افروزی بھی ہے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی اور گلفشاں کے مکان اور مکینوں

کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ تمام آنکھوں کے سامنے ایک خاص ماحول پیش کرتے ہیں۔ اور قاری اپنے آپ کو اسی جگہ پر موجود پانے لگتا ہے اور یہ واقعی انہی کے قلم کا اعجاز ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے بجا طور پر لکھا ہے:

''اس وسیع ناول کی تعمیر و تنظیم نہایت بلند سطح پر ہوئی ہے ہزاروں سال پرانی ثقافت کی تصویر فلمی مناظر کی طرح دکھائی گئی ہے لیکن اس کا جوڑ اس چابکدستی سے ملایا گیا ہے کہ تسلسل میں کہیں ضعف نہیں آتا۔'' [۶]

اس ناول کی تخلیق کے بعد بعض نقادوں نے قراۃ العین پر مغرب پرستی اور تقلید مغرب کا لیبل لگایا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ناول ورجینا وولف اور جیمس جوائس سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ادب میں متاثر ہو کر کوئی تخلیق تحریر کرنا جرم نہیں ہے۔ لیکن دیکھا یہ جانا چاہیے کہ یہ تخلیق کس درجہ بڑھ کر ہے یا کم تر ہے۔ قراۃ العین حیدر کا یہ ناول ان انگریزی مصنفین سے بہت آگے بڑھ گیا ہے ان کے ہاں خود بینی ملتی ہے جب کہ آگ دریا میں جہاں بینی اور دور بینی کا ایک جہان آباد ہے۔ ان کے ہاں ظاہری رنگ ہے۔ جب کہ اس ناول میں ظاہر و باطن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

یہ ایک بلند پایہ ناول ہے جو کہانی، اسلوب، اظہار زبان و بیان، تاریخ و فلسفہ ہر حوالے سے مکمل اور جامع ہے۔ روایتی انداز میں کہانی نہیں لیکن کہانی سے زیادہ مزید اور دلچسپ ہے۔ فلسفہ نہیں ہے لیکن فکری گہرائیوں سے بھرپور ہے تاریخ نہیں لیکن اس کے ہر صفحے پر تاریخی صداقتوں کا فنکارانہ اظہار و بیان ملتا ہے۔

'آگ کے دریا' کے بعد تو یہ گمان ہوا کہ اس تخلیق کے بعد مصنفہ کا قلم کچھ اور کہنے کی تاب نہیں رکھے گا۔ لیکن انہوں نے تو ''آخر شب کا ہمسفر'' ''چاندنی بیگم'' ''گردش چمن'' جیسے ناول لکھ کر اپنی تخلیقی قوت و توانائی کا اور بھی گہرا ثبوت دیا ہے۔

حواشی

۱۔	آگ کا دریا	قراۃ العین حیدر	صفحہ نمبر ۸
۲۔	آگ کا دریا	قراۃ العین حیدر	صفحہ نمبر ۵۱۔۶۵۰
۳۔	آگ کا دریا	قراۃ العین حیدر	صفحہ نمبر ۵۹
۴۔	آگ کا دریا	قراۃ العین حیدر	صفحہ نمبر ۵۹
۵۔	آگ کا دریا	قراۃ العین حیدر	صفحہ نمبر ۷۸۶
۶۔	آگ کا دریا	قراۃ العین حیدر	صفحہ نمبر ۳۴۵

کتابیات

کتاب	مصنف	سن اشاعت	ناشر
آگ کا دریا	قراۃ العین	۱۹۶۸ء	رشید احمد چودھری
اردو ناول کا نگار خانہ	کے کے کھلر	۱۹۹۱ء	بشیر ربانی لاہور
ادب اور جدلیاتی عمل	سجاد حارث	۱۹۷۲ء	شاہ علم مارکیٹ لاہور
بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	۱۹۹۵ء	ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو
اردو ناول نگاری	سہیل بخاری	۱۹۴۰ء	لاہور
اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۱۹۶۲ء	لکھنو
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	سہیل بخاری	۱۹۶۶ء	میری لائبریری لاہور

رضیہ کاظمی ☆

سید مومن حسین شعلہ کراروی

آپ کی پیدائش ۱۹۰۱ء میں الہ آباد (موجودہ کوشامبی) کے مشہور قصبہ کراری کے ایک اعلیٰ نسب سیّد گھرانے کے محلہ بارہ دری میں ہوئی تھی۔ آپ کی والدہ کا انتقال جب آپ دو سال کے تھے تب ہی ہو گیا تھا پرورش بڑی امّاں (نانی) کے ذریعہ عمل میں آئی۔ آپ کے والد سید فخر الدین حسین اپنے علاقہ میں عالم سمجھے جاتے تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ خود شاعر تو نہ تھے مگر انھیں علم عروض پر اچھی دستگاہ تھی۔ ان کے شعروادب سے لگاؤ ہی کا سبب ہوگا کہ والد صاحب نے ۱۳ سال کی عمر سے ہی شاعری کی ابتدا کر دی تھی۔ قصبہ کراری سے مڈل پاس کرنے کے بعد والد صاحب بغرض تعلیم الہ آباد آگئے اور ماڈرن اسکول میں داخلہ لیا۔ ابھی آپ انٹرمیڈیٹ ہی میں زیرِ تعلیم تھے اور آگے وکالت کی طرف جانے کا ارادہ تھا کہ اچانک ان کے والد حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے دنوں بڑے بھائیوں کی جانب سے کوئی مالی امداد فراہم نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کو خیر باد کہنا اور ملازمت کی طرف رخ کرنا پڑا۔ شاعری میں آپ نے اپنے والد کی ہدایت کے مطابق جناب نیساں شاگرد حضرت ناسخ لکھنوی سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد جناب محبوب حسین صاحب تحمّل کی شاگردی اختیار کی جلد ہی آپ نے غزل گوئی میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ مقامی مشاعروں کی روح رواں بن گئے اس زمانہ میں زیادہ تر طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ ہر اسکول کالج میں مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے آپ قریب قریب ہر مقامی مشاعرہ میں مدعو کیے جاتے آس پاس کے اضلاع میں بھی

☆ دخترِ جناب شعلہ کراروی (مرحوم)

اکثر شرکت کیا کرتے کہیں کہیں صدارت کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے مختلف مقامی ادبی انجمنوں جیسے بزم ادب، روح ادب، سفینۂ ادب ریاض ادب اور اردو اسٹڈی سرکل میں سے کسی کے ممبر اور کسی کے سکریٹری تھے۔ابتدا میں آپ کا اپنا کلام جمع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔۱۹۵۵ء میں ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد کے کلام کو اکٹھا کرنا شروع کیا دیوان کی طباعت کی تحریک امریکی شہر ہیوسٹن سے ہوئی وہاں آپ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں اپنے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر ظفر حسنین تقوی (جو ابھی تک اسپیس سینٹر ناسا سے منسلک رہے ہیں) کے یہاں تشریف لے گئے تھے وہاں انھوں نے بہت اچھی ادبی فضا قائم کر رکھی ہے اور ایک اچھے شاعر بھی ہیں ہیوسٹن میں بحیثیت شاعر شعلہ صاحب کی بہت عزت افزائی ہوئی۔یہیں سے ان کے ذہن میں اپنے دیوان کی طباعت کا خیال پیدا ہوا جو ۱۹۸۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔اسی سال ماہ مئی میں 'نغمۂ فکر' کے نام سے ان کا دیوان طبع ہو کر منظر عام پر آیا اس میں زیادہ تر غزلیں، چند سہرے اور کچھ تاریخیں ہیں۔تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا آپ کی نکالی ہوئی تاریخوں میں پروفیسر احتشام حسین، نوح ناروی، ڈاکٹر اعجاز حسین اور سکھ دیو پرشاد بسمل کی تاریخیں خاص ہیں طوالت کے لحاظ سے صرف ایک ایک شعر ہی پیش خدمت ہے:

فکر تاریخ جب ہوئی شعلہ   کہدیا ، آہ ناخدائے سخن
۱۳۸۲ھ

بہر تاریخ فکر شعلہ گرفت   "گفتمش" احتشام خلد آباد
۱۳۹۲ھ

عیسوی سن میں لکھو شعلہ یہ تاریخ وفات   مرغ بسمل کیوں نہ ہو اردو ادب بسمل کے بعد
۱۹۸۵

خود اپنے دیوان کے لیے قطعۂ تاریخ اس طرح لکھا:

نغمۂ فکر سال ہجری میں   میرے دیوان کی ملی تاریخ

نغمۂ فکر سے شرف بھی ملا اور ملی شعلہ عیسوی تاریخ
نغمۂ فکر ۱۳۹۵
شرف ۵۸۰ ۱۹۸۵

دیوان کے طبع ہونے تک ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں تھی لیکن کتاب میں ان کا تعارف جناب فراق گورکھپوری نے لکھا اس میں سے کچھ اقتباسات اس طرح ہیں (۱) ''ان کے کلام میں استادانہ شان ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل یا باک نہیں ہے کہ شعلہ صاحب ان معدودے چند ہستیوں میں ہیں جنھیں ماہرین فن میں شمار کیا جا سکتا ہے (۲) شعلہ صاحب کے یہاں نہایت متوازن موزونیت ہوتی ہے ان کے کلام میں کہیں جھول نہیں پیدا ہوتا ہر لفظ نگینے کی طرح اپنی جگہ پر جڑا ہوا ہوتا ہے اور مخصوص معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ ان کے الفاظ میں مفہوم کے ساتھ ایک معنویت بھی ہوتی ہے اور اشاریت و کنایت بھی، ان کی شاعری بہت سوچی اور سمجھی ہوئی فنکاری ہے''

جناب ڈاکٹر عقیل صاحب نے ان کے بارے میں لکھا ہے

''شعلہ صاحب زبان و بیان اور محاوروں کے استعمال کے سلسلہ میں بہت محتاط ہیں وہ لکھنؤ اسکول کے اساتذہ کے پیرو ہیں اور اس لیے ان باتوں پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ بعض شعراء خیال اور مضمون کی تلاش میں زبان اور اس کے محل استعمال سے اکثر بہت دور چلے جاتے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ بات شعلہ صاحب کے یہاں نہیں ہے''

ڈاکٹر جعفر رضا صاحب نے دیوان کے پیش لفظ میں لکھا۔۔

''انھیں فارسی زبان و ادب سے ذاتی اور والہانہ دلچسپی ہے وہ اگر ایک طرف رومی، جامی، حافظ، سعدی، نظیری، عرفی، وغیرہ کے قائل ہیں تو دوسری طرف میر، سودا، آتش، ناسخ، غالب اور انیس سے متاثر ہیں اس لیے ان کی خصوصیت ہے کہ ہند ایرانی شاعری کے مختلف اسالیب اور انداز کسی نہ کسی شکل میں ان کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ تصوف کا مسلک جداگانہ ہے۔ انھوں نے انصاف دوستی کا درس تصوف کے بجائے عقائد اسلامی کی تابناکیوں سے حاصل کیا ہے ان کے دیوان کو

پرانی طرز شاعری کے ہمنواؤں نے تو سراہا لیکن جدیدیت کے علم برداروں نے اس پر خاص توجہ نہیں دی'' جب 'نغمہ فکر' کی اشاعت کے بعد آپ نے اپنا کلیات مرتب کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کے قصائد، نعت اور سلام وغیرہ کا پورا غیر مطبوعہ کلام گھر سے لاپتہ ہو چکا تھا اس حادثہ کا غم آپ کے دل سے تادم مرگ نہیں گیا۔ ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے اور کف افسوس ملا کرتے۔ دھیرے دھیرے ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا ہو گئے غصہ بہت کرنے لگے تھے۔ اگست ۸۸ء کو والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد کافی خاموش رہنے لگے تھے خوراک بہت مختصر ہو گئی تھی پیروں سے چلنے سے معذور ہونے لگے کمزور ہوتے گئے جو اصحاب تیمارداری کے لیے آتے ان سے فرماتے کہ مرنا برحق ہے۔ بس میرا بھی وقت آچکا ہے۔ عقیدت منداحباب واعزاء اکثر روتے ہوئے واپس لوٹتے۔ آخرش ۲۲ فروری ۱۹۸۸ء کو علی الصبح یہ شعلہ خاکستر میں تبدیل ہو گیا۔ بعد عصر دریاباد کے مقامی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جناب ثمر بلوری صاحب نے قطعہ تاریخ لکھا۔

ہے شہر میں اداسی ماحولِ رنج وغم ہے سنتے ہیں ایک مومن نے کی ہے آج رحلت
خاموش سی فضا ہے اس گھر کی اے ثمر کیوں مومن حسین شعلہ کیا ہیں مقیم جنت

جانب داری کے الزام کے خوف سے میں نے ان کی شاعری کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں پیش کی۔ چند غزلوں کے اشعار پیش کر کے ہی میں ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اندازہ قارئین کے ادبی شعور پر چھوڑ رہی ہوں:

طرحی مشاعرہ ماہنامہ نخشب مصری باغ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء

نام لے کر جو ترا آگ سے کھیلا ہوگا ہاتھ میں اس کے چراغ ید بیضا ہوگا
رشتہ عمر جو ٹوٹا بھی تو پھر کیا ہوگا فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا ہوگا
نالہ سنجی عنادل وہی سمجھا ہوگا آشیاں جس نے اجڑتے ہوئے دیکھا ہوگا
اتنا ہی حسن کا انداز جفا ہوگا پست جتنا معیار وفا عشق کا اونچا ہوگا
راہ الفت میں قدم رکھنے سے پہلے اے دل کچھ تو دستور محبت کو سمجھنا ہوگا

کچھ وہی سمجھے گا دنیا کے نشیب اور فراز　　زندگی کے جوہر اک موڑ سے گزرا ہوگا

چراغاں ہولگا کر آگ جب ان کے نشیمن میں　　منائیں عید مرغان چمن کس طرح گلشن میں
کبھی تو سوچتے ہندو مسلماں بیٹھ کر من میں　　نہ جانے کھو چکے کیا کچھ نہ ہم آپس کی ان بن میں
اسی کو اب نہیں رہنے کا حق اپنے نشیمن میں　　بھرا ہے رنگ جس نے خون سے تصویر گلشن میں
نگاہ باغباں میں خار کی صورت کھٹکتا ہے　　وگرنہ چار تنکوں کے سوا کیا ہے نشیمن میں
میں سمجھوں مل گئی داد وفا عشق و محبت کی　　جو میرے دل کی دھڑکن ہو تمہارے دل کی دھڑکن میں

قطعہ

نہ ایں پر ناز کرتے ہیں نہ آں پر ناز کرتے ہیں　　نہ علم و فن نہ معنی و بیاں پر ناز کرتے ہیں
کوئی استاد فن کوئی ہے استاد سخن شعلہ　　مگر ہم خدمت اردو زبان پر ناز کرتے ہیں

عبدالمتین منیری۔ بھٹکل۔ کرناٹک۔ (انڈیا)

ڈاکٹر کلیم احمد عاجز

(عظیم آباد کی تہذیب کے آخری حدی خواں۔ میر تقی میر کی شعری روایت کے امین)

دیکھیئے میری غزل میں کبھی صورت اپنی　　یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے

اس شعر کے خالق اور عظیم آباد کے تہذیبی گہوارے کے آخری حُدی خواں، میر تقی میر کی شعری روایت کے امین عظیم شاعر وادیب ڈاکٹر کلیم احمد عاجز آج مورخہ ۱۵ فروری ۲۰۱۵ء اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے ساتھ وضع داری اخلاق ورواداری کی ایسی انمول روایات لے گئے جو دور دور تک اب ڈھونڈے سے نہیں ملیں گیں۔ آپ کی رحلت کے ساتھ اردو شعر ادب کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی اب شاید ممکن نہ ہو، عاجز صاحب نے ایک طویل عمر پائی۔ آپ کی ولادت ۱۹۲۰ء کو پٹنہ میں ہوئی تھی۔

جس طرح موسی ندی کی باڑھ اپنے ساتھ شہنشاہ رباعیات امجد حیدرآبادی کے پورے اہل خانہ کو بہالے گئی تھی، کچھ اس سے بھی زیادہ بھیانک انداز میں تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ پھوٹ پڑنے والے فسادات کی آگ نے آپ کے خاندان کے سبھی افراد کو اپنی لپٹوں میں جکڑ کر راکھ کردیا تھا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آپ کی والدہ اور چھوٹی بہن سے ملاقات ہوئی تھی، اور دس روز بعد ۵ نومبر ۱۹۴۶ء کو عید الاضحی کے روز ان دونوں کا قتل ہوگیا۔ یہ ایک ایسا حادثہ جانکاہ تھا کہ جس کے غم نے اردو ادب کو (وہ جو شاعری کا سبب ہوا) غزلوں کے مجموعے کے ساتھ اس کے مقدمہ کی شکل میں نثری اور سوانحی ادب کا ایک شہ پارہ دے دیا اور یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ کلیم صاحب بڑے شاعر تھے یا

نثر نگار۔

پے در پے غموں اور تنہائی نے کلیم عاجز کو میر تقی میر کے اسلوب اور روایات کا امین بنا دیا، اس درد و الم میں آپ کے فکر و قلم سے اشعار کا نزول ہونے لگا، یہ اشعار دوسروں کو سنانے اور واہ واہ بٹورنے کے لیے نہیں تھے بلکہ دل و دماغ پر طاری ایک کیفیت تھی جو اشعار کی شکل میں ڈھل رہی تھی وہ کسی کی نقالی نہیں تھی بلکہ ایک الہامی اسلوب تھا، جس کا جادو شعری محفلوں میں سر چڑھ کر بولتا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب "مشاعروں کے بازار میں مشاعرہ بازوں نے اس اسلوب کی نقالی کرتے ہوئے "کرہو بھرو ہو" جیسی تعبیرات پیش کرنی شروع کیں تو مشفق خواجہ جیسے نقادوں نے توجہ دلائی کہ یہ اسلوب صرف کلیم عاجز ہی پر بجتا ہے۔ یہ لہجہ کسی اور کے ماتھے کا جھومر نہیں بن سکتا۔ کلیم عاجز نے اپنے لیے جو شاعری کی وہ دکھی اور کچلے دلوں کی آواز بن گئی۔ اس کی ہر کاٹ توپ و تفنگ کے وار سے زیادہ بھاری پڑتی تھی، لال قلعہ کے سالانہ مشاعروں میں اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے سامنے پیش کیے گئے بہت سے اشعار اور شعری تلمیحات ادب عالیہ اور جرأت رندانہ کے اعلیٰ نمونے شمار ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب بھی ظلم ہو، معصوموں کا خون ناحق بہے درندگی کا ننگا ناچ کھیلا جا رہا ہو۔ آپ کے اشعار اس حوالے سے جتنی مرتبہ اور بار بار صحافت سیاست اور میڈیا کے میدانوں میں دھرائے گئے۔ اتنی بڑی تعداد میں یہ شاذ و نادر ہی دوسرے شعراء کے حصے میں آئے۔ نقاد کہتے ہیں کہ عظیم شاعر وہ ہوتا ہے جس کے شعری ذخیرے سے چند اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جائیں اور موقع بہ موقع زبان پر آجائیں۔ اس کسوٹی پر آپ کے کلام کو پرکھا جائے تو شاید دوسرا کوئی اور معاصر شاعر آپ کا ہم پلہ نہیں بن سکتا، عاجز صاحب کی رحلت شعر و ادب کے ایک دور کا خاتمہ ہے۔

کلیم عاجز صاحب دینی اقدار کے امین تھے وہ عرصہ تک صوبہ بہار میں تبلیغی جماعت کے امیر رہے۔ وہ اسلام کی آفاقیت کے قائل تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی اعلیٰ قدروں کو دنیا کے تمام افراد تک پہنچانے کے لیے اس پر ہمیشہ اسلام کا لیبل لگانے سے دعوتی نقطہ نظر سے نقصان ہو

رہا ہے۔اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا طبقہ اسلام کا نام سن کر ان اقدار کو سنے بغیر ہی ان میں میں میخ نکالنے لگتا ہے۔اور تعصب کی دیوار حق بات پہنچانے میں آڑے آجاتی ہے، لہٰذا وہ ادب میں حلقہ بندیوں کے مخالف تھے وہ سمجھتے تھے ادب کی اسلامی اور غیر اسلامی حد بندی کر کے، اسلامی اقدار کی اشاعت میں رکاوٹ پڑ رہی ہے۔اقبالؒ پر اسلامی شاعر کا لیبل لگا کر ہم نے ان کا بڑا نقصان کر کے اس کی آفاقیت پر روک لگادی ہے ان کا کہنا تھا کہ اردو زبان کسی ایک دین کے ماننے والوں کی جاگیر نہیں ہے اسے غیر مذہب کے لوگوں نے سنوارنے اور مقبول بنانے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا اردو بولنے والے غیر مسلموں میں ایسے افراد کی بڑی تعداد رہی ہے جو حد بندی کے بغیر اسلامی و مشرقی اقدار کی پابند رہی ہے لیکن جب سے مسلمانوں کی بے سمجھی سے یہ زبان پڑوسی ملک کی قومی زبان اور مسلمانوں کی زبان بن گئی ہے اب گنگا جمنی کی صفت اس زبان سے ختم ہوتی جارہی ہے اب غیر اقوام میں اردو زبان کی ترقی میں حصہ لینے والے پیدا ہونے کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔آپ نے طویل عرصہ تک پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے اردو کے فروغ میں حصہ لیا وہ یہاں پر اردو کے عظیم شاعر جمیل مظہری کے جانشین بنے تھے۔آخری سالوں میں آپ کے قلم سے کئی ایک کتابیں، ''جب فصل بہاراں آئی تھی'' ''پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا'' ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' ''ابھی سن لو مجھ سے'' ''کوچہ جاناں'' ''مجلس ادب'' ''دیوانے دو'' ''میری زبان میرا قلم'' ''دفتر گم گشتہ'' وغیرہ نکلیں۔

ہم نے آپ کو پہلے پہل ۱۹۸۱ء میں دبی شیراتون میں منعقدہ پہلے عالمی مشاعرے میں دیکھا تھا، اپنے معیار اور استاد شعراء کی شرکت کی وجہ سے ایسا مشاعرہ پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا حالانکہ اس کے بعد دبی میں منعقد ہونے والے تقریباً سبھی عالمی مشاعروں میں شرکت کا ہمیں موقعہ نصیب ہوا اس وقت آپ کے پیش کردہ کلام کی ریکارڈنگ ہماری ویب سائٹ اردو آڈیو ڈاٹ کام میں سنی جاسکتی ہے۔۱۹۶۷ء میں آپ کا پہلا مجموعہ کلام (وہ شاعری کا سبب ہوا) شائع ہوا تھا اس پر فراق گورکھپوری نے فلیپ لکھا تھا، اس کا اجرا صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ہوا تھا

لیکن یہ ایڈیشن عام قاری کی دست رست سے باہر رہا اور زیادہ تر افراد اس کتاب سے ناواقف ہی رہے۔ اس کا اہم سبب یہ تھا کہ کتاب کی اشاعت میں آپ کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، احباب آپ کے کلام کو ضائع ہونے سے بچانا چاہتے تھے، عاجز صاحب یک ایسی روایت کے امین تھے جہاں کاروباری ذہنیت معیوب تھی وہ چاہتے تھے کہ ان کا کلام ان افراد کے ہاتھوں تک پہنچے جن کے پاس آپ کے کلام کے سامنے روپے پیسوں کی کوئی اہمیت نہ ہو ہر قیمت پر وہ اسے حاصل کرنے کے لیے تیار ہوں لہٰذا کتاب بڑے اعلیٰ معیار پر محدود تعداد میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی اس کا ہدیہ عام قاری کی دسترس سے باہر رکھا گیا دہلی میں امریکی سفارت خانے نے بڑی قیمت دے کر اسے خریدا اور اپنے جملہ مرکزی کتب خانوں کی زینت بنایا، عام قاری اس کا نام سنتے ہی رہ گئے۔ اسی طرح دو ایک سال بعد اس کے ایک اور محدود تعداد میں خوبصورت ایڈیشن کا دہلی میں اجراء عمل میں آیا، یہ بھی ناپید ہو گیا لیکن آپ کے کلام کی خوشبو مشک و عنبر کی طرح فضاؤں میں مہک رہی تھی، آپ کے مجموعہ کلام کے حصول کی تڑپ باذوق افراد میں رہ رہ کر جاگ رہی تھی لیکن عاجز صاحب اسے ریوڑیوں کی طرح بے قدری سے بانٹنے کے روادار نہیں تھے وہ چاہتے تو اپنے مجموعہ سے بہت کچھ دولت کما سکتے تھے لیکن انہیں دولت سے زیادہ اس کی قدر و عزت اور اس کے لیے ہونے والی تڑپ عزیز تھی، اس کے بعد آپ کے مضامین کا مجموعہ جہاں (خوشبو ہی خوشبو تھی) اور دوسرا مجموعہ کلام (جب فصل باراں آئی تھی) شائع ہوئے تو خوش قسمتی سے اس وقت اردو بک ریویو دہلی میں آرہ کے پروفیسر رضوان اللہ صاحب نے اس پر بہت خوب صورت تبصرہ لکھا جس سے عاجز صاحب کی کتابوں تک رسائی کا ایک ذریعہ مل گیا اس مجموعہ کی بھی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن ہم نے اس کے کئی نسخے دبی کے پتے پر منگوا لیے اور عاجز صاحب سے ربط و تعلق اور مراسلت کی ایک راہ نکل آئی۔

اُس وقت صرف ہمارے دوست نہیں بلکہ بزرگ بھی مرحوم مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب بانی مہتمم جامعہ سبیل السلام حیدرآباد بقید حیات تھے اللہ تعالیٰ نے علم دین کے ساتھ بڑا

صاف ستھرا ادبی ذوق انہیں دیا تھا جید صاحب قلم ایک زمانے میں حیدرآباد سے ''نوید دکن'' نکالا تھا پھر سیاست میں ہفتہ وار کالم لکھا کرتے تھے جب دہلی میں آتے تو رمضان میں تراویح کے بعد ہمارا مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا تو سحری کا وقت ہونے کا پتہ نہیں چلتا تھا، انہوں نے ہم سے کہا کہ (وہ شاعری کا سبب ہوا) لوگ پڑھنا چاہتے ہیں، لیکن عاجز صاحب اسے چھپوانے کے لیے تیار نہیں ہمارے خاص الخاص تعلق کے آدمی ہیں لیکن یہاں ہمارا تعلق بھی کام نہیں آرہا ہے۔ سبیل السلام میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار ہونے جارہا ہے اگر اس کی اشاعت کے لیے کوئی ڈول ڈال سکتے ہوں تو آپ کی کرامت سمجھوں گا۔

کہاں بھٹکل دبی اور پٹنہ، عاجز صاحب سے ہماری شناسائی صرف ان کی کتابیں پڑھنے اور کلام سننے کی حد تک تھی، رضوان صاحب تو ان کے گھر کے آدمی تھے لیکن قربان جایئے اس وضع داری اور بھولے پن پر کہ جب ہم نے عاجز صاحب کو خط لکھا تو فوراً رضوان صاحب کے توسط سے کتاب کی اشاعت پر راضی ہوگئے اور ان کے پاس اپنی کتاب کا جو اکلوتا نسخہ تھا وہ اور کتاب کے پہلے ڈیلکس ایڈیشن کی پلیٹیں ڈاک سے بھیج دیں کہاں یہ رخ کہ دبی سے چھپے نسخہ کی قیمت پانچ سو درہم (دوگنی سونے کی قیمت کے برابر) کہ ہم جیسا کوئی اسے خریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور مال کے تعلق سے شاعر موصوف کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ رضوان القاسمی مرحوم کا شائع کردہ بھی نسخہ ہندوستان میں عام قاری کے ہاتھوں تک پہنچا، ہمارا خیال ہے طلب کے باوجود گذشتہ پندرہ بیس سال میں اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن نہیں نکلا۔ یہ کتاب کلیم عاجز کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

کتاب کی اشاعت کے چند ہی دنوں بعد ۱۹۹۷ء میں پچاس سالہ جشن آزادی کے موقعہ پر بھٹکل میں نوجوانوں کی تنظیم وائی یم لیس یم نے سیرت کوئز اور نعت کا ایک مقابلہ رکھا جس کے لیے عاجز صاحب کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی، خوش قسمتی سے ہمیں بھی اس موقعہ پر ساتھ رہنے کا موقعہ ملا، خوب چہکے، عادت کے برخلاف بہت سارا کلام مجلسوں میں سنایا، طلبہ واساتذہ سے بھی خوب گھل مل گئے ایسا لگا کہ جیسے اپنے ہی گھر میں آئے ہیں جامعہ

اسلامیہ بھٹکل میں پہانی، ہردوئی کے ہمارے حافظ کبیر الدین صاحب وغیرہ اساتذہ کی محنت سے آپ کے اعزاز میں ایک شعری نشست منعقد ہوئی جس میں طلبہ نے آپ ہی کا کلام بڑے خوبصورت لب ولہجہ میں پیش کیا۔ بھٹکل میں وہ اتنے خوش ہوئے کہ ایک ایک پرانے محلے اور مسجد کا غور سے مشاہدہ کیا اتنی اپنائیت کا اظہار کیا کہ ہمیں خجالت سی محسوس ہونے لگی، اپنی کتابیں بھی طلبہ میں بڑی مقدار میں مفت بانٹیں یہاں ان کی مال ودولت سے بے نیازی فقیرانہ قلندرانہ زندگی۔ عبادت وللّٰہیت میں مگن ایک ایسی شخصیت کا مشاہدہ سامنے آیا جسے بیان نہیں کیا جاسکتا خالص غزل کے لہجے کے عظیم شاعر کی ایسی پاکیزہ زندگی کسی اور شاعر میں پھر شاید ہی دیکھنے کو ملے کلیم عاجز کے اٹھ جانے سے نہ صرف اردو دنیا کا ایک عظیم سرمایہ لٹ گیا ہے بلکہ ایک ایسے اہل اللہ اور داعی سے بھی ہماری سرزمیں خالی ہوگئی ہے۔ جن کی موجودگی اللہ کے بہت سے عذابوں سے حفاظت کا سبب بنتی ہے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند کرے۔ آمین۔

*****

شیما بتول

روشنی کا سفر

ظلمتوں میں روشنی کا دل بڑھاتے جایئے ۔۔۔ اپنی جانب سے بھی کچھ شمعیں جلاتے جایئے
واقعہ کہتا ہے یہ بے چہرگی کا دور ہے ۔۔۔ تجربہ کہتا ہے آئینہ دکھاتے جایئے
مجھ کو عاصیؔ زندگی نے یہ سزا تجویز کی ۔۔۔ دل لہو ہو جائے لیکن مسکراتے جایئے
(مرحلہ شوق)

یہ اشعار جناب ڈاکٹر عاصی کرنالی کے ہیں جو آج سے چار برس پہلے اپنے اردگرد لوگوں کو محبتیں بانٹتے، شفقت لٹاتے، زندگی کو زندہ ولی سے گزارتے ہم سے جدا ہو گئے۔ جدائی کا لمحہ جو خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ہماری تقدیر میں رقم کر دیا گیا۔

"پہلے سپردِ لوح و قلم کر دیے گئے ۔۔۔ پھر ہم درِ فنا پر رقم کر دیے گئے"

محترم عاصی کرنالی کا نام دنیائے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ملتان کے ادبی حلقوں میں اُن کی اپنی ایک شناخت تھی۔ خداوند کریم ہر دور، ہر صدی اور ہر زمانے میں اپنے چند بندوں کو کسی خاص کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ جناب عاصی کرنالی کا شمار بھی انہی چند خاص لوگوں میں ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا اپنی جائے پیدائش کرنال سے کی۔ کم عمری سے ہی شعر و شاعری میں دلچسپی تھی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی اپنی شاعری سے لوگوں کو چونکا دیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور ملتان میں مستقل سکونت اختیار کی۔ بظاہر سفر ختم ہوا مگر ادبی سفر جاری رہا۔

ایک نیا وطن، نیا ماحول اور اجنبی حالات، اور ایک شاعر کے نازک جذبات اور مسلسل ادب کے لیے کام کیا اور ہر صنفِ ادب پر طبع آزمائی کی شاعری میں غزل، نظم، نعت، سلام اور منقبت لکھی۔ نظم میں پابند اور آزاد نظم دونوں پر قلم اٹھایا۔ نثر میں افسانہ، انشائیہ، مزاح، خاکہ اور تنقید پر بھی قلم رواں رہا۔

ان کی شاعری ایک حساس دل کی شاعری تھی۔ مگر ایک ایسی روح پرور شاعری جس میں زندگی کے منفی رویوں کے خلاف جہاد تھا

طبیعت کو اس اندازِ سفر سے آشنا رکھنا — ہوائے تند میں چلنا، ہتھیلی پر دیا رکھنا

سمندر، موجِ طوفاں، ابرِ تیرہ، دوریٔ ساحل — سفینہ، پارہ، پارہ دیکھنا اور حوصلہ رکھنا

مناظر دوستوں کے ساتھ مل کر دیکھنا عاصی — مگر اپنا اک اندازِ نظر سب سے جدا رکھنا

قلم خدائی امانت اور ادیب اور شاعر ہونا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ سچائی اور خلوص کسی بھی فن کے بنیادی اوصاف ہیں۔ عاصی کرنالی نے اس ذمہ داری کا بوجھ احسن طریقے سے اُٹھایا۔ اپنے افکار میں انہوں نے زندگی کے ہر رنگ پر بات کی۔

زندگی۔۔ فریاد، آنسو، ٹھہر، خاکستر، دھواں — زندگی۔۔ شبنم، شفق، گلزار، نغمہ، چاندنی

''ازل سے ابد تک قائم رہنے والی اس زندگی کے فلسفے کو شاعر اپنی ہی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ عاصی کرنالی نے اپنی شاعری میں ان حقائق کو اپنے قلم سے لازوال کر دیا۔''

موت کے رہرو پلٹ کر دیکھ لیتے کیوں نہیں — زندگی ان کے تعاقب میں ہے سائے کی طرح

عاصی کرنالی کی شاعری، سچے جذبوں اور شفاف ارادوں کی شاعری تھی۔ زبان و بیان پر عبور نے اُن کی شاعری کو امتیازی رنگ دیا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ جس بات نے دل میں اضطراب پیدا کیا اُسے اپنے زورِ قلم سے خوبصورت الفاظ کے روپ میں پیش کر دیا۔ کہیں زندگی

سے ان الفاظ میں گلہ کرتے ہیں

ہجومِ غم ہے بہت زندگی کہاں جائے　　کہیں قرار نہیں آدمی کہاں جائے
تری زمین خداؤں سے بھر گئی یارب　　کس آستاں پہ رکھے بندگی کہاں جائے
عجیب شہر ہے روزن نہیں کسی گھر میں　　جمالِ صبح کی تابندگی کہاں جائے

عاصی کرنالی نے ادب کی دنیا کو اپنے خوبصورت احساسات کی شاعری دے کر یقیناً ایک بلند مقام حاصل کیا جناب ماہر القادر کی رائے کے مطابق "عاصی کی غزلوں میں موجِ آبشار کی نغمگی اور اُن کی نظموں میں طوفان کا شور ہے۔ان کی شاعری حدی بھی ہے، نغمہ بھی ہے، بانگ درا بھی ہے اور رجز بھی ہے۔ ان کی شاعری ہمیں لالہ زاروں اور شبستانوں ہی میں نہیں، رزم گاہ میں پہنچا دیتی ہے جہاں حق و باطل کا معرکہ بپا ہوتا ہے اور جس جگہ اخلاق و نفاق کا بھرم کھل جاتا ہے۔
(بحوالہ خزینہ نوازش)

ڈاکٹر عاصی کرنالی کی نعتیہ شاعری نے انہیں بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ عجز و انکسار کے پیراہن سے آراستہ حضور پاک کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی شاعری جس نے دلوں کو چھو لیا۔

جسے میں مدحِ آنحضرت کے لائق کہہ سکوں عاصی　　ایک ایسی نعت ساری عمر میں تحریر ہو جائے

"نعتوں کے گلاب پر حفیظ تائب اپنی رائے میں کہتے ہیں۔"
عاصی کرنالی کے اس مجموعے کے وسیلے سے اردو نعت ارتقا کی نئی منزلوں میں داخل ہو رہی ہے، انہوں نے نعتیہ مضامین کو کچھ مزید وسعت، تنوع اور تجمل عطا کیا ہے۔

"مجھے شعور بھی دے عشق بے کراں بھی دے　　مجھے خیال بھی دے لفظ میں نوازش کر"
"مجھے زباں بھی عطا کر، مجھے بیاں بھی دے　　میں دشتِ حمد و ثنا میں کھڑا ہوں کاسہ بہ دل"
----- (عاصی کرنالی کی مدحت نگاری، ڈاکٹر انور سدید)

جناب عاصی کرنالی کی دردمندی اور سوز میں ڈوبی ہوئی شاعری، فنی مہارت کے زیور سے

آراستہ و پیراستہ خوبصورت اشعار، ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ مایوسی اور قنوطیت کے بجائے امید کی روشنی اُن کی شاعری کا وصف ہے۔ بیس سے زیادہ تصانیف شاعری کی ہیں، جن میں رگِ جاں، جشنِ خزاں، مدحت، نعتوں کے گلاب، چمن، جاوداں، حرفِ شیریں، تمام و نا تمام، خاصانِ خدا کربلا میں۔

نثر میں اُن کی تخلیقات میں، چہرہ چہرہ ایک کہانی، لب خنداں، اپنی منزل کی طرف، چراغِ نظر، مقالات، تحقیقی مقالہ، تمام و ناتمام مرحلہ شوق شامل ہیں

وقت کے دامن میں اُن کی یاد کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ وہ اپنے وقت کے ایک باکمال ادیب تھے۔ اُن کے افکار و خیالات اُن کے تخلیق پاروں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں وہ فن پارے اور تخلیقات جن کی روشنی سے دل و نظر کو اب بھی روشنی مل رہی ہے۔ اور یقیناً ملتی رہے گی۔

میں نہ ہوں مشہور، یارب صرف باعزت رہوں　　میری شہرت ہو نہ ہو پر میری رسوائی نہ ہو

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

زندگی۔۔۔یادوں کا ایک سلسلہ

("سمٹے تو دل عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے")

یوں لگتا ہے کہ یادوں کی دنیا کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ یادیں جب تک سینوں میں دھڑکتی رہیں، سانوں میں سانس لیتی رہیں، اور راتوں میں پلکوں پر جاگتی رہیں تو سچ مچ سمٹے ہوئے کنول کے پھول کی طرح ہوتی ہیں۔ اس کنول کی خوشبو پانی کی سبک لہروں کے ذریعے بس آس پاس ہی رہتی ہے۔ اگر کبھی یہ خوشبو آنکھوں سے رنگ اور ہونٹوں سے بول بن کر ابھرے تو پھر رکتی نہیں، پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ یادوں کی یہ خوشبو زمانے میں بدل جاتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فن کی انتہا انسان کی سوئی ہوئی یادوں کو جگاتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آرٹ کی تخلیق کے سوتے دل کی گہرائیوں سے پھوٹا کرتے ہیں۔ دل ہی تو وہ مسکن ہے جہاں انسان کی سچی محبتیں اور یادیں آبادیاں بساتی ہیں۔ ہمارا ہر گزرا ہوا دن ایک یاد ہے۔ وہ آج جو بھی بیت رہا ہے کل ایک یاد میں بدل جائے گا۔ اسی طرح مستقبل کے ہر آنے والے شب و روز یادوں کی محفل سجاتے چلے جائیں گے۔ یہ تو ہم انسانوں کی بھول ہے جو اتنا نہیں جان پاتے کہ ماضی حال اور مستقبل ادلتی بدلتی صرف یادوں کی کڑیاں ہیں۔ یادوں کی مسلسل کڑیاں ہماری مکمل زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یادوں کی ان مسلسل کڑیون کی داستان بھی بڑی عجیب ہے۔ جب انسان کے پاس کامیابیوں اور مسرتوں کے ڈھیر ہوتے ہیں تو وہ گمان کرنے لگتا ہے کہ اس نے ان کڑیوں کو توڑ دیا ہے۔ وقت تھم گیا ہے لمحے امر ہو گئے ہیں۔ یہی وہ دھند اور فریب ہے جس کی بدولت انسان ڈگمگا

جاتا ہے۔ اگر ہماری نگاہوں میں بیتی یادوں کی پرچھائیاں رہیں اور ہم زندگی کی گزری ہوئی راہوں کا نشان محفوظ رکھیں تو ہمارے دلوں پر تاریکی کبھی نہ چھائے۔ جس طرح خوشیوں کی سرشاری انسان کو بے خود کر دیتی ہے بالکل اسی طرح دکھوں کی آنچ جلا کر بے جان کر دیتی ہے۔ پھر دکھی انسان اس سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ یہ پل اور یہ لمحہ کبھی نہ بیت سکے گا۔ گویا یہ سماں تھم کر رہ جائے گا۔ یہ غم کے اندھیرے کا پہلا وار ہے جو انسان کے دل و دماغ پر کبھی چوٹ اور کبھی زخم ڈالتا ہے۔ بہر کیف دکھ ہو یا سکھ، سب بیت جاتا ہے جیسے زندگی گزرتی رہتی ہے اور یادوں کا کارواں ہر لمحہ ہر آن رواں دواں رہتا ہے۔

جب یادوں کا ذکر چلے تو اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ماضی پرستی کی علامت ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یادوں کو دہراتے رہنا انسان کے شکست و زوال کی داستان کی طرح ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یادوں کی کائنات بڑی وسیع ہے۔ یہ ہماری زندگی کے کینوس سے بڑی ہے۔ یادوں کی دنیا تلخ بھی ہے اور شریں بھی۔ روشن اور تابناک بھی ہے اور تاریک و درد انگیز بھی۔ لہٰذا یادوں کا ذکر بذاتِ خود نہ ماضی پرستی ہے اور نہ حال سے فرار کی علامت۔ یادیں تو انسانی حیات کا لامتناہی سلسلہ ہیں۔ یاد قافلہ زیست کے ساتھ چلنے والا ہے جس طرح درخت کی پہچان اس کے بیج پر بڑی حد تک منحصر ہے اسی طرح یادیں ہمارے ہر زمانے کی بنیادیں ہیں۔ ہم انسانوں کے وجود کا خمیر یادوں سے گندھا ہے۔

اگر ہم یادوں کی روشنی کی صرف ایک کرن کی بات کریں تو یہ نکتہ منور ہو جاتا ہے کہ ہماری شخصیت کی جلا اور ارمانوں کی دنیا یادوں کے سہارے زندہ ہے۔ وہ حال جو گزر رہا ہے ہمارے لیے قابلِ قدر اس لیے ہے کہ ہمیں یاد ہے کہ ہماری تمنائیں کیا تھیں کون سی آرزوئیں ہمارے دل کا مرکز تھیں۔ ہمارے شوق کیا تھے اور ہماری حسرتیں کیسی تھیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ حال ماضی سے کٹ کر رہ گیا ہو۔ مادی اور دنیاوی لحاظ سے شاید کبھی حال اپنے ماضی سے کچھ مختلف ہو جاتا ہے مگر دنوں زمانوں میں انسان کے جذبات اور دل کی نگری ویسی کی ویسی آباد رہتی ہے۔ ہم شاذ و نادر حال کو

ماضی کی اگلی سیڑھی قرار دیتے ہیں اور حال کو ماضی کے درخت کی زیادہ پھیلی ہوئی ٹہنی کہہ دیتے ہیں۔ وقت چاہے کتنا ہی بدل جائے، یادیں ہم سب کی جڑیں اور اصل زمین ہیں۔

یہ ہنگامہ پرور شب و روز، یہ تیز رفتار زمانہ اور یہ ترقی کے لیے جہد مسلسل، سب سورج کے ڈھلتے ہی ایک یاد میں تبدیل ہو جاتے ہیں شام ہوئی اور دن ڈھلا تو دن بھر کے کام اور باتیں بھولی بسری یادیں بن کر رہ گئے۔ جس طرح آسمانوں کی سیاہی کے ساتھ ساتھ پرندے اپنے رین بسیرے کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں بھی زمین کے چراغوں کے مدہم ہوتے ہی یادوں کی بستی جگمگانا شروع ہو جاتی ہے۔ خواب جاگ اٹھتے ہیں اور ہماری تھکن کو سلا دیتے ہیں۔ دن بھر کی ہلچل اور فکریں بھی ہمیشہ کے لیے یادوں کو اوجھل نہیں کر پاتی ہیں۔ خاص کر تنہا اور خاموش گزرتا ہوا وقت تو پورے کا پورا یادوں کے دامن میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ یادوں کے طویل سفر میں ہمارے جیون کی کل کہانی چھپی ہوئی ہے۔ انسان کی ابتداء اپنے خالق و محبوب کی یاد میں رو رو کر ہوئی۔ انسان جدائی میں شدت محبت کے تحت آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اتنا رویا کہ زمین کے سارے نشیب لبالب سمندر بن گئے اور ویران میدان جل تھل برسات سے گھنے جنگل ہوئے۔ اگرچہ اب انسان کا ذہن اور شعور بیدار ہو کر مسلسل جاگ رہا ہے اور وہ نئی خواہشوں اور مقاصد کے چمکتے تاروں میں الجھتا جا رہا ہے مگر اس کی روح یادوں کے بے شمار انبار تلے دبی ہے۔ انسان کے لیے اپنے پیارے اور اپنے محبوب کی یاد تو متاع حیات ہے اور کل زندگانی کا رس۔ آخر اسے خود بھی تو ایک دن مٹی میں مٹی ہو کر ایک یاد میں ڈھلنا ہے۔ ہر ایک کی ابتدا اور انتہا محض ایک یاد ہے۔

نہ جانے کیوں زندگی کی چاہتوں اور محبتوں کی بات چلے تو دور دور تک صحرا نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔ اپنوں کے بخشے ہوئے زخموں میں بہت ٹیسیں اٹھتی ہیں اور آخر گہرے ناسور بن جاتے ہیں۔ واقعی ناسور کبھی بھرا نہیں کرتے۔ مگر خدا جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ یہ ناسور میری زندگی کو نئی اور روشن سمت اور سوچ کو اجالا دیتے رہتے ہیں۔

اس بات میں سچائی ہے کہ انسانوں سے عشق اور لگاؤ نہ ابدی ہوتا ہے اور نہ لازوال جیسے یہ دن رات آنی جانی ہیں، چاہتیں اور مروتیں بھی چڑھتی، ڈھلتی اور گھلتی رہتی ہیں۔ ہماری وہ محبت جو ہماری زندگی کی ضامن ہوتی ہے وقت کے دھارے میں ذرہ ذرہ کر کے ٹوٹتی اور بکھرتی ہے۔ محبت کبھی اپنے مرکز کو بدلتی اور کبھی رُخ کو موڑتی رہتی ہے۔ محبت تقاضوں اور مصلحتوں کے ایندھن میں تپتی اور ایک یاد بن کر جیتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ محبت کی محرومیاں انسان میں بلا کی شدتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ جب وہ کسی کو چاہتا ہے تو اس حد تک چاہتا ہے کہ خود ٹوٹ کر مرمٹتا ہے اگر وہ کسی سے نفرت کرتا ہے تو اس طرح کرتا ہے کہ خود اور اپنے محبوب کے وجود کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ ابتدائی زندگی کی ویرانیاں اور خالی پن انسان کی شخصیت کو خام اور نامکمل رہنے دیتے ہیں۔ ہماری ذہنی دنیا کی بے ساختگی اور انتہائی جذباتی کیفیات اکثر و بیشتر ہماری ناکامیوں کا باعث بنتی ہیں۔ اگر اس زندگی کے گزرتے شب و روز میں یادوں کے انگارے جلتے رہیں تو بڑا ہی اچھا ہو۔ بس یوں ہو کہ نہ یادوں کے انگارے تیز ہوا سے بھڑک اٹھیں اور نہ یادوں کو رات کی اوس بجھا کر ٹھنڈا کر دے، یادیں صرف دھیمے دھیمے سلگتی رہیں۔ پھر انسان نہ کسی خوشی سے ناچ اٹھتا ہے اور نہ کسی غم کے بوجھ سے گھائل ہو کر زمین میں دھنس جاتا ہے۔ وہ یادوں کی سلگتی آنچ کے قریب بیٹھا، ایک مسکراہٹ اور امید کے ساتھ زندگی کے بہتے پانی کو دیکھتا رہتا ہے۔

یادیں تو ہوا کی لہریں ہیں جنہیں نہ کسی نے دیکھا نہ تھاما اور نہ چھوا ہے۔ میرے ہر طرف یادیں بکھری ہوئی ہیں مگر کچھ نہیں معلوم کہ کہاں کہاں سے اور کیسے آئی ہیں۔ ہوا کی لہروں کو دیکھنا ہو تو صحرا کی ریت پر نقش دیکھو، سمندر کی موجوں کا رقص دیکھو، تاروں کی جھلملاہٹ دیکھو اور پیڑوں کا جھومنا دیکھو۔ آخر یہ ہوا ہی تو ہے جو سب کو مست کر رہی ہے۔ یادوں سے ان کا جذب و مستی کا عالم بھلا کوئی چھین سکتا ہے!

ازل سے دل انسان کی ساری کائنات ہے۔ یہی کائنات ہمیشہ سے جلوے دکھا رہی ہے۔

اگر دل میں یادوں کے بسے رہنے کی جگہ تنگ ہوتی چلی جائے تو یہ آہوں میں بدل جاتی ہیں۔ آہیں جب سرد مہر اور بے تعلق آسمان سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں تو بوند بوند آنسو بن جاتی ہیں۔ کبھی یہ آنسو صرف پلکوں کو نم کرتے ہیں کبھی ٹپاٹپ موتی بوندوں کی طرح برستے ہیں اور کبھی خون بہاتی ندیوں کی طرح سیلاب بن جاتے ہیں۔۔ بہر کیف ہر طرف یادوں کے کھیل ہیں۔ چاہے من کے سارے دریچے کھول کر دیکھو یا ادھ کھلی آنکھوں سے سوچو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ربِ جمیل نہ صرف چھپا ہوا حسین خزانہ تھا بلکہ اس کائنات سے پہلے اور ازل سے بھی پہلے، بے حد و حساب یادوں کی دولت لیے بیٹھا تھا۔ فیاض مولیٰ نے سوچا کہ دولت لٹا دی جائے شاید یادوں کا کھیل اسی لمحے شروع ہوا۔ اور پھر کس کس طور چلتا رہا کچھ نہیں معلوم۔ جس کے ہم سب اور جس کا ازل اور ابد وہی سب کچھ جانے۔

میں جدھر بھی دیکھوں تو یادوں کے ڈھیر ہیں، گٹھریاں ہیں، کچھ بندھی ہوئی، کچھ کھلی ہوئی اور کچھ ٹوٹی پھوٹی کہیں عمر رفتہ کی باتیں قطرہ قطرہ ہو کر ایک پیالے میں جمع ہو گئی ہیں۔ کہیں حسرتیں گرمیوں کے حبس میں سست رفتار نالے کے مانند رینگ رہی ہیں۔ کہیں بیتے زمانوں کے ارمان پل بھر کو پہاڑی چشموں کا سارا شور مچا دیتے ہیں۔ آخر میں ساری یادیں مل ملا کر خاموش سناٹا طاری کر دیتی ہیں جیسے گہری سرد رات میں سمندر سائیں سائیں کرتا ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ میں نے اس سمندر میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ اب یہ آگے کو امنڈتا اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جس لمحہ سمندر کے کنارے بھرے تو سانس کے بادبان بھی ڈوبے۔ مگر کون جانے کہ کب۔ پیارے اللہ کا بڑا احسان ہے کہ میری انمول تنہائیاں اور گہری یادیں ایسے خزانے ہیں جو دل اور آنکھ کو یوں بھر دیتے ہیں کہ کسی بات کی فکر نہیں رہتی۔ کسی غم کا سایہ نہیں پڑتا۔ کوئی تمنا سوئی نہیں بس دنیا سے جی بھر جاتا ہے۔ چار سو سکھ ہی سکھ اور چین ہی چین۔ اور پھر عجیب سی خوشبو کے جھونکوں سے میرا وجود کھل اٹھتا ہے۔ فضا بس جاتی ہے۔

خاص کر جب زندگی کی سہ پہر ہو چلی ہو تو ہمیں آنے والے ایک لمحے کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اب نہ ہماری زندگی میں سویرے کے لمحے کا نور اترے گا اور نہ دوپہر کے سورج کی چمک

اور تپش پھیلے گی۔ یہ تو بھلی سی شام بھی نہیں کہ شفق سے بادل گلابی ہو جاتے اور ایک تارا جھلک دکھلاتا، یہ تو زندگی کی چپ چاپ سہ پہر ہے جو کچھ گدلی اور کچھ دھندلی ہے۔ درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں، پرندے سوچ میں پڑے ہیں اور ہر طرف بڑا سناٹا ہے ہم ہاتھوں میں یادوں کا کشکول تھامے کھڑے ہیں۔ ابھی یہ کشکول شاید منہ تک بھرا نہیں ہے۔ ہمیں تو ہمیشہ سے ہر بات کی جلدی رہتی ہے۔ ہم تو اسے کبھی کا انڈیل کر چل دیتے۔ پھر اس کے ٹکڑوں سے اور بہت سے کشکول بن جاتے جن میں نئے سرے سے انسانی دلوں کی محبتوں، حسرتوں، اور تنہائیوں کی یادیں گھلی ملی ہوتیں۔ سچ ہے کہ ہمارے جینے کا سفر تھوڑا اور تنہا اور یادوں کا سلسلہ طویل اور طویل تر ہے۔

سلیم زاہد صدیقی

وہ کب آئیں گے ؟

اجلاس جاری تھا اب تک ۱۵ مقررین دھواں دھار تقاریر کر چکے تھے۔ یہ اجلاس کا تیسرا اور آخری دور تھا ہر مقرر نے بہت جذباتی باتیں کی تھیں۔ اور شرکاء محفل سے تالیاں اور داد وصول کر چکے تھے، کئی گھنٹوں کی صدارت کرنے کے باعث صدر اجلاس کے چہرے سے تھکن واضح تھی۔ واقعی کسی اجلاس کی صدرات کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔ سولھواں مقرر اپنی شعلہ بیانی سے ماحول کو گرما رہا تھا وہ ہر دو چار جملوں کے بعد اقبال۔ جوہر اور دیگر شعراء کے اشعار سنا کر دلوں کو مہمیز کر رہا تھا۔ مشاہیر اور مصلحین کے اقوال کے حوالے دے رہا تھا کبھی بلند آواز سے جہاد، قربانی اور حوصلے کا ذکر کرتا کبھی ڈرامائی انداز میں آواز دھیمی کر لیتا۔ کبھی اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر مائک کے قریب ہو کر رقت انگیز آواز میں حاضرین کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا۔

وہ اگر یہ تقریر کسی جلسہ عام میں کر رہا ہوتا تو شاید سارا مجمع اب تک بپھر چکا ہوتا اور نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو جاتا مگر یہاں اجلاس میں اس کی تقریر پر کسی کا کوئی ردعمل نہ تھا۔ یہاں ہر شخص کی اپنی رائے تھی وہ اپنی رائے یا اپنی پارٹی کی رائے کے علاوہ نہ کچھ سننا چاہتے تھے اور نہ سوچنا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مشق لاحاصل ہی تھی۔ لیکن یہ آل پارٹیز کانفرنس ہونی ضروری تھی اور اس میں شعلہ بیانی اس لیے بھی ضروری تھی کہ دوسری صبح اخبارات میں سرخی بن جائے اور لیڈری کا فرض ادا ہو جائے۔

میں پریس گیلری میں بیٹھا پچھلے کئی گھنٹوں سے ان مقررین کی تقاریر سن رہا تھا۔ ایک مقرر جب تقریر کر چکتا تو سب تالی بجا کر اس کی تقریر کی داد دیتے وہ گردن اکڑائے واپس اپنی نشست پر واپس آجاتا اور پاس بیٹھے ساتھیوں سے سرگوشیاں شروع کر دیتا جیسے دوسرے مقرر کی تقریر سے

اسے کیا لینا دینا۔

حالانکہ یہ ایک انتہائی اہم انسانی مسئلہ تھا۔ پچھلے دنوں جب ملک میں مظاہرے ہوئے کہ "بہاریوں کو وطن واپس لایا جائے" اور حکومت پر دباؤ بڑھنے لگا تو حکومت نے اس آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں ملک کی چیدہ چیدہ سیاسی۔ سماجی اور مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی کہ اس انسانی مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور قابل عمل تجاویز حکومت کو پیش کی جائیں۔ مجھے میرے اخبار نے اس کانفرنس کی کوریج کے لیے بھیجا تھا میرا دماغ ان مقررین کی تقاریر سن سن کر تھک چکا تھا اس لیے میں اپنے خیالوں میں ڈوب گیا "کیا قسمت ہے ان بہاریوں کی کیا کوئی اجتماعی گناہ سرزد ہوا تھا ان سے کہ جس کی سزا پا رہے ہیں؟"

کچھ مقررین نے ان بہاریوں کو ملک پر بوجھ قرار دیا تھا۔ کچھ نے ان کی قربانیاں یاد دلائیں جو انہوں نے تشکیل پاکستان کے لیے دی تھیں۔ کچھ مقررین نے ملک میں پھیلی ہوئی بیروزگاری اور غربت کا رونا رو کر ان کو یہاں لانے پر ،، ن کا مطالبہ کیا۔ کچھ نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو ان بہاریوں کی سازش قرار دیا تھا اور اب اس بات سے خوفزدہ تھے کہ وہ یہاں آکر پھر تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہو جائیں گے۔ کچھ نے دامن پھیلا کر ان کے لیے سر چھپانے کی جگہ مانگی تھی۔۔ کچھ نے اس انسانی مسئلہ کو خالصتاً سیاسی بناتے ہوئے اپنے صوبے میں آباد کرنے کی اجازت دی تھی۔ کچھ لوگ مستقبل کی غذائی صورت حال سے خوفزدہ تھے۔ کچھ کو خوف تھا کہ ڈھائی لاکھ بہاری ان کے صوبے میں آکر ان کو ریڈ انڈین بنا دیں گے۔ غرض جتنے مقرر تھے اتنی باتیں تھیں۔

حکومت اس مسئلہ کے حل میں مخلص تھی مگر وہ بھی رائے عامہ کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اس مسئلہ پر یہ کانفرنس منعقد کی تھی۔ میرا دماغ کہیں اور تھا میں بہاریوں کی اس نسل کو دیکھ رہا تھا جو بنگلہ دیش کے کیمپوں میں جوان ہو چکی تھی۔ بنگلہ دیش کے کیمپ سے باہر کی دھرتی ان کی ماں تھی۔ ماں کو چھوڑنا کون پسند کرتا ہے یہ بھی کب اس ماں کو چھوڑنا چاہتے

تھے مگر ماں پر کسی اور کا قبضہ تھا ان کے بزرگوں نے ماں کے لیے اس ا، بزرگی اور تقدس کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیتے تھے مگر کچھ لوگوں نے اپنی ماں کو صرف اپنے تصرف کے لیے قبضہ میں لیا تھا۔ یہ نسل ان خاردار باڑوں سے پرے اپنی زمین کو حسرت سے تک رہی ہے۔

"امی! وہ دُور اونچی عمارت ہماری تھی نا؟" ایک بچی بولی۔

"چپ رہ کمبخت۔ اب ہمارا کچھ نہیں ہے۔"

"امی یہ سڑک پر بچے گلے میں تھیلے لٹکائے کہاں جا رہے ہیں؟ ایک لڑکا بولا۔ یہ سکول جا رہے ہیں"

"ہم بھی سکول جائیں گے نا؟ اس نے پھر پوچھا

"نہیں بیٹا تم سکول نہیں جاؤ گے۔"

"امی ہم کب تک اس جگہ رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔۔۔ شاید آخری سانس تک۔

"یہ تم کیسی مایوسی کی باتیں کرتی ہو" ایک بوڑھے نے عورت کو ڈانٹ دیا۔

عورت چپ ہو گئی۔

میرے خیالوں کا تسلسل تالیوں کے شور نے توڑ دیا۔ آخری مقرر اپنی تقریر کی داد لیتا ہوا جا رہا تھا۔ اور اب صدر کانفرنس اپنی تقریر کے لیے کھڑے ہو چکے تھے۔ میں انہماک سے ان کی تقریر سننے لگا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"بہاری۔۔۔ ہمارے بھائی ہیں۔۔۔ میں نے اس کانفرنس میں ہونے والی تقاریر کو بغور سنا ہے حکومت چاہتی ہے کہ اس انسانی مسئلہ کو خالصتاً انسانی مسئلہ سمجھتے ہوئے حل کرے۔ ہم بہاریوں کو واپس لائیں گے وہ سچے پاکستانی ہیں انہوں نے پاکستان کے لیے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ میں ان کی خدمت اور قربانیوں کو سلام کرتا ہوں۔ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ان کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہ ضرور آئیں گے مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ اس کے لیے ہمیں کچھ وقت درکار ہوگا۔ ہم ان کو

یہاں اس وقت لائیں گے جب ان کے لیے ان کی بہتر مستقبل کے لیے مواقع فراہم کرسکیں۔
ہم ان کو روٹی، کپڑا اور مکان کی ضمانت فراہم کرسکیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ یہاں آکر حکومت پر،
ملک پر اس ملک کے عوام پر بوجھ بنیں۔ ہم نے بین الاقوامی اداروں سے اس سلسلہ میں بات کی
ہے۔ کچھ مسائل راہ میں حائل ہیں۔ کروڑوں روپیہ تو صرف ان کی ٹرانسپورٹیشن کے لیے چاہیے۔
اور ابھی ہمارا بجٹ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ ہمارے کچھ دوست ممالک
ہماری مدد کے لیے تیار بھی ہیں۔ لیکن ان کو صرف یہاں ہم ان کے لیے روزگار کا بندوبست چاہتے
ہیں۔ ان کے لیے ایسا انتظام چاہتے ہیں کہ وہ یہاں آکر رزق حلال کما سکیں ان کی رہائش کا انتظام
کرنا ہے۔ وہ یقیناً آئیں گے۔ پاکستان ان کا وطن ہے۔ ان کا پاکستان پر حق ہے۔ ہمیں کچھ وقت
درکار ہے حکومت بھرپور کوشش کررہی ہے میں اس کانفرنس کی سفارشات حکومت کو پیش کردوں گا۔
آپ حکومت کے ساتھ تعاون کریں میں ایک بار پھر بہاری بھائیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہم سمجھتے
ہیں کہ یہ پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بہاریوں کو واپس لائے۔ اور آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں
کہ آپ پاکستان آئیں گے انشاء اللہ بس تھوڑا سا وقت ہم کو دے دیں۔ شکریہ۔"

صاحب صدر تقریر کرکے بیٹھ چکے تھے۔ کانفرنس کے اختتام کا اعلان ہو رہا تھا۔ اور میں سوچ
رہا تھا۔ سچ کہا صدر صاحب نے بہاری پاکستان آئیں گے۔۔ مگر کب؟ شاید جب سندھ، پنجاب،
سرحد اور بلوچستان نہیں ہونگے۔ صرف پاکستان ہوگا۔ اور سچ بھی تو یہی ہے کہ بہاری پاکستان آنا
چاہتے ہیں سندھ، بلوچستان، سرحد یا پنجاب نہیں۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک وہ قومی نغمہ ایک مرتبہ پھر میری سماعت کو اپنی طرف کھینچنے
لگا جسے میں پہلے کئی بار سن چکا تھا۔

"میں بھی پاکستان ہوں۔ تو بھی پاکستان ہے۔"

محمد طارق غازی۔ ایسٹ یارک (کینیڈا)

زبانوں کی ماں

(تہذیبوں کی کہانی پر زیر قلم کتاب کا ایک نکتہ)

اولادِ آدمؑ میں حضرت ادریس علیہ السلام وہ پہلے رسول تھے جنہیں مستقل شریعت دی گئی تھی۔ امام ابن جریر طبری (تاریخ الامم والملوک ۱: ۱۴۰) کا بیان ہے کہ انہیں اپنے زمانہ میں تمام رُوئے زمین کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یہودیوں کی عبرانی بائبل کے علاوہ عیسائی کیتھلک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی بائبل کے نسخوں میں حضرت ادریسؑ کو اخنوخ، انوخ یا حنوک (Enoch) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حبشہ اور ارتریا کے توحیدی کلیسا کی بائبل میں ایک مصحف 'اخنوخ' (Book of Enoch) بھی شامل ہے جسے یہودی اور باقی ہر فرقہ کے عیسائی تسلیم نہیں کرتے، اس لیے ان کی بائبل کے نسخوں میں یہ کتاب شامل نہیں ہے۔ مفسرین قرآن حکیم کا بیان ہے کہ حضرت ادریسؑ پر ۳۰ صحیفے نازل ہوئے تھے حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سُریانی نبی شمار کیا ہے (طبری تاریخ الامم والملوک ۱: ۱۴۰) اس حدیث کے مطابق ان کا وطن شام کے مشرق میں شمالی عراق یا اشوریہ سے مشرقی عربیہ تک کا علاقہ تھا۔

تمام بزرگ مفسرین قرآن متفق الرائے ہیں کہ دنیا میں پہلی تحریری زبان کے موجد حضرت ادریسؑ تھے انہوں نے قلم ایجاد کیا، روشنائی اور تختی ایجاد کی، 'الفبا' مرتب کی اور لکھنے کا آغاز کیا اہل لغت ولسانیات کے مطابق سریانی (Syriac) زبان ابجد سے لکھی جاتی تھی اصل سریانی زبان

میں اسے (Lessana Suryaya) لِشَانہ سُرِیَایَہ کہا جاتا ہے۔

افریقی۔ایشیائی زبانیں۔بشمول سامی، کلدانی، اشوری، کنعانی، عربی، عبرانی، آرامی، فنقیی، نسطوری، نبطی اور یونانی زبانیں۔اصل میں سریانی زبان ہی کی شاخیں ہیں، حتیٰ کہ ہندوستانی ریاست کیرالا کی ملیالم زبان بھی ایک زمانہ میں سریانی حروف تہجی یعنی ابجد میں لکھی جاتی تھی اور اسے سریانی ملیالم کہا جاتا تھا ممکن ہے جنوبی ہند کی باقی دراوڑی زبانیں، تیلگو، کنڑ اور تمل، نیز سری لنکا کی سنہالی زبان بھی سریانی زبان ہی سے ماخوذ ہوں

ایران کی قدیم زبان پہلوی آریائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر اس خاندان کی دیگر قدیم السنہ کے برعکس پہلوی کا رسم الخط راست سریانی سے ماخوذ ہے۔مثلاً عربی کا (س) اگر شیشہ پر لکھ کر دوسری سمت دیکھا جائے تو وہ پہلوی زبان کا (ش) بن جائے گا یا اس میں عربی 'ط' کو عموداً الٹ کر (ᵐ) کی طرح لکھا جاتا ہے دلچسپ بات یہ کہ پہلوی حروف تہجی کو ابجد ہی کہا جاتا ہے اور فارسی کے برعکس یہ تختی قرشت پر مکمل ہو جاتی ہے افقی طور پر الٹنے کی یہ کیفیت سنسکرت/ ہندی کے دیوناگری رسم الخط میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے فرق یہ ہے کہ سنسکرت کا ہند یورپی لسانی خاندان اگرچہ سامی زبانوں سے علیحدہ ہے مگر حقیقتاً وہ بھی بڑی حد تک سریانی 'الفبا' کو معکوس کر کے لکھی جاتی ہے۔مثلاً سریانی زبان کے حرف (دالت) اور عربی (د) کو شرقاً غرباً پلٹ دیا جائے تو معمولی تغیر کے ساتھ سنسکرت/ ہندی کا (دا) اور رومن کا (چھوٹا ڈی d) بن جاتا ہے لیکن رومن بڑا (D) سریانی اور عربی اور عبرانی حرف سے زیادہ مختلف نہیں ہے یہی صورت سریانی (جامل)، عربی (ج)، عبرانی (جیمل) اور انگریزی (جی G) کی ہے، البتہ سنسکرت/ ہندی (جا) عربی (ج) کی معکوس شکل ہے۔یہ سارے حروف بڑی حد تک ہم شکل ہیں یا ذرا سے تامل سے ان میں باہم شباہت کا سراغ مل جاتا ہے سریانی (شین) اور سنسکرت/ ہندی (شا) نیز سنسکرت/ ہندی (کشا۔ پیٹ چرا 'شا') اور عبرانی (شین) تحریر میں گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ایسی ہی تحریری یکسانیت سریانی (ریش) عربی (ر)، عبرانی (ریش) اور سنسکرت/ ہندی (را) میں محسوس کی جاتی ہے۔

ماہرین لسانیات کہتے ہیں قدیم روائتی منگولی اور چین کی مانچو زبانوں کی ابجد بھی سریانی سے ماخوذ ہے (جی، جنگیی انکاؤنٹرز بٹوین چائنیز کلچر اینڈ کرسچیانٹی۔ (Ji,Jingyi, Encounters Between Chinese Culture and Christianityc Munster 2007/p41) ان کے علاوہ قدیم سُغدانی، قدیم ہنگروی، قدیم اُرخانی ترکی، اور سنکیانگ/کرغیزستان کی قدیم اویغوریہ (Uyghur) کے رسم الخط بھی سریانی ابجد سے اخذ کئے گئے ہیں بعد میں ان میں سے کئی زبانوں کو رومن حروف میں لکھا جانے لگا۔ فارسی، دری، پشتو کے علاوہ سندھی زبانیں بھی مناسب صوتی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیوں کے ساتھ تحریر میں یہی سریانی/عربی 'الفبا' استعمال کرتی ہیں۔

اس لسانی پس منظر میں حضرت ادریسؑ کی مرتب کی ہوئی تہذیب اور ان کی لسانی اور دیگر بے شمار مادی ایجادات سارے عالم کی مادر تہذیب اور ان کے بنائی ہوئی ابجد تمام زبانوں کا اصل رسم الخط ثابت ہوتی ہے جس میں حسن کاری، اصول خطاطی، قلم پر گرفت کے انداز وغیرہ کی بنا پر مختلف زبانوں میں حروف کے اندر کچھ تبدیلیاں ہوتی گئیں جیسا کہ عربی/فارسی/اردو کے مختلف خطوط نستعلیق، نسخ، ریحانی، اور ثلث میں (د)، (ک)، (م) وغیرہ میں نظر آتے ہیں مگر اساسی طور پر ساری دنیا کی زبانوں کی ابجد آج بھی وہی ہے جو حضرت ادریسؑ نے بنادی تھی تاہم جن زبانوں کے حروف اُفقاً معکوس ہو گئے اور جو اصل سریانی تحریر کے برخلاف بائیں سے دائیں لکھی جانے لگیں تو ان کا ظاہری سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کوئی طاقت ہے یا تھی جو ان زبانوں کو اس انسانی تہذیبی میراث سے محروم کرنا چاہتی تھی جسے حضرت آدمؑ اور پھر حضرت ادریسؑ نے شریعت کے تابع کر دیا تھا بائیں سے دائیں لکھی جانیوالی زبانیں ہند یورپی یا آریائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس خاندان میں فارسی، اردو اور کردی زبانیں سریانی کے اتباع میں دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں۔

حضرت آدمؑ کو عطا کردہ مادی اور روحانی علوم کو تہذیب میں ہم آہنگ کرنے کا تاریخی نکتہ زیر قلم اس تحقیق کا مقصد ہے اور لسانی گفتگو کو آگے بڑھانا ماہرین ابجدیات کی دلچسپی کا موضوع ہے۔

کرامت بخاری

اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کی سازش

اردو زبان تقریباً چار سو سال سے اپنا کامیاب ارتقائی سفر طے کرنے کے بعد اب اس سطح پر آ پہنچی ہے کہ اقوام متحدہ کے ادارے UNESCO نے اپنی حالیہ رپورٹ میں اِسے دنیا کی دوسری بڑی (Spoken) بولی جانیوالی اور تیسری بڑی (Written) لکھی جانے والی زبان قرار دیا ہے۔ یہ رپورٹ روزنامہ جنگ میں شائع ہو چکی ہے۔ کچھ عرصہ سے ایک لایعنی و بے معنی بحث کا آغاز ہو چکا ہے کہ اس کا رسم الخط رومن کر دیا جائے مجھے اس بحث کے پیچھے اُردو دشمنی کی بُو آتی ہے، اردو زبان کا موجودہ رسم الخط صدیوں سے اس کی پہچان بن چکا ہے اور یہ اس کا لباس ہے۔ اردو کو بے لباس کرنے اور اس سے اس کی پہچان چھیننے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اردو کو بد قسمتی سے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھ کر تعصب کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اردو کو دہلی اور لکھنؤ سے دیش نکالا دینے اور حیدر آباد (دکن) سے نکالنے کی کوشش میں کچھ لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ورنہ تلوک چند محروم، رام لعل، ہرچرن چاولہ، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر کشمیری لال، گوپی چند نارنگ، راجندر سنگھ بیدی، غرض کہ بہت سے بڑے لکھنے والے اسے زندگی بھر لکھتے پڑھتے بولتے، سیکھتے، سکھاتے اور محبت کی زبان قرار دیتے رہے ہیں۔

اگر آج اس کا رسم الخط تبدیل کر دیا گیا تو بیس پچیس سال بعد آنے والی نسلیں اردو کلاسیک نہیں پڑھ سکیں گی اور یہ اتنا بڑا خزانہ رومن میں کون ترجمہ کرے گا۔ ہم اپنے ماضی سے کٹ جائیں گے اور اگر ماضی گم ہوا تو ایسے ہی ہے کہ ہماری یاداشت گم ہو گئی اور جس کی یاداشت گم ہو جائے وہ نیم پاگل اور مخبوط الحواس گردانا جاتا ہے۔ اپنے پرائے کی پہچان کھو بیٹھتا ہے، یہ ایک لایعنی و بے معنی بحث ہے جسے اردو دشمنی میں شروع کر دیا گیا ہے۔

میں نے اردو قومی تحریک کے جلسے میں کہا تھا کہ اردو فارسی، عربی دائیں ہاتھ سے لکھی

جانے والی زبانیں ہیں اور ہم دائیں طرف ہی رہنا چاہتے ہیں ہمیں زبردستی بائیں طرف نہ دھکیلا جائے، اگر قدرت نے اسے دائیں طرف سے لکھی جانے ولی زبان بنا دیا ہے جو کہ اس کی تہذیب وثقافت، اقدار، روایات اور عقائد کی امین ہے تو اسے فطرت کے خلاف سفر کرنے پر کیوں مجبور کیا جارہا ہے کیا دو اور اب سے زیادہ آبادی کی لائبریریوں کی لاکھوں کتابیں ترجمہ ہو سکیں گی۔؟

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ص اور س اسی طرح ،ض ز اور ظ کے حروف سے شروع ہونے والے الفاظ اپنے معنی و مفہوم میں مختلف ہوتے ہیں انھیں رومن میں کیسے لکھیں گے مثلاً ''صدا'' اور ''سدا'' تو پھر ایک صدا سے آپ سدا محروم ہو جائیں گے۔ جہاں املا کے فرق سے معنی و مفہوم مختلف ہوتے ہیں۔ اصوات، اوزان، اور گرامر کے مسائل کون حل کرے گا ہمارے بزرگوں نے بہت محنت سے اسے سنوارا، نکھارا، پڑھایا، سکھایا اور پھیلایا ہے۔ جسے قائم رکھنا ہمارا فرض ہے۔

یہ ایک انتہائی مختصر تاثر ہے، انشاء اللہ اس پر تفصیل سے لکھوں گا آخر میں یہ کہوں گا کہ اردو ہماری آن، بان، شان، ایمان، ایقان، زبان اور پہچان ہے ہم اس کی زندگی بھر عقیدے کی طرح حفاظت کریں گے قلی قطب شاہ سے میر تک اور میر سے غالب اور ناصر کاظمی تک اور اس فقیر تک جس نے بھی اس کام کو شروع کیا ہے اُسے قدرت نے کبھی زوال نہیں دیا انشا اللہ یہ دنیا کی سب سے بڑی زبان کہلائے گی۔

آخر میں ارباب اختیار سے بھی عرض ہے کہ اچھی قومیں آئین پر عمل کرتی ہیں آپ کے آئین میں واضح موجود ہے کہ اسے نافذ کیا جائے گا آیئے اس وعدہ کو اور آئینی فریضے کو پورا کریں اور اردو زبان کو نافذ کریں دنیا میں ایک قوم کی حیثیت سے سرفراز ہوں۔

فائزہ فرمان

اُردو املاء۔۔۔ مسائل و رفتار

املاء قواعد کا ایک اہم حصہ ہے اسے آرتھوگرافی (Orthography) بھی کہتے ہیں۔ اس کا مقصد حروف اور الفاظ کو صحیح ہجا کے ساتھ لکھنا ہے۔ وہ طریقہ جو ان حروف کو لکھنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، رسم الخط کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ املاء اور رسم الخط دونوں قریب قریب معنی و مفہوم رکھتے ہیں۔ اِملا میں لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنا ایک مستحسن اقدام ہے۔ قدیم شعرا جن میں انشاء اللہ خاں انشاء اور مرزا غالب کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اُن کے ہاں بھی یہی مفہوم دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہر زبان کے لیے صحیح اِملا کے قواعد جاننا نہایت ضروری ہیں۔ لیکن اردو املا کے قواعد سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ ایک لفظ کو ادا کرنے کے لیے ایک شخص نے جو انداز اختیار کیا، دوسرے اُسے سند کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اسے من و عن قبول کر لیتے ہیں۔ کتب، رسائل و جرائد اور اخبارات میں ایسے لفظوں کی تکرار ہمارے لیے قابلِ تقلید بن جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یکسانیت اور یک رنگی کے لیے اِملا کے اصولوں کی پاسداری کی جائے تاکہ املا میں لفظوں کی بے ضابطگی کا اعادہ نہ ہو سکے۔

آج کل درسی کتب اور رسائل کے مضامین میں اِملا کی اغلاط بہت ہوتی ہیں۔ یہ ایک منفی سرگرمی ہے اگر عبارت میں سقم موجود ہو تو تحریر بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عبارت کی پروف ریڈنگ نہایت توجہ کے ساتھ کی جائے تاکہ اغلاط کا امکان کم سے کم ہو۔

اردو ہماری قومی زبان ہے اس لیے قومی زبان کے ناطے ہمیں اپنی زبان کے فروغ اور اس کے ارتقا کے لیے املائی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ تصحیح کے کام میں زبان کی صرف و نحو کے بنیادی پہلوؤں کا احاطہ کرنا ایک لازمی امر ہے۔ اس طرح املا اور صرف و نحو کا رابطہ زبان کے ساتھ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔

قصبوں میں اطفال، باپ کو 'میاں' کہتے ہیں اور لکھنو میں ماں باپ، محبت اور شفقت کے سبب لڑکے کو میاں کہتے ہیں

۶۔ اسی طرح ''بلبل'' جو ایک خوش آواز پرند ہے بطور مذکر اور مونث مستعمل ہے۔ اِسے ''عندلیب'' اور ہزار داستان'' بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لفظ بلبل شیراز'' بہ معنی شیخ سعدیؒ کا لقب بلبل ہزار داستان، بطور خوش بیاں اور شیریں کلام کے لیے۔ بلبل چشم بہ معنی ایک کیڑا کے مستعمل ہے۔ شعرانے بلبل کو مذکر اور مونث دونوں حیثیتوں میں استعمال کیا ہے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

(اقبالؒ)

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

(میر)

------

(۷) مذکر مونث کے باب میں 'گرہست' سے 'گرہستن' مونث لکھنا غلط ہے اس لیے کہ گرہست بذاتِ خود مونث ہے جس کے معنی عیال داری، قبیل داری اور دنیا داری کے ہیں۔ جب کہ گرہستی بھی ہندی لفظ ہے۔ اور ہر طور مذکر استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دنیادار، عیال دار اور گھر والا کے ہیں۔ اس طرح گرہستی کی مونث گرہستن لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ لفظ اردو قواعد انشا نہم دہم میں غلط درج ہے۔ اسی طرح بھائی کی مونث بھاوج اور بہنوئی کی مونث بہن لکھنا زیادہ مناسب ہے جب کہ کتب میں بیٹا کی مونث بہن نہیں ہے بلکہ بہو ہے۔

(۸) اشتہارات میں ''اہلیان محلّہ'' درج ہوتا ہے جو کہ غلط لفظ ہے اس لیے ''اہلیان'' کے بجائے اہالیان اور اہالی لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ اِن کی املا پر کوئی توجہ نظر نہیں آتی۔ ممتحن، ممتحن میں بھی بنیادی فرق ہے۔ مُمتَحَن (امتحان دینے والا) مُمتَحِن (امتحان لینے والا) کے ہیں۔ مترجم، مُتَرجَم کے

ل بیٹا کی مونث نہ بہن ہے نہ بہو بلکہ بیٹی ہے (ادارہ)

معنوں میں بھی فرق ہے مگر ہم ایک دوسرے کے ضد استعمال کرتے ہیں۔ مُترجَم کے معنی (ترجمہ کیا

ہوا) اور مترجِم کے معنی ترجمہ کرنے والا ایسے ہی رَاشی (رشوت دینے والا) اور مرتشی (رشوت لینے والا)

(۹)۔ تحقیقی مقالات میں ''حواشی وتعلیقات'' لکھنے کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ حواشی کے ساتھ تعلیقات کا لفظ لکھنا درست نہیں اس لیے کہ ''تعلیقات'' کے معنی مال واسباب کی ضبطی ،مکان کی قرقی اور قرق شدہ مال کی فہرست بنتے ہیں۔

(۱۰) اب چند ایسے الفاظ کی فہرست دی جارہی ہے جو غلط العام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں مثلاً کیجیے، لکھیئے غلط ہے اس کے بجائے کیجئے یا کیجیے، لکھیے یا لکھئے ہونا چاہیئے۔ برائے مہربانی کے بجائے براہِ مہربانی ، گرائمر کے بجائے گرامر ، طلباء کے بجائے طلبا لکھنا بہتر ہے۔ طلبا ،طلیب کی جمع ہے بہ معنی طالب علم اور طَلَبہ ، طالب کی جمع ہے معنی طالب علم اس طرح یہ لفظ اعراب سے زیادہ واضح ہوئے ہیں۔ اسی طرح استاد کی جمع استادان اور استاد کی جمع اساتذہ ہے مگر اُستاد کو موڑ دیبنا کر جمع اساتذہ لکھی جاسکتی ہے۔ اخبارات میں اربابِ محکمہ تعلیم کی طرف سے یہ اشتہار بڑے کرّ وفر سے شائع ہوتا ہے مثلاً ''آسامیاں خالی ہیں'' جب کہ آسامی کے بجائے ''اسامی'' لکھا جانا چاہیئے اس لیے کہ اسامی بہ معنی عہدہ اور نوکری استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے۔ ''آسامی'' کوئی لفظ نہیں ہے دوئم ، سوئم کے بجائے دِوّم ، سوّم ، کیلشیم کے بجائے کیلسیم ، امونیا کے بجائے ایمونیا اسی طرح وہ لفظ جو انگریزی حرف ''S'' سے شروع ہوتے ہیں۔ اُن سے پہلے ''ا'' کا اضافہ ہونا زیادہ بہتر ہے مثلاً سٹیشن کے بجائے اسٹیشن، سکول کے بجائے اسکول ، سٹائل کے بجائے اسٹائل وغیرہ۔ ایسے ہی بالوں کی کٹ'' کے بجائے بالوں کی لٹ

۔ استعمال کرنا چاہیے۔ استعفیٰ کے بجائے استعفا، جناب عالی کے بجائے (جناب عالی!) استوا
نہ کے بجائے اسطوانہ پیچ کس کے بجائے پیچ کش، دال چینی کے بجائے (دار چینی)، ابتداء
ارتقاء کے بجائے (ابتدا، ارتقا) لکھنا چاہیئے اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں جن کی
فہرست گنوانا مناسب نہیں۔ اہل علم اور ارباب شعور کو املا کی دُرستی کی طرف زیادہ دھیان دینا
چاہیے تاکہ ادب برائے اصلاح کا پہلو مدِ نظر رہے۔ الفاظ جانچ پڑتال کے بعد ضابطۂ تحریر میں
لائے جائیں۔

نورین طلعت عروبہ

حمد

خوشبوؤں میں ہوں سدا مدحتِ غفار کے پھول
نکہتِ فہم سے بھر دے مرے افکار کے پھول

ہر صدا میری ترے حکم کی تعمیل میں ہو
لکھے جانے پہ ہوں نازاں مرے اظہار کے پھول

میرے چھوٹے سے گھروندے میں بہاریں اُتریں
میرے دامن میں ہوں یارب ترے دربار کے پھول

اک عنایت کے طبق میں ہوں میسر لیے
جامِ کوثر سے لپٹتے ہوں ترے پیار کے پھول

ایک ڈوری ہو ثنا کی جو تجھے بھا جائے !
گوندھ کے لاؤں میں اس میں ترے معیار کے پھول

اپنے ہی در کی گدائی جو عطا کی ہے مجھے
تُو نے رکھے ہیں سلامت مرے پندار کے پھول

یہ عقیدت کی مہک، یہ مرے جذبات کا رنگ !
کاش مولا تجھے بھا جائیں یہ اشعار کے پھول

ظفر اکبرآبادی

حمد

ترا حُسن، حُسنِ تمام ہے ترا نور نورِ قدیم ہے
تو سمیع ہے تو بصیر ہے تو خبیر ہے تو علیم ہے

میں خطا ہوں گرچہ تمام تر تو ہے منتہائے عطا مگر
ہو کرم کی مجھ پہ بھی اک نظر تو رحیم ہے تو کریم ہے

میں ہوں ایک ذرۂ ناتواں تری ذات وسعتِ بیکراں
مرا سر کہاں ترا در کہاں میں حقیر ہوں تو عظیم ہے

رگِ جاں سے بھی تو قریب تر ہے نفس نفس تری رہگزر
ترا مُستقر ہے نظر نظر تو ہر ایک دل میں مقیم ہے

ہمدم جسے ہو تری لگن کرے کیوں ظفر وہ غم و محن
جو تری رضا میں رہے مگن وہ ترا رفیق و ندیم ہے

ماہر اجمیری

نعت

غلامیٔ شہِ بطحا سے فیض یاب کیا
مرے خدا نے کرم مجھ پہ بے حساب کیا

بلالؓ ہوں کہ ابوذرؓ اویسؓ ہوں کہ جنیدؒ
رسولِ پاکؐ نے ذرّوں کو آفتاب کیا

وہ آدمی تو ہے لیکن وہ آدمی کیا ہے
کہ جس نے مدحتِ احمدؐ سے اجتناب کیا

دی شب گزیدوں کو یوں حق نے صبحِ نو کی نوید
پیمبری کو محمدؐ کا انتخاب کیا

نشانِ تیرہ شبی مٹ گیا زمانے سے
بپا حضورؐ نے اک ایسا انقلاب کیا

اسیؐ نے ٹوٹے ہوئے دل ملا دیے جسؐ نے
دو ٹکڑے ایک اشارے میں ماہتاب کیا

ترے کرم کو بہر طور بے کراں پایا
کبھی جو اپنے گناہوں کا احتساب کیا

خدا کی ذات کا پرتو ہیں سرورِ کونینؐ
خدا کی ذات کو حضرتؐ نے بے نقاب کیا

جب ان کا سایہ نہیں ہے جواب کیا ہوگا
اُنھیں تو پیدا ہی خالق نے لاجواب کیا

بہ فیضِ سرورِ کونینؐ مجھ کو اے ماہر
ہر امتحان میں قدرت نے کامیاب کیا

امین راحت چغتائی

نعت

خواب میں دیکھی ہے اُس جلوہ نما کی صورت
یوں نظر آگئی تاثیرِ دعا کی صورت

راہِ طیبہ میں جو دیکھی کبھی سورج کی تپش
رحمتیں چھا گئیں گھنگھور گھٹا کی صورت

بھیجتا رہتا ہوں میں اُنؐ پہ درود اور سلام
کوئی پیدا تو ہوئی اپنی دعا کی صورت

پھر مدینے کو رواں ہوں دلِ صد چاک لیے
پھر نکل آئی ہے تجدیدِ وفا کی صورت

جب ہوا ایقانِ عطا حضرتِ شہؐ کے در سے
زندگی ملتی ہے پھر خوابِ ردا کی صورت

دولتِ جلوۂ دہلیزِ نبیؐ کیا کہنا!
مجھ کو انعام ہوئی میری وفا کی صورت

دل تو کہتا ہے وہاں جا کے پلٹنا کیسا؟
یوں بھی راحت ہے یہی میری بقا کی صورت

سید عارف

نعت نبیؐ

مری اوقات ہی کیا ہے کہ میں نعت نبی لکھوں
کہ اس موضوع پر تو
بات کرنے کے لیے درکار ہے قرآن کا لہجہ
وگرنہ کم سے کم ہو حضرت حسانؓ کا لہجہ
عمرؓ کا، حیدر کرارؓ کا، عثمانؓ کا لہجہ
یہ ذکر مصطفیٰؐ تو بارگاہ مصطفیٰؐ میں
حاضری کی ایک کوشش ہے
تجلّی کا وہ عالم ہے دیار نور حق سے
اکتساب روشنی کی ایک کوشش ہے
اندھیروں سے الجھنے انحراف تیرگی کی
اندمال زخم بے بال و پری کی
ایک خواہش ایک کوشش اک تمنا ہے
اگر منظور ہو جائے، اگر مقبول ہو جائے
وگرنہ تو یہ وہ دربار ہے جس میں
جنید و بایزید ایسے عظیم المرتبت
اہل نظر بھی
اپنے اپنے علم کے دفتر سمیٹے
ہاتھ باندھے دم بخود حیرت زدہ
سہمے ہوئے خاموش ہیں چپ ہیں
یہ وہ باب تحیّر ہے
جو صدیوں سے ریاکاری کے صحرا میں بھٹکتے
مصلحت اندیشیوں کا زہر پیتے
خود غرض بیمار لفظوں کی کلید سے نہیں کھلتا
یہ اک ایسا محیط بے کراں ہے
جس میں قرطاس و قلم کے سب سفینے ڈوب جاتے ہیں
جہاں حرف و بیاں کے سارے پرچم سرنگوں
اظہار کے سارے قرینے ڈوب جاتے ہیں
جہاں ایک ایک لمحے کی ابد آثار وسعت میں
کئی آفاق صدیاں، دن، مہینے ڈوب جاتے ہیں
یہ وہ دربار عالی ہے جہاں الفاظ کا سکہ نہیں چلتا
عقیدت کی زباں سے گفتگو آغاز ہوتی ہے
جہاں پر ایک اک ساعت بجائے خود تکلم ساز ہوتی ہے
خموشی ہمسر آواز ہوتی ہے
جہاں سر کو جھکا لینا ہی عارف در حقیقت
رفعت پرواز ہوتی ہے
تجھے گر اس سراپا روشنی کی نعت لکھنی ہے
تو اندر کی سیاہی دور کر پہلے
تو اپنے لمحہ موجود کے سارے علاقے
خوشبوئے عشق شہؐ لولاک سے معمور کر پہلے
خیل فکر کے ہر شہر میں نام رسول ہاشمی کا لا ئی منشور کر پہلے
محمدؐ سے وفا کو زیست کا دستور کر پہلے

سید تابش الوری

نعت

لفظ و معنی اوڑھ کر سَرورؐ کی خوشبو آگئے
جب بھی سوچا نت نئے سیرت کے پہلو آگئے

اک لطافت کی طرح مانند خوشبو آگئے
خوش خصال و خوش دل و خوش فکر و خوشرو آگئے

دونوں عالم کے حقائق ہو گئے ہیں آئینہ
آئینہ گر ، آئینہ دل ، آئینہ رُو آگئے

کعبہ و روضہ کی جانب دوڑتا جاتا ہوں میں
جانے جسم و جاں میں کن جذبوں کے آہو آگئے

کعبۂ اقدس پہ وہ ہیبت زبانیں گنگ تھیں
روضۂ اقدس پہ وہ شفقت کہ آنسو آگئے

ان کے رُخ کا جگمگا تھا یا نظر کا معجزہ
دل میں کرنیں سی کھِلیں آنکھوں میں جگنو آ گئے

سارا ماضی جالیوں سے خود بخود چھننے لگا
آئینے کے روبرو آیا تو آنسو آگئے

اُن کی نگری میں محبت کا خنک موسم ہے اور
جیسے ہم تپتے بیاباں سے لب جُو آگئے

پروفیسر شارق جاوید

نعت

کس قدر ہے شہرِ طیبہ، خوش نہاد و خوش نصیب
کوچہ کوچہ قریہ قریہ خوش نہاد و خوش نصیب

سرورِ کون و مکاں کے حُسن رحمت کے سبب
ہو گیا ہے ذرہ ذرہ خوش نہاد و خوش نصیب

مسکنِ او مرکزِ تکمیل و تسکین القلوب
چپہ چپہ گوشہ گوشہ خوش نہاد و خوش نصیب

سب فضائیں روح پرور سب ہوائیں مُشکبار
سارا مکہ کُل مدینہ خوش نہاد و خوش نصیب

میرے آقا خوش نژاد و خوش کلام و خوش عمل
کُل جہاں پر اُن کا سایہ خوش نہاد و خوش نصیب

ایں ہمہ احسان بر من از نگاہِ لطفِ او
میری قسمت کا صحیفہ خوش نہاد و خوش نصیب

چشمِ رحمت آپ کی مجھ پر پڑی ایسی پڑی
کِھل کے بولا دل کا غنچہ خوش نہاد و خوش نصیب

شارق اُن کا اُمتی ہوں مدح خواں اور نعت گو
یہ شرف اور یہ حوالہ خوش نہاد و خوش نصیب

نسیمِ سحر

نعتِ رسولؐ

جب سخن کرتے تھے ہوتے تھے ہویدا علم و فن
رحمۃ العالمینؐ تو تھے سراپا علم و فن!

ہر نظر حکمت تھی اُنؐ کی ہر اشارا علم و فن
اُنؐ کی ہستی نُور پیکر، اُنؐ کا چہرہ عِلم و فن

گرچہ ظاہر میں تو تھے اُمّی لقب میرے حضورؐ
بولتے تھے وہؐ تو ہو جاتے تھے گویا علم و فن

فخر ہے اور مان ہے اُنؐ کی غلامی پر مجھے
میرے آقا عقل و دانش، میرے آقا علم و فن

یہ عطا اللہ کی تھی، عکس تھا قرآن کا
مرتکز تھے ذاتِ اقدسؐ میں جو سارے عِلم و فن

حجرِ اسود اپنی چادر میں اُٹھایا آپ نے
واقعہ کرتا ہے یہ بھی آشکارا علم و فن

علم و فن کے دوسرے ماخذ تو بوسیدہ ہوئے
آج بھی تاریخ میں اُنؐ کا حوالہ علم و فن

اب بھی عہدِ جاہلیت میں کہیں ہوتے نسیم
گر نہ ہوتا آج بھی ان کا اشارا علم و فن

رشید آفریں

نعت

رفعتوں کے گُل کھلے ہیں گلستانِ نعت میں
ایک میں بھی ہوں مسافر کاروانِ نعت میں

چاند تاروں کی طرح ہیں نعت گو سب ضوفشاں
ایک سے ہے ایک بڑھ کر آسمانِ نعت میں

جن پہ اک چشمِ کرم خیر الوریٰؐ کی ہو گئی
پا گئے منصب وہ اعلیٰ اس جہانِ نعت میں

جس طرح شامل حریمِ نعت میں کچھ لوگ ہیں
کاش بن جاؤں میں باب اس داستانِ نعت میں

ہم نشیں اے غنچے کھلیں گے سب دلوں کے آخرش
دیکھ لینا اس بہارِ جاودانِ نعت میں

دھوپ کی نگری میں لاکھوں نعت کے سایا بھی ہیں
جو سکوں پاتے ہیں دِل کا سائبانِ نعت میں

نعت ہی کا فیض ہے ہر اہلِ دل کے واسطے
موج خود ساحل ہے بحرِ بیکرانِ نعت میں

کیا کہوں ممتاز اصنافِ سخن میں کیوں ہے نعت
پاک اِک جذبہ ہے اس روحِ روانِ نعت میں

روح و دل مسحور ہوں اِک والہانہ کیف سے
جب سرودِ سرمدی پائیں بیانِ نعت میں

آفریں پر میرے آقاؐ! ہو کرم کی اک نظر
اس کا ہدیہ بھی ہو شامل ارمغانِ نعت میں

اویس الحسن

نعت

فرشتوں کے پر ہیں مدینے کی گلیاں
وہ عرشی نگر ہیں مدینے کی گلیاں

سنو غم کی گرمی سے یوں جلنے والو!
شجر ہی شجر ہیں مدینے کی گلیاں

انہیں دیکھتے ہی ہوئی رات رخصت
سحر ہی سحر ہیں مدینے کی گلیاں

اگر ہو تمنا خزانے کی لے لو
سراسر گہر ہیں مدینے کی گلیاں

سنا ہے منور وہ ہوتا ہے عالم
جب آتی نظر ہیں مدینے کی گلیاں

جہاں پر ہیں جلوے خدا کی عطا کے
فلک کے وہ در ہیں مدینے کی گلیاں

سہاروں کی حاجت نہیں مجھ کو باقی
کہ حدِ نظر ہیں مدینے کی گلیاں

سید حبیب اللہ بخاری

نعت

مقصد ہے زندگی کا مرا مدحتِ رسولؐ
پیکر میں جاں گداز رہے عظمتِ رسولؐ

ہے اُسوۂ رسولؐ میں پنہاں سکونِ دل
قول و عمل سے آئے نظر نُدرتِ رسولؐ

انسانیت اساس ہے دینِ مُبین کی
بے معنی زندگی ہے بجز صبغتِ رسولؐ

گر رہ روانِ شوق کو منزل کی ہے تلاش
پائیں گے جن کو خوب رہی صُحبتِ رسولؐ

اِس عارضی دیار سے رخصت ہوں جب حبیب
ہے آرزو کہ سامنے ہو صُورتِ رسولؐ

رشید آفریں

سلام

چار سُو ہیں امامؑ کی باتیں
سبطِ خیر الانامؐ کی باتیں

منزل و راہ و گام کی باتیں
ارضِ کوفہ و شام کی باتیں

مرحلے دیں کی پاسداری کے
خلد و کوثر کے جام کی باتیں

لب پہ قرآن سر تھا نیزے پر
شاہؑ کے اُس قیام کی باتیں

ظلم سہتے رہے شہِؑ کربل
پر نہ کیں انتقام کی باتیں

فرش تا عرش جن کا چرچا ہے
حُر سے ادنیٰ غلام کی باتیں

آج بھی ہیں فرات کے لب پر
اصغرؑ تشنہ کام کی باتیں

پیرویٔ حسینؑ کے آگے
ہیچ ہیں ننگ و نام کی باتیں

آفریں وجہِ استقامت ہیں
شاہؑ عالی مقام کی باتیں

کربلا

جو سر کٹا کے سر ہوا وہ معرکہ ہے کربلا
مشیّتِ خدا جو تھا وہ فیصلہ ہے کربلا

ازل سے تا ابد رہے گا استوار دین سے
کبھی نہ ٹوٹ پائے جو وہ رابطہ ہے کربلا

رسالتِ رسولؐ اور شہادتِ حسینؑ میں
بنامِ دیں جو طے ہوا وہ فاصلہ ہے کربلا

امامؑ ہی تھے جو چلے تو دین حق بچا لیا
کوئی نہ چل سکے جہاں وہ راستہ ہے کربلا

لبِ فرات جو لٹے وہ سر بلند ہو گئے
جو تشنہ لب گزر گیا وہ مرحلہ ہے کربلا

فروغِ حق کی دہر میں عظیم تر مثال ہے
رواں رہے گا حشر تک وہ سلسلہ ہے کربلا

فلک پہ قدسیوں کے دِل دہل گئے تھے یک بہ یک
بنائے عرش ہل گئی وہ زلزلہ ہے کربلا

کتابِ کائنات کا ہے بابِ نور آفریں
جو آج بھی ہے بے بدل وہ واقعہ ہے کربلا

شفق ہاشمی

تزکیۂ نفس

قسم سورج کی اور اس کے جمالِ نور پیکر کی

قسم ہے چاند کی جب اس کے پیچھے جلوہ آرا ہو،

قسم ہے روزِ روشن کی جسے سورج نے دی تاب و توانائی،

قسم دامانِ شب کی جس میں ہے خورشید پوشیدہ

قسم ہے گنبدِ افلاک اور اس ذات کی جس نے اسے تخلیق فرمایا

قسم ہے جنتِ ارضی کی اور اس ذاتِ باری کی کہ جس نے ہے اسے ہموار فرمایا

قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس قادرِ مطلق کی جس نے اس کو نِک سکِ سے سنوارا ہے

وہ جس نے پھر تمیزِ نیک و بد کر دی ودیعت اس کی فطرت میں!

یقیناً کامراں ہے نفس کا اپنے کیا ہے تزکیہ جس نے،

خسارے میں ہے جس نے اس کے فطری حسن کو پامال کر ڈالا۔!!

ثمود اپنی اسی سرکش روش سے مجرمِ انکارِ حق ٹھہرے،

اٹھا تھا قوم کا مردِ شقی جب (شر پہ آمادہ)،

رسولِؑ وقت نے ان سے کہا: اللہ کی جانب سے ہے ایک امتحاں ناقہ،

اسے پانی سے مت روکو!

نہ مانی پر انہوں نے بات اور ناقہ کی کوچیں کاٹ دیں چاروں،

خدائے برتر و بالا کا ان پر جرم کی پاداش میں ٹوٹا عذاب آخر،

کہ جس نے کر دیا پیوندِ خاک ان کو!

کسی (شوریدہ سر کا) جو بھی ہے انجامِ بد رب کو بھلا کیا خوف ہو اس کا۔!!

مترجم: شفق ہاشمی

اُمّ المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ شاعر دربار رسالتؐ سیدنا حسان بن ثابتؓ

لَنا شَمسٌ وَ لِلآفاقِ شَمسٌ
وَشَمسِی خَیرٌ مِنْ شَمسِ السَّماءِ
فَاِنَّ الشَّمسَ تَطْلَعُ بَعدَ فجرٍ
وَشَمسِی طَالِعٌ بَعدَ العِشاءِ

ترجمہ

مرا بھی مہر درخشاں ہے اور فلک کا بھی
فلک کے مہر سے بہتر مگر مرا سورج
نمودِ فجر پہ چمکا ہے آسماں کا مہر
شبِ سیاہ میں بھی جلوہ گر مرا سورج

واجمل منک لم تر قط عینی
واحسن منک لم تلد النساء
خلقت مبراء من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاء

ترجمہ

مری آنکھوں نے تجھ سا خوبرو دلبر نہ دیکھا
سپوت ایسا سراپا حسن اور کس ماں کا ہوگا
تجھے خلاق عالم نے کیا ہر عیب سے پاک
بنایا ہے تجھے گویا کہ جیسا تو نے چاہا

آمنہ عالم

(آیۃ الکُرسی کے منظوم ترجمہ کی ایک کوشش)

"صاحب قدرت"

ایک وُہی بس صاحبِ قدرت
لائق سجدہ فخرِ عبادت
زیب اُسی پر کلمہ وحدت
ذکر ہے اس کا باعثِ رحمت
ایک وہی بس صاحبِ قدرت

کس میں بھلا ہے اتنی جسارت
اس کی رضا بن اُس کی اجازت
لب پہ وہ لائے حرفِ شکایت
ایک وہی بس صاحبِ قدرت

قائم ودائم ذات اُسی کی
اونگھ نہ اُس نے نیند کبھی کی
ہر اک شے ہے اُس کی شہادت
ایک وہی بس صاحبِ قدرت

اعلیٰ و برتر ذات وہ سب سے
کون و مکاں ہے اس کے سبب سے
سہل ہے اس کو ان کی حفاظت
ایک وہی بس صاحبِ قدرت

ارض و سما کے سارے مظاہر
چاہے خفی ہوں یا کہ وہ ظاہر
اس پہ عیاں ہے سب کی حقیقت
ایک وہی بس صاحبِ قدرت

اس کا زمانہ، وقت اُسی کا
اس کی ہے کرسی تخت اس کا
مالکِ رفعت، والیِ عظمت
ایک وہی بس صاحبِ قدرت

مضطر اکبرآبادی

○

ٹل جائے گا، غمِ سحروشام ہی تو ہے
دم توڑ دے گی، گردشِ ایام ہی تو ہے

بھرتے ہیں جس کا دم ہمہ دم ذات ہے تری
وردِ زباں جو ہے وہ ترا نام ہی تو ہے

عرفان اپنی ذات کا بخشا ہے جو مجھے
وہ بھی مرے خدا ترا انعام ہی تو ہے

میں نے تکلف کیا نہ کسی کا بھی حق کبھی
مجھ پر خدا گواہ یہ الزام ہی تو ہے

اپنے مقام کا جو تعیُّن نہ کر سکے
وہ کامیاب ہو کے بھی ناکام ہی تو ہے

کرتا ہے صبح تک جو رفاقت کا حق ادا
مضطر وہ اِک چراغِ سرِ شام ہی تو ہے

ماحول کی گھٹن میں بھی جو لے رہا ہوں سانس
پروردگار ! یہ ترا انعام ہی تو ہے

○

محدود کر کے دائرہ اندازو ناز کا
بن جاؤ آسرا کسی بے برگ و ساز کا

میں کیوں سکونِ قلب کی مانگوں کسی سے بھیک
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے کارساز کا

جاں کو تلاش پھر کسی آرام جاں کی ہے
ہے دل کو انتظار کسی دلنواز کا

دھندلائی جا رہی ہے حقیقت کی روشنی
عالم پہ ہے محیط اندھیرا مجاز کا

جس سے کماں کی طرح کمر ہو گئی ہے خم
ہے بوجھ اپنے سر پہ وہ عمرِ دراز کا

دے تو دیا ہے دل کسی انجان کو مگر
دھڑکا لگا ہوا ہے اب افشائے راز کا

مضطر ہے اپنا دل ہی فقط اپنی سجدہ گاہ
انداز ہی جُدا ہے کچھ اپنی نماز کا

انور جہاں برنی ۔ ورجینیا ۔ (امریکہ)

O

دل کے احوال جب سنائے ہیں
آپ سن سن کے مسکرائے ہیں

موت نے جب گلے لگا ہی لیا
کس لیے آج آپ آئے ہیں

ضبط نے بڑھ کے ان کو تھام لیا
جب بھی آنسو پلک تک آئے ہیں

زندگی ہم نے تیری راہوں میں
کیسے کیسے فریب کھائے ہیں

آپ آئے نہیں تو پلکوں پر
ہم نے شب بھر دیئے جلائے ہیں

شاہ راہِ حیات پر اے دل
کیسی مایوسیوں کے سائے ہیں

ناوک افگن کہیں نہ ہو بدنام
ہم نے ہنس ہنس کے تیر کھائے ہیں

عالم رنگ و بو میں اے انور
کون اپنا ہے ؟ سب پرائے ہیں

O

صبوئے حسن سے پی ہے جو انگبیں میں نے
بنا لیا ہے تصور کو آتشیں میں نے

جنونِ بندگی عشق کفر تک پہنچا
نقوشِ پا پہ جھکائی جہاں جبیں میں نے

ہے کائنات میں کیا کہہ سکوں جسے اپنا
بس ایک دل تھا جسے کھو دیا کہیں میں نے

مرے غموں کے لیئے چارہ گر نہ سوچ علاج
چُنا یہ زیست کا سرمایۂ حسیں میں نے

دکھا کے آئینۂ حسنِ یار و جلوۂ دوست
غمِ حیات کی زلفیں سنوار لیں میں نے

سحر وہ کونسی ہے جس کے انتظار میں ہوں
اسی خیال میں راتیں گزرار دیں میں نے

تخیلات کی رو میں حقیقتوں سے پرے
بنائی گنبدِ افلاک پر زمیں میں نے

یہ کس کا غم ہے کہ ہر غم سے بڑھ گیا انور
لٹائے کس کے لیئے آج عقدہ ودیں میں نے

تنویر پھول۔(امریکہ)

○

("تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو" مرحوم کلیم عاجز کی مشہور غزل کی زمین میں چند اشعار)

تم طنز کے خنجر سے سدا وار کرو ہو
یہ کام بڑے شوق سے ہر بار کرو ہو

بھڑکاتے ہو تقریر سے تم شعلۂ نفرت
کیا تم کو ہُوا؟ کیسی یہ گفتار کرو ہو

بٹتے ہی چلے جاتے ہو فرقوں میں مسلسل
تم روز کھڑی اک نئی دیوار کرو ہو

دل کھول کے ہم نے ہے رکھا، تم بھی تو بولو
اظہارِ محبت میں یہ کیا عار کرو ہو

کیا ہم نے کہا تم سے کہ شرمائے اچانک
کس بات پہ چہرے کو یوں گلنار کرو ہو

آتا ہے تمھیں خوب ہنر ساقیِ بے مے!
آنکھوں سے پلا کر ہمیں سرشار کرو ہو

پرکھا[1] جنھیں اک بار ہے پھر اُن پہ بھروسا!
بے کار کرو ہو میاں! بے کار کرو ہو

مظلوم کو انصاف تو ملتا ہی نہیں ہے
آراستہ تم روز ہی دربار کرو ہو

جاں لیتے ہو انسانوں کی، بہتا ہے لہو روز
تم زندہ یہاں قصۂ تاتار کرو ہو

اسلام کے چہرے پہ لگے دھبے ہیں خوں رنگ
چنگیز بنے، سب کو ہی بے زار کرو ہو

تم دین سے خارج ہوئے، کہتی ہیں حدیثیں
ڈھاتے ہیں سیہ، ظلم کی بھر مار کرو ہو

کہتا ہے یہی پھول، سدھر جاؤ خدارا
کیوں گلشن بے خار کو پُر خار کرو ہو

---

[1] مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

امین راحت چغتائی

O

کیسی اِٹھلاتی مہکتی ہوئی لہرائی ہے
رُت بدلنے کا جو پیغام صبا لائی ہے

وہ بھی آغازِ قیامت پہ تُلے بیٹھے ہیں
اور ادھر ہم نے بھی جینے کی قسم کھائی ہے

جاگ کر نیند بھری رات گزارو لوگو
کب سے آواز لگاتا ہوا سودائی ہے

مسندیں اُلٹیں گی اک روز یہ باور کر لو
اہلِ مسند کے مقدر میں بھی رسوائی ہے

مہرباں! دیر سے احساسِ ندامت کیسا
لوحِ دیوار نہ پڑھنے کی سزا پائی ہے

کون پیماں شکن ہے کوئی پیماں باندھے
یاد ہم آتے ہیں جب جان پہ بن آئی ہے

کس میں ہمت ہے کہ معمولِ گلستاں بدلے
جب خزاں آئی ہے احساسِ نمو لائی ہے

آنکھ کھولے گا جو سورج تو یہ چھٹ جائے گی
ایک بدلی سی سرِ شرقِ افق چھائی ہے

منحرف کون ہے ایقانِ سحر سے راحت
رات آئی تو سویرے کی خبر لائی ہے

شاہین

O

ماروی قید سے باہر تو نکل آئی ہے
سندھ اب سارا عمر کوٹ کی پہنائی ہے

جانے کیوں زرد ہوئے جاتے ہیں قالین کے پھول
ڈالیوں پر تو بھرے باغ میں رعنائی ہے

یوں بھی ہر یاد کی اک عمر ہوا کرتی ہے
بھول جانا ترا تکمیلِ شناسائی ہے

فاصلہ ہو نہ مناسب تو ہے بس ایک عذاب
مہرِ تاباں ہی کی اک شکل تو سچائی ہے

ہم کسی طور کھلونوں سے نکلتے ہی نہیں
دن جو باقی ہیں وہ جھیلی ہوئی تنہائی ہے

اجنبی آنکھ چھپا لے گئی اپنی وحشت
بے مزہ سی سفرِ شوق میں رسوائی ہے

دوسری بار یہ دیکھا وہ کوئی شے ہو کہ شخص
اس میں انجانے سے اک بھید کی گہرائی ہے

جشنِ لالہ کا اتر آیا ہے زخموں میں سرور
معجزہ سی مری صحرا میں سبک پائی ہے

خود کو شاہین سنبھلنے نہیں دیتے اک پل
چوکھی سی یہ عجب معرکہ آرائی ہے

شفق ہاشمی

○

جو ہیں کرچیاں میرے خواب کی ، جو گہر ہیں میرے خیال کے
ہیں امانتیں مہ و سال کی ، انہیں دیکھو رکھنا سنبھال کے

دلِ مضطرب کو خبر نہیں غمِ عشق ہے غمِ زندگی
وہ جو نالہ ہائے فراق ہیں، وہی زمزمے ہیں وصال کے

تجھے گردشِ شب و روز کا یہ پیام کیوں نہ پہنچ سکا
لبِ بام اوجِ کمال ہیں وہ جو سلسلے ہیں زوال کے

جو گزر گئی ہیں قیامتیں دلِ زندہ کی ہیں علامتیں
مرا زخم زخم ہے ضو فگن میرے حوصلے ہیں کمال کے

ابھی کارزارِ وفا میں ہیں جنہیں معرکے کئی سامنے
وہ اسیرِ گیسوئے مشکبو ، نہ قتیل چشمِ غزال کے

سرِ شاخ طائر خوش نوا ہے شفق کہاں ابھی آشنا
ہے فسونِ دانہ و دام یا کہ ہیں مسئلے پر وبال کے

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

O

انساں سے ہر شے کہتی ہے آؤ مجھے تسخیر کرو
تاریخِ دُنیا میں اپنا باب نیا تحریر کرو

خودداری مت بیچو ہرگز، مت نیلام ضمیر کرو
ترکِ خیالِ تحصیلِ جاہ و مال و جاگیر کرو

محبوبوں کے حُسن کے قصّے توصدیوں سے جاری ہیں
اَب اپنے دُکھ درد کی بھی کچھ تشریح و تفسیر کرو

اہلِ قلم! اب تو خوابوں کی دُنیا سے نکلو باہر
انسانوں کی بدحالی کی پیش اصلی تصویر کرو

مجبور اور مظلوم انسانوں کے پونچھو، بہتے آنسو
حُسنِ عمل سے ظلمت گاہِ دہر کو پُر تنویر کرو

ہم کو قومی شیرازہ بندی کی، سخت ضرورت ہے
جس سے ٹوٹے دل جڑ جائیں، اب ایسی تدبیر کرو

اے جو شیلے راہ نماؤ! رحم کرو اب لوگوں پر
آگ جو نفرت کی بھڑکا دے، مت ایسی تقریر کرو

سخت دلوں کو جو نرمائے، نرم دلوں کو پگھلا دے
حُسنِ بیاں سے اپنی زباں میں پیدا وہ تاثیر کرو

رحم کرو لوگوں پر تاکہ تم پر رحم کیا جائے
اپنے رب سے بخشش مانگو، جب کوئی تقصیر کرو

ماضی کی غم ناک کہانی سے حاصل کرکے عبرت
ذہن میں مثبت سوچوں کا اک قصرِ نو تعمیر کرو

آج کے انساں کو آتا ہے صرف یہ ایک ہی کام جلال
اپنے عیب پہ پردہ ڈالو، خوبی کی تشہیر کرو

صابر عظیم آبادی

○

ہاتھ پر لکھ کے کوئی نوحۂ خوشبو آؤ
ٹوٹ کر گرنے لگے پھولوں کے بازو آؤ

کرب کے غنچے سرِ شام چٹک جاتے ہیں
ایسے لمحوں میں لیے وصل کی خوشبو آؤ

موسم گل بھی حسیں شام کا منظر بھی حسیں
مجھ سے ملنے کے لیے آج لب جو آؤ

گزرے لمحات کے چہرے کو نہ دیکھو مڑ کر
حال کے دوش پہ فردا کے ہیں گیسو آؤ

دشتِ پُر خار میں تنہا میں رہوں گا کیسے
چوکڑی بھرنے لگا یاد کا آہو آؤ

ظلمت شب کا کرو خوف نہ اتنا جاناں
کر گیا دشت کو روشن کوئی جگنو آؤ

منہدم کرنے کو دیوارِ طلسم حیرت
اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے جادو آؤ

کنج گلشن میں ہو کیوں بیٹھے اکیلے صابر
دیکھنے تم بھی ذرا پلکوں پہ جگنو آؤ

○

غریبِ تابشِ حسن و جمال کر دے گا
وہ زندگی کو تری پائمال کر دے گا

جواب اس سے طلب کیا کروں وہ شاطر ہے
سوال کرنے سے پہلے سوال کر دے گا

مجھے یقیں نہیں آتا کہ وہ محبت میں
عنایتوں سے مجھے مالا مال کر دے گا

سنا ہے اپنی انا برقرار رکھنے کو
وہ میرے گھر کو جلا کر کمال کر دے گا

اگر میں اس کی ہر اک بات مان لوں تو مجھے
نشاطِ عہدِ گزشتہ بحال کر دے گا

ہمارا نام وہ لکھ کر ہوا کے آنچل پر
کسے خبر تھی ہمیں لازوال کر دے گا

امیرِ وقت کی مرضی سے کام کرتا ہوں
نہیں تو وہ مرا جینا محال کر دے گا

کیا نہ شکوہ بھی میں نے سوچ کر صابر
وہ اور مجھ کو غریقِ ملال کر دے گا

نسیمِ سحر

O

سوال کس سے کروں، کس کو لاجواب کروں؟ بہت سے چہرے ہیں مَیں س کا انتخاب کروں
کشید کرتا ہوں راحت عذابِ ہجر سے بھی! مرا کمال ہے کانٹے کو بھی گلاب کروں، مرا کمال
یہ چاہتا ہوں رُخِ یار سامنے لا کر مہ و نجوم کو محرومِ آب و تاب کروں
کسی کی سمت نہ مَیں اُنگلیاں اُٹھاؤں کبھی جو صدقِ دل سے کبھی اپنا احتساب کروں
جُدائیوں کے مراحل کا یہ تقاضا ہے کہ اپنی آنکھ کو راوی کروں چناب کروں
وُہ مجھ سے عہدِ وفا کا حساب مانگتا ہے مَیں اپنے روز و شبِ غم کا کیا حساب کروں؟
ترا ہی ذکر ہو میری کتاب میں اور پھر مَیں یہ کتاب ترے نام انتساب کروں
عجب ہے یہ مری خواہش تری رفاقت میں کہ جیتے جاگتے منظر بھی خواب خواب کروں
مَیں اُس کی یاد کی دستک سے جاگ اٹھوں گا اِس انتظار میں نیند اپنی کیوں خراب کروں؟

مطالعے کے جنوں میں یہ چاہتا ہوں نسیم
تمام عُمر رُخِ یار کو کتاب کروں

سرور عالم راز سرور (امریکہ)

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
حجابِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں
محبت پھر اس کا بیاں! اللہ اللہ!
زمیں ہو گئی آسماں! اللہ اللہ!

نگاہِ سُرمگیں ہے اور تو ہے
بیانِ آرزو ہے اور میں ہوں
ہوئی آرزو پھر جواں! اللہ اللہ!
کوئی ہو گیا مہرباں! اللہ اللہ!

متاعِ زندگی تھوڑی ہے میری
یہی اِک آبرو ہے اور میں ہوں
سرِ طورِ عرفاں، یہ طوفانِ حیرت!
حجاباتِ کون و مکاں! اللہ اللہ!

مجھے دَیر و حرم سے واسطا کیا
طوافِ کُو بہ کُو ہے اور میں ہوں
بھلا کس طرح ملتی منزل خودی کی
صنم خانۂ این و آں! اللہ اللہ!

وفا ناآشنا تیری نظر ہے
دلِ آشفتہ خُو ہے اور میں ہوں
نہ میرا گلستاں، نہ میری خدائی
مگر ہے غمِ آشیاں! اللہ اللہ!

خدایا! بے نیازِ آرزو کر
یہی اک آرزو ہے اور میں ہوں
زمانے کی یہ کروٹیں! توبہ توبہ!
محبت کی یہ داستاں! اللہ اللہ

میں کس منزل پہ آپہنچا ہوں آخر
یہاں بس تو ہی تو ہے اور میں ہوں
اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو گیا میں
سرابِ یقین و گماں! اللہ اللہ!

مجھے بھاتی نہیں دُنیا کی باتیں
جہانِ حیلہ جُو ہے اور میں ہوں
خدا بن گئی میری یہ خود پرستی
ہوا جب میں خود پر عیاں! اللہ اللہ!

مجھے یوں راس آئی خود شناسی
خدا سے گفتگو ہے اور میں ہوں
تمنا، غمِ بیکسی، نامرادی
مقاماتِ آہ و فغاں! اللہ اللہ!

مجھے فکرِ دو عالم کیوں ہو سرور
وہ میرے رو برو ہے اور میں ہوں
مگر زندہ ہے چار و ناچار سرور
تقاضائے دَورِ جہاں! اللہ اللہ!

آمنہ عالم

O

درد کی آگ کو ہوا دی جائے
عشق کو ہجر کی دُعا دی جائے

اک وہی جو پُکار سُنتا ہے
آخری سانس تک صدا دی جائے

دل پہ تحریر جو لہو سے لکھی
حُکم آیا کہ سب مٹا دی جائے

روح پھر روح سے چلی ملنے
راہ افلاک تک سجا دی جائے

وصل میں جسم ہی تو حائل ہے
سو یہ دیوار بھی گرا دی جائے

رقّت قلب میں ہے کسر ابھی
رنج کی آنچ کچھ بڑھا دی جائے

خاک میں خوئے خاکساری بھی
رہگور رہگور بچھا دی جائے

تعزیت کر کے جا چکے آنسو
یہ صفِ غم بھی اب اُٹھا دی جائے

کوئی انعام خود فراموشی!
یاد کرنے پہ گر سزا دی جائے

زیرِ نظر ہے جبر کا ایسا نصاب ان دنوں
جس میں نہیں ہے عدل کا اک بھی باب ان دنوں

خوف زدہ سی یہ بہار خود سے بہت ہے شرمسار
روندھ گیا ہے یوں کوئی کھلتے گلاب ان دنوں

بامِ فلک کا صاحبو! اس میں نہیں ہے دوش کچھ
ہے جو زمیں پہ چارسُو فصلِ عذاب ان دنوں

جس سے لکھی تھی ریت پر ظلم کی داستاں کبھی
مانگ رہا ہے وہ لہو اپنا حساب ان دنوں

دل کی فضا دھواں دھواں آنکھ سے جوئے خوں رواں
جلنے لگا ہے پھر کوئی خیمۂ خواب ان دنوں

گرچہ ہے کِذب وصدق کا آج بھی معرکہ بپا
مل نہ سکے گا ایک بھی حرِ سا جناب ان دنوں

اپنے عدو و دوست میں کیسے کریں تمیز ہم
پہنے ہوئے ہے ہر کوئی رُخ پہ نقاب ان دنوں

ساری سیاہ کاریاں جس میں سمٹ کے آگئیں
ہم پہ لکھی ہے وقت نے ایسی کتاب ان دنوں

اب جو کتاب زندگی ہونے کو ہے ورق ورق
چشمِ خرد پہ کھل گیا کیسا یہ باب ان دنوں

کرامت بخاری

○

خوشیوں کے دن کم ہوتے ہیں
باقی غم ہی غم ہوتے ہیں

بزم شب تنہائی میں اکثر
تم ہوتے ہو ہم ہوتے ہیں

معنی اور مفہوم ہمیشہ
اپنے آپ مبہم ہوتے ہیں

راہِ عدم کو جانے والے
کتنے تیز قدم ہوتے ہیں

آنکھ میں آنسو آ جانے سے
منظر کتنے نم ہوتے ہیں

وہ تلوار سے کب ڈرتے ہیں
جن کے ہاتھ قلم ہوتے ہیں

اہل جنوں کا ہاتھ ہو جن پر
جام وہ جام جم ہوتے ہیں

دُکھ سُکھ دونوں دیکھ کرامت
کیسے ذات میں ضم ہوتے ہیں

○

نوعِ انساں کو کچھ اس طور سے بھایا پتھر
بعد مرنے کے بھی تربت پہ لگایا پتھر

جب بھی نسبت کوئی پاکیزہ نسب تک پہنچی
ہم نے چوما کبھی آنکھوں سے لگایا پتھر

اہل دربار کے کردار سے واقف ہوں میں
کس کی ہمت ہے کہ مارے مجھے پہلا پتھر

مفلسی اہل شرافت کو کہاں لے آئی
کبھی اوڑھا ، کبھی پہنا کبھی کھایا پتھر

ایک ہم ہیں کہ خموشی کو زباں دیتے ہیں
ایک وہ ہیں کہ بنے بیٹھے ہیں چپ کا پتھر

اُس نگوں بخت کو محوِ غمِ عصیاں جانو
جس نے اپنے لیے معبود بنایا پتھر

جھوٹ کو جھوٹ کرامت نے کہا تو فوراً
شہر کے شہر نے ہاتھوں میں اُٹھایا پتھر

ڈاکٹر فریاد آزر ۔ دہلی (انڈیا)

○

دل نے اچھائی، برائی کو بس اتنا سمجھا
یعنی گر خود کو بُرا سمجھا تو اچھا سمجھا

ہم سمجھنے لگے مجرم ہے ہمیں میں کوئی
حادثہ ایسا رچایا گیا سوچا سمجھا

اب سمندر پہ وہ چلتا ہے تو حیرت کیسی
عمر بھر اس نے سرابوں کو ہی دریا سمجھا

اور چارہ بھی نہ تھا اس کے علاوہ کوئی
ہم نے ہر دور میں قاتل کو مسیحا سمجھا

مجھ کو سیلاب نے سمجھایا زمیں پیاسی تھی
زلزلہ آیا تو میں نے ترا غصہ سمجھا

اب تو وہ آگ ہیولوں سے بھی آگے ہیں بہت
تُو نے انساں کو فقط خاک کا پتلا سمجھا

قصہء درد سنا سب نے مرا، سچ ہے مگر
یہ بھی سچ ہے کہ سبھی نے اسے قصہ سمجھا

مات دی میں نے جو شیطاں کو بھی عیاری میں
پھر مجھے سارے زمانے نے فرشتہ سمجھا

عمر بھر خامہء تنقید نے مانا مردہ
بعد از مرگ مجھے اس نے بھی زندہ سمجھا

جب مرے خواب حقیقت میں نہ بدلے آزر
میں نے دنیا کی حقیقت کو بھی سپنا سمجھا

○

جہاں کے واسطے سامانِ عبرت کر رہے ہیں
ہم اپنے نفس کی ایسی اطاعت کر رہے ہیں

کسی کو ایک ہی سجدہ میں جنت مل گئی ہے
مگر کچھ لوگ صدیوں سے عبادت کر رہے ہیں

ابھی فرصت نہیں مرنے کی تیاری کی ہم کو
ابھی ہم لوگ جینے کی حماقت کر رہے ہیں

حقیقت اس قدر سنگین ہوتی جا رہی ہے
نگاہوں سے سنہرے خواب ہجرت کر رہے ہیں

نہیں مرغوب مردہ بھائیوں کا گوشت کھانا
تو ہم پھر کس لیے غیبت پہ غیبت کر رہے ہیں

بھروسا اٹھ گیا جنت سے کیا اہلِ زمیں کا
اسی دنیا میں ہی تعمیر جنت کر رہے ہیں

ہمارے صبر کا انداز بدلا جا رہا ہے
تو کیا ہم اپنے قاتل کی حمایت کر رہے ہیں

بزرگوں کی کبھی خدمت نہ کر پائے تھے آزر
سو اپنے آپ کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں

پروین شیر۔۔وِنی پیگ (کینڈا)

O

مقتل سے جب گزر کے حریفانہ آیئے
اِک دشتِ بے کنار میں پھر گھر بنایئے

چہروں کی قید سے ہوئے آزاد گر کبھی
بکھرے ہوئے وجود کو کیسے بچایئے

ہونے نہ پائے پھولوں کا محتاج گلستاں
دل کے ہزار زخم ہمیشہ کھلایئے

تاریک ہو نہ پائے کبھی دامنِ فلک
پلکوں پہ تا بہ صبح ستارے سجایئے

ساحل نہ دے سکا جو سہارا تو کیا ہوا
گرداب کو اسیرِ سفینہ بنایئے

O

ازل سے تابہ ابد سب کے سب اکیلے ہیں
تو پھر یہ کس کے لیئے زندگی کے میلے ہیں

یہ کس تلاش میں پاگل ہوا بھٹکتی ہے
عذاب کس نے کیئے ہیں کہ اس نے جھیلے ہیں

لہو لہان گزرنا پڑا ہے ننگے پاؤں
رہِ حیات کے پتھر بہت نکیلے ہیں

کہیں ہیں ٹوٹے کھلونے کہیں جلے بستے
ستم گروں نے یہاں کیسے کھیل کھیلے ہیں

حسین خوابوں سے سرسبز رُت نے پایا کیا
ہر ایک برگ تمنا کے رنگ پیلے ہیں

سلیم زاہد صدیقی

O

جب سے کسی کی زلف کے پابند ہو گئے
جو لوگ بے ہنر تھے ہنر مند ہو گئے

رندوں کو پہلے شیخ نے پہنائیں بیڑیاں
پھر معرکہ سجا کے ظفر مند ہو گئے

سچ بولتا ہوں ساتھ مرا کون دے یہاں
میرے علاوہ سب ہی خرد مند ہو گئے

اس تیرگی میں کون دکھائے گا راستہ
جو لوگ دیدہ ور تھے نظر بند ہو گئے

کچھ اس طرح سے آپ نے سلجھائی زندگی
سب مسئلے حیات کے دو چند ہو گئے

زاہد تمہاری باتیں یہاں پر سنے گا کون
سب لوگ اپنی ذات کے پیوند ہو گئے

O

"نہ بے رخی کوئی برتی، نہ التفات کیا"
عجب معاملہ اس نے ہمارے سات کیا

مفادِ ذات کے ناپو دکھائی دینے لگے
کھلے دماغ سے جب ذکرِ واقعات کیا

یہی ہے دکھ کہ کوئی بھی مجھے سمجھ نہ سکا
گو ایک عمر سفر سب نے میرے سات کیا

تمہارا بخشا ہوا اک خطاب تھا لوگو
بہ احترام جسے ہم نے اسمِ ذات کیا

حیات ایسے گزاری ہے شہر میں تیرے
قیام جیسے شبِ غم لبِ فرات کیا

تمہارا نام ہی تسکینِ قلب تھا زاہد
تمہارے نام کا ہی ورد ساری رات کیا

ڈاکٹر نثار ترابی

O

جب قریۂ کم خواب میں حیرت نہ رہے گی
تا حدِّ نظر کوئی بھی وحشت نہ رہے گی

جب چیزیں ہی معیار بنادی ہیں تو اک دن
ان خون کے رشتوں میں بھی رغبت نہ رہے گی

دیوانے بھٹک جائیں گے منزل کی طلب میں
صحرا کو اگر قیس سے نسبت نہ رہے گی

اس درجہ مشینوں سے لگاؤ جو رہے گا
انساں کو بھی انساں کی ضرورت نہ رہے گی

اس طرح جو مصروف رہے کارِ جہاں میں
خود سے بھی ملاقات کی فرصت نہ رہے گی

دل ہے تو کسی طور سنبھلنا ہے قیامت
دل ہے تو کبھی ایک سی حالت نہ رہے گی

نوید سروش

O

اک نئی دنیا بسائی خاک پر
پھر نئی شمع جلائی خاک پر

ذہن میں کیا کیا خیال آتے رہے
ہم نے اک صورت بنائی خاک پر

سامنا مجھ کو تو ناکامی کا تھا
راہ یہ کس نے دکھائی خاک پر

تیر دل پر بے وفائی کے لگے
پیار کی دولت نہ پائی خاک پر

گلستاں کیوں صورت صحرا ہوئے
کب تھی ایسی بدنمائی خاک پر

زاویے سوچوں کے بدلے ہیں سروش
کس کی ہے جلوہ نمائی خاک پر

فریدہ لاکھانی۔فرح (سڈنی آسٹریلیا)

O

سروں پہ خار سجائے گلاب آتے ہیں
اٹھائے سچ کا علم انقلاب آتے ہیں

عجیب شوقِ طلب ہے طلب گزاروں کا
گناہ جب بھی بلائے ثواب آتے ہیں

ضمیر کی ہے خلش یا گناہ کا موسم
انہیں تو دن میں بھی راتوں کے خواب آتے ہیں

انہوں نے خار بچھائے ہیں راہ میں لیکن
ہمارے پاس تو پھر بھی گلاب آتے ہیں

خموشیوں میں ہی صورت ہے بس بھلائی کی
کہ لب کشائی پہ کتنے عذاب آتے ہیں

خزاں رسیدہ فرح آج ہے ہر اک موسم
وہ آنکھ میں لیے غم کی شراب آتے ہیں

عقیل دانش لندن (برطانیہ)

O

سوچ کے ایسے بھنور رہتے ہیں سر میں اکثر
گھر میں ہوتے ہوئے ہوتے نہیں گھر میں اکثر

پھل پہ پتھر تو اُٹھاتے ہو مگر یاد رہے
آشیانے چھپے ہوتے ہیں شجر میں اکثر

کچھ مسافر سرِ منزل بھی بھٹک جاتے ہیں
حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں سفر میں اکثر

دیکھیے کب کسی تعبیر کی صورت نکلے
خواب ہم دیکھتے رہتے ہیں سحر میں اکثر

بھول جاتے ہیں ستمگر یہ حقیقت دانش
آگ لگ جاتی ہے آہوں سے نگر میں اکثر

ظفر اکبر آبادی

O

دوست بھی دشمن ہیں، دنیا کے ستم بھی کم نہیں
میں وہاں ہوں اب جہاں کوئی شریکِ غم نہیں

کیا ہوا ہے دم بہ دم کیوں بڑھ رہے ہیں فاصلے
کیوں نگاہ و دل میں آخر ربط اب باہم نہیں

آتی جاتی ہیں بہاروں اور خزاؤں کی رُتیں
جو نہ ہو تبدیل ایسا تو کوئی موسم نہیں

درمیاں سے ٹوٹتا رہتا ہے اکثر سلسلہ
التفاتِ دوست ہے مجھ پر مگر پیہم نہیں

ہے اگر کچھ دُکھ تو صرف اپنوں کی بے مہری کا ہے
دوسروں کی کج ادائی کا ذرا بھی غم نہیں

دل کو روگ ایسا لگا ہے کچھ نہیں جس کا علاج
زخم وہ کھایا ہے جس کا کوئی بھی مرہم نہیں

لائق تعظیم ہے وہ سر حقیقت میں ظفر
جو کسی ظالم، کسی جابر کے آگے خم نہیں

عذرا نقوی۔ نوئیڈا (انڈیا)

O

ابھی تو پچھلی عنایت کا زخم تازہ ہے
سنا ہے اک نئی سازش کا پھر ارادہ ہے

کدورتوں کے سبق، جھوٹ کے جدید نصاب
نہ جانے کون سی تاریخ کا اعادہ ہے

وہ گھڑ رہے ہیں نئے زہر میں بجھے الفاظ
یہ نفرتوں کی لغت سے ہی استفادہ ہے

یہ کہہ کے لوگوں نے قبلے بدل لیے اپنے
یہی تو مصلحتِ وقت کا تقاضہ ہے

عجیب لہجے میں حق مانگنے لگے ہیں لوگ
کہ احتجاج ہے کم، بے بسی زیادہ ہے

نہ ہو تباہ، یہ صد رنگ مشترک تہذیب
مرے وطن، مری تاریخ کا اثاثہ ہے

کہاں سے لاؤں، سہانی، مدھر، لطیف غزل
مرے مزاج میں اب برہمی زیادہ ہے

معظم سعید

O

لمحہ لمحہ ماتمی ہے آج کل
زندگی کیا زندگی ہے آج کل !

خواب کی تعبیر کوئی کیا لکھے
دھول کاغذ پر جمی ہے آج کل

شورِ دل ہے نے صدائے برگ و بار
پھر یہ کیسی بے کلی ہے آج کل

عالمِ سرگشتگی میں اب ہوا
جانے کس کو ڈھونڈتی ہے آج کل

پربتوں کے درمیاں اک جھیل پر
کتنی تنہا چاندنی ہے آج کل

دو دلوں کی محرمانہ بات بھی
ہر گلی میں ناچتی ہے آج کل

یہ نہ ہو کہ جیتے جی مرجائیں ہم
حد سے بڑھ کر بے حسی ہے آج کل

ڈاکٹر مظہر حامد

O

محفلِ ہستی ہے برہم، بزمِ عالم خوں فشاں
دل پہ جو میرے گزرتی ہے کروں کیسے بیاں

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی قیامت کیا کہیں
منحرف فرشِ زمیں ہے اور دشمن آسماں

چلچلاتی دھوپ سر پہ آبلہ پائی کے ساتھ
دو گھڑی آرام کرلیتے جو ملتا سائباں

اشک آنکھوں سے ہیں جاری لب پہ ہے مُہرِ سکوت
کون جانے میرے سینے میں ہے جو کربِ نہاں

ایک دو کا ذکر کیا سب خوف کے عالم میں ہیں
جان لیوا دہشتوں کی زد میں ہے سارا جہاں

اس زمیں پہ اور کتنا خوں بہے گا اے خدا
ہر طرف طاری ہوا ہے مقتلوں جیسا سماں

نفرتوں کی اس گھٹن میں سانس لیں تو کیسے لیں
ہر طرف پھیلا ہے مظہر کتنا زہریلا دھواں

سید نواب حیدر نقوی

بدلتے موسموں کی شعلہ افشانی سے لغزش سے
ہوئی برباد کشتِ آرزو بے وقت بارش سے

تمہیں آسان بہت ہے لمحۂ عشرت بڑھا دینا
بدل ہی ڈالنا دنیا خمِ ابرو کی جنبش سے

ہُوں زندہ اب تلک کیسے بدن اور روح ہیں زخمی
زمین و آسماں کی چاند اور تاروں کی گردش سے

کریں اب اور کیا قرباں دل و جاں کے سوا یارو!
ہوا ہے خاک جو تھا حسنِ خود آرا کی تابش سے

نہیں ممکن زبانِ بے زباں کو قید کر رکھنا
فلک افلاک تک نالے پہونچ جائیں گے بندش سے

میں رہتا ہوں حصارِ بے کراں میں تیری رحمت کے
بچا ہوں آج تک میں گردشِ دوراں کی سازش سے

لٹے ہیں اپنے ہی ہاتھوں وہ دل کے قافلے راہی
جو نکلے تھے گھروں سے عیش بے پایاں کی خواہش سے

اویس الحسن

آج میری پلکوں پر قدسیوں کا میلہ ہے
عشق! تیری محفل میں دل کہاں اکیلا ہے

تیری یادوں کی حوریں جنتیں سجاتی ہیں
اُن سے آج یہ کہہ دو، زندگی جھمیلا ہے

آئینہ سنورتا ہے اُن کے دیکھے جانے سے
رنگ و نور کہتا ہے، روشنی کا ریلہ ہے

درد دل کو بھاتے ہیں، جانے کیوں لبھاتے ہیں
آنکھوں کے ستاروں کا سجتا روز میلہ ہے

زندگی کی راہوں میں زندگی نہیں ملتی
روز و شب کے میلے میں جانے کیا جھمیلا ہے

عشق کی تمنا تھی عشق کی تمنا ہے
عشق ہی کی راہوں میں خواہشوں کا میلہ ہے

خود شناس کیا ہوگا، دل اگر اُسے ڈھونڈے
وصل کی تمنا میں کس قدر جھمیلا ہے

امین راحت چغتائی

شاخِ مرجاں

نہاں خانۂ دِل میں جب بھی کبھی جھانک کر میں نے دیکھا
وہاں نیلگوں جھیل ایسا سکوں تھا

وہی نیلگوں جھیل جو دیر کے پربتوں میں
ازل سے درختوں کے سایوں میں لپٹی
ابد کے تفکر میں کھوئی ہوئی ہے
(کوئی کہہ رہا ہے کہ سوئی ہوئی ہے)
مگر اس میں پریاں بسیرا کیے، شاخِ مرجاں سے لپٹی ہوئی
لذتِ اضطرابِ مسلسل کی حسرت لیے
یوں سمٹتی چلی جا رہی ہیں
کہ جیسے کوئی بھینچ لے بازوؤں میں
یہ بے نام سی اُلجھنیں وا ہے دور ہوں بھی تو کیسے
یہ حسرت، یہ ارمان نکلیں تو کیسے؟
کہ بس شاخِ مرجاں کے آگے تو کچھ بھی نہیں ہے

ذرا سا اگر آب کی تہہ سے اُبھریں
تو باہر بلند و تناور درختوں کے بازو
اُنھیں اتنے جھولے جھلائیں
کہ ساری فضا جھولتی، جھومتی، سرمدی کیف میں ڈوب جائے

مگر آب کی تہہ سے اُبھریں تو کیسے
کہ سایوں میں لپٹی ہوئی نیلگوں جھیل کا حسن، اُس کا سکوں
چھین کر کوئی کیونکر جیے گا

نہاں خانۂ دل میں جب بھی کبھی جھانک کر میں نے دیکھا
وہاں دیر کے پربتوں میں چھپی جھیل ایسا سکوں تھا

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

دہشت گرد کون ؟

منظر اک آپ کو دکھاتا ہوں دُکھ بھرا واقعہ سناتا ہوں
گو بظاہر ہے ، واقعہ فرضی اور طرزِ بیاں ہے تمثیلی
لیکن اس میں نہاں نصیحت ہے اس کی اِک اک سطر حقیقت ہے
اپنے چہروں کو چادروں میں چھپائے اِک محلّے میں چند ڈاکو آئے
اس سے پہلے کہ مارتے شب خوں اور دکھاتے ستم گری کا جنوں
نیند سے لوگ ہو گئے ہشیار سب نے اپنے اُٹھا لیے ہتھیار
لوگ اپنے گھروں سے باہر آئے ہو لیے ساتھ، ان کے ہمسائے
ڈاکوؤں کے تھے سب تعاقب میں سب کی خواہش تھی جلد انھیں پکڑیں
ڈاکوؤں کے ہوئے خطا اوسان بھاگ نکلے وہ سب بچا کر جان
آگے آگے تھا ڈاکوں کا گروہ پیچھے پیچھے تھا خلق کا انبوہ
ڈاکوؤں کو یہ خوف لاحق تھا یہ ہجوم اب انھیں پکڑ لے گا
جو تعاقب میں لوگ تھے ان کے ان کو وہ ''چور، چور'' کہنے لگے
ایسے عالم میں ، یہ کسے معلوم کون ظالم ہے ؟ کون ہے مظلوم
پل پڑے لوگ لاٹھیاں لے کر اُس محلّے کے رہنے والوں پر
جتنے مظلوم تھے پٹے سارے اور ڈاکو تمام بھاگ گئے
آپ نے واقعہ سُنا سارا اب یہ انصاف سے بتائیں ذرا

ہے حقیقت میں کون دہشت گرد ؟
اور ہے کون ؟ واقعی ہمدرد

کرامت بخاری

ہم کو صحرا کی خاک ہونا ہے

شام غم آ گئی تھی رستے ہیں
راستے راستوں میں الجھے تھے
فاصلے فاصلوں میں پھیلے تھے
کتنی صدیوں سے چل رہا تھا میں
زیست کے بے کنار صحرا میں
ایک مشکل سا موڑ آیا تھا
میں نے سمجھایا تھا اسے لیکن
بات اس کی سمجھ میں آئی نہیں
زندگی خود بھی ہو گئی زخمی
اور مجھ کو بھی کر دیا گھائل
اب ہے جیون جنوں پہ آمادہ
اب گریباں کو چاک ہونا ہے
دشتِ غربت ہے اور غربت میں
ہم کو صحرا کی خاک ہونا ہے

یہ میرے خواب

یہ میرے خواب خریدے ہوئے خود ساختہ خواب
ان سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
یہی شیون کی صدا، جب یہ سرِ شام، سکوں زار سے ٹکراتی ہے
تو یہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
یہ مرے خواب یہ روندی ہوئی راہیں میری
جن پہ ناکام تمناؤں کا بے تاب ہجوم
لمحہ لمحہ کسی جانب نگراں رہتا ہے
کون جانے کہ یہ کس سمت رواں رہتا ہے
یہ مرے خواب خریدے ہوئے خود ساختہ خواب
جن سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے

اویس الحسن

ہوا میں اڑتی تصویر

آج میں کھویا ہوا مصر کے بازاروں میں

ایک مورت کو کھڑا دیکھ رہا تھا چپ چاپ
اپنے ہونے پہ وہ حیران کھڑے ہوں جیسے

یک بیک تیز ہواؤں نے اٹھایا مجھ کو
پاس آئی تھی وہ تصویر بھی جادو بن کر

اور دامن میں چھپائے ہوئے پہنچی تھیں وہاں
خود پہ قابو نہ رہا خود کو سنبھالا نہ گیا

ایستادہ تھے جہاں مصر کے صحراؤں میں
ایک طوفان جو مجھ میں تھا وہیں پر اُترا

دیو ہیکل سبھی اہرام کھڑے تھے جن پر
دل نے سوچا، چلو تصویر سے باتیں کرلوں!

چشم افلاک بھی حیرت سے پھٹی پڑتی تھی
اپنی تقدیر کو قسمت سے حسیں تر کرلوں!

اور مبہوت وہ دیکھے سے ہوئی جاتی تھی
اتنا سوچا تھا کہ دم بھر میں تھا منظر غائب

ایسے عالم میں بہت دور سے سائے کی طرح
اور کھویا ہوا میں مصر کے بازاروں میں

ایک تصویر سی اڑتی وہ چلی آئی تھی
اسی مورت کو کھڑا دیکھ رہا تھا چپ چاپ

تخت بھی اس کا ہواؤں سے تھا باتیں کرتا
یہ یقیں مجھ کو مگر تھا کہ گماں کے اندر

ان گنت پریاں بھی پہلو میں لیے بیٹھی تھی
تھی وہ تصویر بھی اس دل کے جہاں کے اندر

اس کے غمزے سے ہوائیں بھی تھمی جاتی تھیں
پر کھلا راز تھا ہائے ہائے!

کوہساروں کی صدائیں بھی دبی جاتی تھیں
دل تو تصویر کے پردے سے نکلتا ہی نہیں

پھول کھلنے کی تمنا میں مگر مہر بلب
پاس آنے کو مرے آج مچلتا ہی نہیں

شرمساری سے جھکے سر کو لیے بیٹھے تھے
آج میں دل کے بغیر ایسے جئے جاتا ہوں

رنگِ رخسار سے بکھرا تھا وہ ماہِ کامل
کھو کے جینے کا مزا اشک پیئے جاتا ہوں

اور سورج کی نگاہیں بھی جھکی جاتی تھیں
جانے اہرام کے پردوں میں وہ اک راز تھا کیا ؟

مارے حیرت کے تو اہرام بھی تھے گُنگ بہت
اک طلسمی سی صدا دیتا ہوا ساز تھا کیا ؟

نازیہ خلیل عباسی

خوابِ دل کی عجب کہانی تھی

شب جو بہتے تھے اشک پلکوں پر
دل کی تشنہ سی اک کہانی تھی

آج دیکھا جو میں نے آئینہ
سوکھے دریا کی اک نشانی تھی

اک تلاطم بپا تھا سانسوں میں
کشتیٔ دل بھنور میں ڈوبی تھی

جاں تڑپتی رہی تھی ہونٹوں پر
آس بچنے کی رات ٹوٹی تھی

میری سانسیں الجھ رہی تھیں مگر
ساحلوں پر مجھے جو لایا تھا

جس نے غم سے مجھے رہائی دی
میں اسے وہ مجھے بھی بھایا تھا

ایسے عالم میں کیا کہوں، پھر بھی
میرے ہونٹوں پہ ہونٹ اس کے تھے

جان و دل کی پیاس مٹتی تھی
ارغوانی وہ جام جس کے تھے

آنکھ کھل کر بھی کھل نہیں پائی
خواب دیکھا تھا آج نیندوں میں

اپنے وعدوں سے پھر گیا کیسے
جس کی رکھی تھی لاج نیندوں میں

خوابِ دل نے مجھے ستایا کیوں!
رو چکی میں تو پھر رلایا کیوں!

صابر عظیم آبادی

رباعیات

یہ عقل و خرد فہم و فراست اپنی
کیوں مفت میں برباد کی محنت اپنی
بارود کا انبار لگانے والو
پہچان سکے تم نہ حقیقت اپنی

☆☆☆

ہر عیب پہ پردہ جو گرا دیتا ہے
وہ شخص تعصب کو ہوا دیتا ہے
معصوم ہی تو دار پہ چڑھ جاتے ہیں
مجرم کو کہاں کوئی سزا دیتا ہے

☆☆☆

بے فکر کبھی اور کبھی سوچ میں ہے
ہے سوچنے کی بات جبھی سوچ میں ہے
مہتاب پہ مسکن وہ بنائے کہ نہیں
اس دور کا انسان ابھی سوچ میں ہے

☆☆☆

رودادِ وفا کس کو سنائیں لوگو
وہ روٹھا ہے تو کیسے منائیں لوگو
اب تک تو ہمیں فتح ہوئی ہے حاصل
اس جنگ میں ہم ہار نہ جائیں لوگو

☆☆☆

پنڈال سجانے کا کسے شوق نہیں
مہمان بلانے کا کسے شوق نہیں
مجبوریٔ حالات ہے ورنہ صابر
تہوار منانے کا کسے شوق نہیں

☆☆☆

خوشبو کی طرح سارے بکھر جائیں گے
کچھ روز یہاں رہ کے گزر جائیں گے
تخلیق سے پہلے تھے کہاں پوچھو تو
یہ لوگ جو آئے ہیں کدھر جائیں گے

☆☆☆

آپس کی عداوت نہیں اچھی لگتی
اپنوں کی بغاوت نہیں اچھی لگتی
بیٹھی ہے کہاں امن کی دیوی دیکھو
یہ قتل، یہ غارت نہیں اچھی لگتی

☆☆☆

یہ ذہن کے کچے ہیں انھیں کچھ نہ کہو
یہ بات کے سچے ہیں انھیں کچھ نہ کہو
رہتی ہے ہر اک گھر میں انھیں سے رونق
یہ پھول سے بچے ہیں انھیں کچھ نہ کہو

☆☆☆

جو کام ہے مشکل وہی کرنا سیکھو
آفات کے رستوں سے گزرنا سیکھو
گوہر کی طلب تم کو اگر ہے صابر
چڑھتے ہوئے دریا میں اترنا سیکھو

☆☆☆

جو شخص ملا مجھ کو وہ عیار ملا
رنگینیٔ دنیا کا طلب گار ملا
کانٹوں سے محبت نہیں رکھتا کوئی
پھولوں کا جسے دیکھا خریدار ملا

تنویر پھول۔(امریکہ)

قطعاتِ تاریخِ وفات ادا جعفری

کراچی سے برادرم راشد اشرف اور برادرم انور جاوید ہاشمی نیز واشنگٹن سے برادرم اویس جعفری نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ نامور شاعرہ ادا جعفری ۱۲ مارچ ۲۰۱۵ء کو کراچی میں انتقال کر گئیں

تاریخِ ہجری:

''زیبائے غزل، ادا جعفری'' (۱۴۳۶ ہجری)

قطعہ تاریخ عیسوی

گئیں باغِ جنت وہ ، تنویر پھول
سجا جن سے اشعار کا تھا محل
غزل کی ریاست کی رانی تھیں وہ
ادا جعفری، تاج دارِ غزل
(۲۰۱۵ عیسوی)

تاریخ عیسوی:

''مضمونِ سخن، ادا جعفری'' (۲۰۱۵ عیسوی)

قطعہ تاریخ ہجری

غزل کے گلستاں میں غم کا سماں
پرستانِ جنت گئی اِک پری
کہو تم یہ تاریخ ، تنویر پھولؔ!
' مُوشّح سخن با ادا جعفری '

موشح (بمعنی زیور سے آراستہ) ۱۴۳۶ ہجری

سید مابش الوری

قطعات

انگلیاں تو لہو رنگ ہوں گی
کانچ کی کرچیاں چُن رہا ہوں
آنکھ سے خونِ دل تو بہے گا
زیست کے سانحے بُن رہا ہوں

اپنی روایتوں کو ہم خود ہی چھوڑتے ہیں
غبارے خود پھلا کر ہم خود ہی پھوڑتے ہیں
فریاد کس سے کیجیے! انصاف کس سے لیجے!
قانون کے محافظ قانون توڑتے ہیں

جب حبس ہو تو گرم ہوا بھی بھلی لگے
جب لُو چلے تو حبس ہی بہتر دکھائی دے
یارب ! عجیب تر ہیں طلسماتِ خیروشر
وہ آنکھ دے ہمیں کہ حقیقت سُجھائی دے

جس قدر دیکھوں نظر پتھرائے ہے
جتنا سوچوں ذہن چکر کھائے ہے
کوئی رہبر ہے نہ منزل ہے نہ راہ
قافلہ کِس سمت بڑھتا جائے ہے

۱؎ بمعنی زیور سے آراستہ

تبصرہ کتب

نقد و نظر

کتاب : آنچل، آنگن، پھول (ہائیکو اور سین ریو نظمیں)

مصنف/شاعر : امین راحت چغتائی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : گُل ریز پبلی کیشنز۔ ۲۵۸۔ سٹریٹ نمبر۱

علامہ اقبال ایونیو۔ گُل ریز فیز ۵ راولپنڈی

صاحب تصنیف محتاجِ تعارف نہیں کہ متعدد دہائیوں سے خارزارِ ادب و صحافت کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں، جس میں مرزا محمد رفیع سودا کو بھی اپنی برہنہ پائی پر فخر تھا ہر چند کہ اِس نواح میں اُن کا منتہائے سفر بحرِ شاعری کچھ نہ تھا۔ برادرِ مکرم امین راحت چغتائی کا افتخار جہاں ان کے فکر و فن کی کثیر الجہتی ہے وہاں یہ حقیقت بھی قابلِ رشک ہے کہ وہ تواتر کے ساتھ قلم بدست رہے اور انہوں نے قلم بگوش ہونا ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ کیا حالانکہ اُن کا عہد بعض ایسے حضرات پر بھی مشتمل ہے کہ:

"ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے"

انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ گذشتہ اٹھائیس (۲۸) برسوں میں اُن کی جو تخلیقاتِ نظم و نثر منظرِ عام پر آئیں وہ نہ صرف متنوع شعری اضاف پر مشتمل تھیں بلکہ ادبیات کے حوالے سے تحقیق و تنقید کا شاہکار بھی تھیں۔ "قرآن اور نظامِ کائنات" ایسے عمیق و دقیق موضوع پر تفسیری مضامین

کے بعد ان کی گراں مایہ تحقیق ''مغل مکتب مصوری سولہویں صدی عیسوی میں'' محققانہ جانکاہی کا ایسا کارنامہ تھا جسے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ سطح کا مقالہ قرار دے کر ہماری کوئی بھی ملکی دانش گاہ اپنی کلاہِ دانش میں ''پرِ سُرخاب'' بنا کر سجا سکتی تھی۔ بہر حال اِس پس منظر کے ساتھ میرا یہ گمان اب یقین میں بدل چکا ہے کہ ہر نو متعارف شخص چغتائی صاحب کی شخصیت کا عرفان حاصل ہونے کے بعد ایک 'احساسِ زیاں' کا ضرور شکار ہوتا ہوگا کہ اُن سے تعارف کے بغیر جو عمر گزری وہ رایگاں گئی!

سہ حرفی عنوان کے ساتھ سہ سطری جاپانی شاعری پر مشتمل زیرِ نظر مجموعہ فاضل مصنف کی جانب سے راقم الحروف کو بیدل کے درجِ ذیل شعر کے ساتھ موصول ہوا:

کوششِ غواصِ دل صد رنگ گوہری کشد   غوطہ در جیب نفس خوردم جہانے یافتم

مجھ سے غوطہ تو نہیں لگایا جا سکا البتہ خود کو ایک سحر انگیز کیفیت میں غرق محسوس کیا اور ورق گردانی کے دوران جناب چغتائی کے بارے میں اُن مشاہیر کی آراء بھی نظر سے گزریں کہ جن کا 'فرمایا ہوا' ایک ایک لفظ 'مستند' ہوتا ہے مثلاً ڈاکٹر اسلم فرخی فرماتے ہیں:

(الف) ''ان ہائیکو نظموں کا کینوس اپنے اختصار میں کتنی وسعت رکھتا ہے!۔۔۔'' ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے شاعر کو مردِ شریں کلام قرار دیا اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے جناب چغتائی کو درجِ ذیل الفاظ کی میزانِ انتقاد میں رکھ کر فیصلہ دیا کہ:

''شاعری میں حیاتی مضامین امین راحت چغتائی کے گہرے مشاہدے اور تجربے کے غماز ہیں۔''

(ب) ''وہ اردو کے پہلے ہائیکو نگار ہیں جنھوں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے سعدی۔ طالب آملی اور بیدل ایسے عظیم شعراء کی فکر سے بھی ہائیکو کو روشناس کرایا''

(ج) ''امین راحت چغتائی رجحان ساز ہائیکو نگار ہیں ۔۔۔ انھوں نے اردو ہائیکو نگاری کو ایک تہہ دار، زخم سہلانے والا مزاج دیا ہے۔''

اپنے مطالعہ کی روشنی میں مجھے درجِ بالا وقیع و مثبت آراء کی تصدیق کرنے میں ہرگز

کوئی دشواری پیش نہیں آئی بلکہ مجھے ایک واضح تأثر یہ ملا کہ ہمارے شاعر نے کمال حُسن وخوبی کے ساتھ ہائیکو اور سین ریو نظموں کے جاپانی قالب کو تمام تر ہیئتی نزاکتوں اور باریکیوں کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے فارسی و اردو کے موضوعات نظم وغزل کے پس منظر میں کارفرما تہذیبی اور معاشرتی اقدار اور روایات نیز پاکستان کے معاشرتی آثار و احوال کی روح سے آراستہ کیا ہے یہ اُن کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔ یہ کارنامہ انجام دینا ایک ایسے شخص ہی کے لیے ممکن ہو سکتا تھا جسے تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ۔ فکر و فن اور شعری ہیئت و اُسلوب پر قدرت حاصل ہو۔ امین راحت چغتائی نہ صرف اردو فارسی اور انگریزی ادب و شعر کے عالمانہ شعور سے متصف ہیں بلکہ وہ سفارت خانہ جاپان سے بحثیت مشیر برائے ذرائع ابلاغ عامہ ستائیس (۲۷) برسوں پر مشتمل طویل وابستگی کے باعث جاپانی اصناف ادب کے رمز شناس بھی ہیں چنانچہ اُن کی زیر نظر تصنیف اپنے مزاج و آہنگ کے اعتبار سے بین الاقوامی منزلت کی حامل ہے۔ اس میں غالب و اقبال۔ سعدی وغزالی اور طالب آملی و بیدل کے افکار کے علاوہ انگریزی شعر و ادب کی بھی پرچھائیاں نظر آتی ہیں:

اپنے دیگر مجموعہ ہائے کلام کی طرح جناب چغتائی حمدیہ ہائیکو سے آغازِ کلام کرتے ہیں:

جب تُو ہے موجود   تیری نیلی چھتری میں   میں بھی ہوں موجود

وہ تو ایسا نور   ہم اُس کے جلوؤں میں گُم   اُس کو دیکھا کب

دوسری ہائیکو میں خاص طور پر بیدل کے شعر کا حوالہ موجود ہے۔ جبکہ یہ فکرِ غالب کا مرقع بھی ہے اور اصغر گونڈوی کے ایک شعر کا عکسِ جمیل بھی۔

محوِ یار یم و آرزو باقیت   وصلِ ما انتظار را ماند   (بیدل)

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی   (غالب)

خیرگیٔ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں　　اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں　　(اصغر)

فکری تنوع شاعر کے کلام کا اختصاص ہے جس میں مشاہدۂ فطرت اور مناظرِ قدرت کی نظر نواز عکاسی نمایاں ہے۔ چند مثالیں:

بحر کی موجوں میں　　شبنم کے قطرے　　کلیاں پھول بنیں

جب ٹھہراؤ آتا ہے　　باغ میں جا کر دیکھو تو　　اب کیا ہو نیوالا ہے

بحر کی عظمت دیکھ　　ہیرے شاخوں پر　　میرے منہ میں خاک

بارش کے قطرے　　پتوں پر ابتک موجود　　ان میں بیٹھا چاند

تیسری ہائیکو کے شعری اور معنوی پس منظر میں بیدل کا یہ مصرعہ شاعر کے حافظے پر دستک دے رہا ہے یعنی ''بحر با تمکیں بود تا موج ہا استادہ اند''

فطرت کی عکاسی نے جو کیفیت ''بارش کے قطرے'' والے ہائیکو میں پیدا کی ہے لگتا ہے کہ وہ وہ جوش کے شعر کی صورت میں روح بن کر جاپانی ہائیکو کے قالب میں سما گئی ہے۔

ہر ایک کانٹے پہ سُرخ کرنیں کلی کلی میں چراغ روشن
خیال میں مسکرانے والے ترا تبسم کہاں نہیں ہے

اردو اور فارسی شاعری کے اکثر محاسنِ شعری کو جاپان کے شعری سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں جابجا نظر آتی ہے۔ لیکن شاعر کے کمالِ فن کا اعجاز کہ تصنع کا احساس کہیں پیدا نہیں ہوتا مثلاً تشبیہ و تمثیل پر مبنی ہائیکو:

گزرا یہ بھی سال جیسے ہاتھوں سے بہہ جائے ندیا کا پانی

----- ----- -----

سارے میں مہکار جیسے کوئی کھلتا پھول سکھیاں مسکائیں

----- ----- -----

اوّل ہائیکو میں لفظی اور معنوی مماثلت نے درج ذیل اردو کے شعر کو کس قدر قریب کر دیا ہے:

کس طرح سے یہ مہہ و سال گزر جاتے ہیں جیسے بہہ جاتا ہے ہاتھوں سے ندی کا پانی

اسی طرح دوسری ہائیکو جگر مرحوم کے شعر کا مفہوم بنی دکھائی دیتی ہے۔

وہ مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

مزید دیکھا جا سکتا ہے کہ شاعر نے کس طرح اردو شاعری کے موضوعات سے جاپانی صنفِ سخن کے لیے پیرہن تراشی کا کام پوری ہنر مندی سے انجام دیا ہے۔ مثلاً غالب کا مشہور شعر:

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

ہائیکو:

آئینہ رکھ دو سچ تو کڑوا ہوتا ہے ہم سے برہم کیوں

----- ----- -----

میر کا شعر:

نخوت سے ملا جو ہم سے کوئی کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

ہائیکو:

سر پر سب کے پگ
بیٹا گاؤں میں رہتا ہے
طرّہ اونچا رکھ

ہائیکو:

قاصد کیا آتا
وحشت میں ہم لکھ بیٹھے
خط عنقا کے نام

یہاں شاعر کے ذہن میں موجود بیدل کے اس فارسی مصرع کو مذکورہ ہائیکو کی فکری بنیاد بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ: " معلوم شد کہ نام بہ عنقا نوشتہ ایم" تاہم غالب کا درج ذیل شعر بھی ہائیکو کے قالب کو مزید ایک رُخ فراہم کرتا ہے۔

غالبؔ:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

یہی نہیں بلکہ ہمارے وسیع المطالعہ شاعر نے معروف فطرت شناس انگریز شاعر ورڈس ورتھ (Wardsworth) کے افکار سے بھی خوشہ چینی کی ہے جو اپنی مشہور نظم Daffadils (نرگس کے پھول) میں اپنے تصور کے فیضان کو 'نشاطِ تنہائی' کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے:

"They flash up that inward eye which is the bliss of solituude"

اور اب دیکھیے کہ اس خیال کو کس خوبصورتی سے ہائیکو کے پیکر میں جذب کیا گیا ہے:

ہائیکو:

ساز بے آواز
خلوت بھی اک نغمہ ہے
آنکھیں موند کے سن

خواجہ میر حسن کا شعر:

دامن صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

ہائیکو:

دل سا لگتا ہے صحرا اپنی وسعت میں تم بھی کچھ سوچو

اور اب اس سے پہلے کہ ہم 'سین ریو' نظموں کی طرف بڑھیں اور فارسی اور جاپانی شاعری میں لسانی و موضوعاتی متوازیت کے جو جادو چغتائی صاحب نے جگائے ہیں اُن پر بھی اک نظر کرتے چلیں اور یہ بھی دیکھ لیں کہ ہمارے شاعر نے اردو اور فارسی شعری روایات مثلاً تشبیہ و تمثّل اشاریت و رمزیت۔ تلمیحات اور محاکات و استعارات نیز روزمرہ و محاورات کو جاپانی شاعری میں منتقل کر کے ہائیکو اور سین ریو جیسی سہ سطری مختصر ترین اصناف سخن کو لسانی اور تہذیبی اعتبار سے کس قدر مالا مال کر دیا ہے جس کا احساس کاش جاپان کے اہلِ فکر و فن کو ہو سکے۔ صرف چند تمثیلات:

سارے میں مہکار جیسے کوئی کھلتا پھول کیسے کیسے رنگ

جب سے روٹھے ہیں کتنی باتیں ہوتی ہیں تنہائی کے ساتھ

شب بھر رہتی ہے ظلمت کی ہیبت میں بھی تاروں کی جھل مل

ساجن دھیرے بول ان گلیوں میں رہنا ہے دیواروں کے کان

دونوں مہلک ہیں ناشکرے کو سیم و زر گنجے کو ناخن

رادھا ناچ کیا نو من تیل کہاں سے لائیں مورکھ بیٹھ کے سوچ

صاحب کتاب (بقول اقبالؔ: نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب'') سین ریو نظموں کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''جاپان میں سین ریو نظمیں بھی ہائیکو کے ساتھ ہی سترھویں صدی عیسوی میں پروان

چڑھیں۔ ہائیکو کی ابتداء تو گیارہویں صدی عیسوی میں ہو چکی تھی لیکن اسے بطور شاعری آگے بڑھانے والا باشو تھا جو سترہویں صدی عیسوی کا شاعر ہے۔ اس عہد میں سات سات صوتی ارکان پر مشتمل نظم کہی جاتی تھی جسے جاپانی میں۔ ''میکو'' (Maeku) کہتے ہیں۔ اس کی ابتداء میں پانچ۔ سات پانچ کے ہائیکو ایسے صوتی ارکان میں ایک مزاحیہ بند لگا دیا جاتا تھا جو بعد میں ''سین ریو'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔''

مزید فرماتے ہیں:

''سین ریو نظموں پر اک دورِ ابتلا بھی آیا جس میں اِس صنفِ سخن کو فحش گوئی کے لیے استعمال کیا گیا لیکن کچھ عرصے بعد اس میں اعتدال آ گیا۔ اب اس میں خفیف سے طنزیہ و مزاحیہ مضامیں باندھے جاتے ہیں مگر طنز کا میلان زیادہ ہے''

برادرِ محترم چغتائی صاحب کے لیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ 'راحت کی امانت' سے فیضیاب و متمتع رکھے اُن کی ''سین ریو'' نظموں سے مذکورہ محاسنِ شعری پر مشتمل چند اشعار پیش کرنے کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں:

ابّا سنتے ہو امی کو گھر لے آؤ ہم تو بچے ہیں

بجلی کا بل ہے بابا سہمے ہیں عینک مت دینا

ایسا کرتے ہیں پہلے تم روٹھو کچھ دیر پھر میں روٹھوں گا

ایسی بھی کیا بات جس کو بھی کرنا ہو فون دفتر آ جائے

بس سے اُترا ہے بچہ بوڑھا لگتا ہے اُف! بستہ کا بوجھ

چولیں ہلتی ہیں جب بھی کوئی ہوتا ہے بوڑھا پہلی بار

''پہلی بار'' کا کوئی جواب ہے؟

کتاب : شام شعر یاراں

مصنف : مشتاق احمد یوسفی

مبصر : ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

ناشر : جہانگیر بکس، کراچی

''شام شعر یاراں'' مشتاق احمد یوسفی کی تازہ کتاب ہے جس میں ماضی قریب و بعید بلکہ بعید ہی بعید میں لکھے گئے ۲۱ مضامین کو مرتب و مدون کر کے آرٹس کونسل کراچی نے تبرکات جانتے ہوئے مصنف کی خواہش کے بغیر ساتویں علمی اردو کانفرنس منعقدہ ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۴ء کے موقع پر مرتبین و مدونین کے دیباچے یا پیش لفظ یا عرض مصنف کے بغیر شائع کر دیا ہے، یہ شذرہ ہائے فکر مختلف شخصیات، کتابوں کی تقریب رونمائی یا اداروں کے سالانہ یوم تاسیس پر دیے گئے خطبات پر مشتمل ہیں۔ عنوان یار عزیز فیض کی اس نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔

''اے مہ شب نگاراں۔۔ اے رفیق دل فگاراں۔۔ اے شام مہرباں ہو۔۔ اے شام مہرباں ہو۔۔ اے شام مہرباں ہو۔۔۔ اے شام شہر یاراں۔۔ ہم پہ مہرباں ہو'' (فیض احمد فیض)

ان خطبات میں یوسفی صاحب کی لفظ شناسی، لفظ بافی و لفظ گری کا فن عروج پر ہے۔ لفظوں سے کھیلنے کا فن، انھیں برتنے کا سلیقہ، پھر مترادفات کی موجودگی میں جملے میں اسی لفظ کا استعمال جو مفہوم کو زیادہ واضح زیادہ بامعنی بنا دے، مناسب موقع پر مناسب لفظ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ مصنف کا ذخیرۂ الفاظ لامحدود ہے، اس کا سبب ان کا وہ مشغلہ ہے کہ جس سے شعوری کنارہ کشی ہمارے عوام ہی نہیں عالم، دانشور اور بڑے بڑے لکھاری کیے ہوئے ہیں۔ کتنے لکھاری ہیں جو لفظ کی اہمیت سے آگاہ ہیں، برتے اور قدیم بلکہ متروک لفظ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی اپنی تحریر میں برتے گئے عمومی الفاظ سے۔

نظیر، انیس، جوش لفظوں کے برتاوے اور وسیع لغت کے استعمال کے سبب اپنی واضح شناخت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں احسان دانش کا نام بھی شامل کر لیجیے۔ احسان دانش کی 'جہانِ دانش' پڑھتے ہوئے اس بات کا خیال بار بار آتا ہے کہ ہم غیر ملکی زبان کے الفاظ اتنی تیزی اور روانی سے اردو میں سموتے چلے جاتے ہیں کہ بسا اوقات دورانِ گفتگو کئی جملوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بات اردو زبان میں ہو رہی ہے۔ ہم اپنی مقامی، علاقائی یا مادری زبان کے الفاظ بے کم و کاست استعمال کرتے ہوئے گھبراتے ہیں، شرمندہ ہوتے ہیں یا انھیں قابلِ اعتنا نہیں جانتے۔ 'جہانِ دانش' میں دسیوں، بیسیوں نہیں سیکڑوں الفاظ ایسے مل جاتے ہیں جو دورانِ تحریر مصنف کی ذہنی کیفیت اور ماحول کی عکاسی یوں کرتے ہیں کہ ان کی جگہ کوئی اور لفظ برتا ہی نہ جا سکتا تھا، اتنی خوبصورتی سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہی نہ جا سکتا تھا۔ پھر احسان دانش کا قارئین اور اردو زبان پر یہ احسان کہ پاورقی میں ان اجنبی الفاظ کے معنی بھی رقم کر دیتے ہیں کہ جانتے ہیں سہل پسند قاری لغت میں ان کے معنی بھی تلاش نہ کرے گا اور خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لے گا کہ اس دیہاتی لفظ کے معنی کہاں ہوں گے لغت میں۔ مشتاق احمد یوسفی کی مذکورہ کتاب ''شام یاراں'' میں بار بار لغت سے استفادے کا ذکر ملتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں آدمی سرہانے تلے، شعری مجموعے، افسانے یا ابن صفی کے ناول دھر کر یہ مشکل، صبر آزما وقت کاٹتا ہے یا بیکار وقت کو کار آمد بناتا ہے، یوسفی صاحب عالم طفلی سے ہی لغت گزیدہ رہے۔ اس کتاب میں بار بار مصنف کا لغت کی طرف جھکاؤ، لغت سے استفادے کا ذکر قاری کو غیر محسوس طریقے سے لغت کی طرف مائل کرتا ہے۔ وہ اس امر سے آگاہ ہیں کہ ہمارا ذخیرۂ الفاظ ذخائر آب و برق کی مانند بہت تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم نئے الفاظ استعمال کرنے یا انھیں لغت میں سے تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ابھی احسان دانش کا ذکر ہوا۔ انھوں نے ''مترادفاتِ اردو'' نامی لغت میں جس محنت و جاں کاہی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے آج کے محققین اور مصنفین اتنا وقت کہاں سے لائیں!

یوسفی صاحب قدیم اور متروک الفاظ کے استعمال میں زبان سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے

ہیں اور انھیں از سر نو زندہ کرنے کی کوشش اور خواہش رکھتے ہیں، ''سیتا پھل'' کا تذکرہ قدیم ہندی ادب اور مذہب میں موجود ہے۔ قاری سوچتا ہے یہ سیتا پھل نہ جانے کن زمانوں کا، کن علاقوں کا کس موسم اور کس آب و ہوا کا پھل ہے۔ راج کماریوں کا پسندیدہ ہے یا راجکمار بھی اس سے شغف رکھتے ہیں لیکن جب یوسفی صاحب اس پھل کا تعارف اور تعریف کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذاتِ شریف ''شریفہ'' کی ہے جو اپنی مٹھاس کے لیے مرغوب اور بیجوں کی کثرت کے لیے معتوب ہے۔ یہ وہی شریف ہے، جس کے متعلق یوسفی صاحب ''زرگذشت'' میں فرما چکے ہیں۔ ''آم، سپاگٹی، شریفے اور خستہ پیٹیز کھانے کا مہذب طریقہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔''

بہت سے الفاظ و تراکیب خود بھی وضع کرتے ہیں۔

غنا بالجبر، زنبوری بھنجاؤ، الاسٹک دور لیے۔۔ ایسے الفاظ کی بھی کمی نہیں جو صرف یوسفی صاحب سے ہی مخصوص ہیں، سموچا، طلاقت، طربوش، ازدیاد، بے ہنگی، مشموش، ہیاؤ کھلنا، مچیٹا، بکراہند، محک، حذافت۔۔ پھر وہ الفاظ جو غلط العام اور غلط العوام ہونے کی بنا پر عوام اور علماء میں رائج ہیں۔ خاص طور پر جن کا غلط تلفظ زبان زدِ عام ہے، یوسفی صاحب انھیں اعراب سے سجا سنوار کر قاری کی خاموشی سے تصحیح کرتے ہیں۔ یوسفی صاحب بات سے بات نکالنے کے تو ماہر ہیں ہی لیکن لفظ سے لفظ نکالنا بھی انھیں خوب آتا ہے۔ یوسفی صاحب تکرارِ لفظی و تکرار حرفی سے اپنی بات میں شدت، اصرار اور تیقن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔

''قائداعظم فوجداری عدالت میں''۔۔۔ یوسفی صاحب خان بہادر اختر عادل، قائداعظم کے مخالف وکیل کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔''۔۔۔ بہت خوش خو، خوش خلق، خوش لباس، خوش خوراک، شریف النفس اور بہت موٹے تھے اور خود سے بھی زیادہ موٹے تین بیٹوں کے باپ تھے۔''

فارسی سے لاتعلقی کا غلغلہ اپنی جگہ، اس زبان سے ناواقفیت کی بنا پر ندامت کا اظہار بار بار لیکن یوسفی صاحب کی تحریر اس امر کی نفی کرتی ہے۔ کہ تحریر میں فارسی الفاظ و تراکیب واشعار کے تڑکے کی چھنچھناہٹ اور مہک قاری کو اس زبان سے ناواقفیت کے باوجود مزا دے جاتی ہے۔ پھر ہندی الفاظ کا خوبصورت استعمال، ان خطابیہ مضامین میں جا بجا ہوا ہے۔

''یہ وہ محنت ہے جس میں خالی پتا مارنے کی بجائے اپنی پت (عزت نفس) اور پندار ارپن (بھینٹ چڑھانا) کرنا پڑتا ہے۔''

''ہنسی کی دو سے زیادہ قسمیں ہیں سات سے زیادہ سُر، ان گنت استھائی اور بے انت انترے ہوتے ہیں۔ موقع محل، روزِ ابر و شبِ ماہتاب کی قید نہیں۔ ہنسنے والا بات بے بات ہنسے جاتا ہے، پھر جب دنیا کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے تو نہ ہنسی آتی ہے نہ رونا، بس چپ سی لگ جاتی ہے پھر بھوگی، سوگی اور گن گا ئیک آپی آپ جوگی اور دھیانی گیانی کا برن لے کے پتھر سمان اور شانت ہو جاتے ہیں، شانتی شانتی شانتی۔۔۔''

پیروڈی، تحریف نگاری ہمارے طنز و مزاح نگاروں کا ایک اہم ہتھیار ہے کہ مزاح تو پھر بھی برداشت کرلیا جاتا ہے طنز کے تیر سہنے کی تاب ہر کسی میں نہیں، مرزا صاحب سے کہلا دیتے ہیں۔ یوسفی صاحب ''خاکم بدہن'' کے دیباچے میں کہہ چکے ہیں ''طنز ایک مقدس جھنجھلاہٹ کا اظہار بن چکا ہے۔'' یوسفی صاحب مضحک نقالی سے طنز نگاری یوں کرتے ہیں کہ قاری بھی کچھ اپنی نگاہوں کے سامنے ہوتا دیکھتا ہے

پیروڈی یا مضحک نقالی یا ہجو یہ تقلید یا تقلیدِ معکوس یا لفظی تبدیلی سے مضحکہ خیز صورتِ احوال پیدا کرنے کے لیے تحریف نگار کا اپنا مطالعہ وسیع ہونا چاہیے وہیں قاری بھی اپنی کلاسیکی و جدید شاعری سے شدھ بدھ رکھتا ہو تبھی وہ لطف اٹھا سکتا ہے۔ اگر وہ سنجیدہ اصل سے واقف نہیں تو وہ مزاحیہ نقل سے کیسے لطف اٹھا سکے گا۔ یوسفی صاحب زبان زد عام مصرعوں اور اشعار کی تحریف سے موضوع کی وضاحت کرتے اور مسکراہٹیں بکھرتے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ ان کی تحریف نگاری منفی انداز و اثرات نہیں رکھتی۔

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں   خان بہت شرمندہ ہیں
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا   بات پہنچی ہے حکمرانی تک
یہ عالم سوگ کا دیکھا نہ جائے   مزاح مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقریریں

وہ اپنی ذات کو بھی نہیں بخشتے۔ جتنا خوبصورت اپنا کیری کچر بناتے ہیں اتنا شاید کسی اور کا نہیں۔ تفنن طبع کا مرکز اپنی ذات ہو تو زیادہ کھل کھیلتے ہیں۔ اپنی بیماری کا تذکرہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ خود انھیں تو اپنی بیماری سے پیار ہے ہی قاری بھی اس سے الفت کے تقاضے نبھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خیر و عافیت کی جگہ قبر و عاقبت پیش نظر ہے۔ طبیب و مطب سامنے ہے۔

بدل کر مریضوں کا ہم بھیس غالب   تماشائے اہل مطب دیکھتے ہیں

جدید و کلاسیکی شعرا سے محبت اس امر سے ہویدا ہے کہ ان کے اشعار نوک قلم سے اپنے موضوع کی بہتر تفہیم کے لیے رقم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اشعار کا انبار نہیں لگاتے لیکن برمحل استعمال سے اپنے خیال کی ترسیل میں مدد لیتے ہیں۔ قوتِ متخیلہ حساس ہے، بیان کی صلاحیت خدا داد ہے، عمدہ اور برجستہ اور چست فقرے قدم قدم : امن تھامتے ہیں۔

''شام شعر یاراں'' میں ادبی نشستوں کی رو داد اور ان یارانِ باصفا کا احوال کہ جن کے دم سے زندگی اور جن کی یادوں سے دل شاد و آباد ہیں۔ ماضی پرستی، ناسٹلجیا، گم نگر کا جادو، بیتے زمانوں کی گلیاں، درخت، بندر، مور کی اداس جھنکار پپیہے کی برہا میں ڈوبی پی کہاں کی آواز، ٹیٹری کی پکار، کوئلوں کی کوک، کالی بھونرا جامنیں، پھول والوں کی سیر، مندروں کے جھمکڑے، لال بنات کے انگر کھے، نیگڈ مبر کے ہاتھی، مغلئی دستر خوان کی نیرنگیاں، نوروزی پوشاک، دنیا سے نرالے بانکے، جہاں آباد کے تابوت کی آخری کیل ۔۔ غرض یادیں ہی یادیں باتیں ہی باتیں، انتظار حسین کو کہیں سے پڑھ لو، گئے زمانوں کی اداسی ان کی تحریر کو ایسی اثر انگیزی عطا کرتی ہے کہ قاری خود کو اسی اجڑتے بستے دیار کا باسی سمجھنے لگتا ہے۔ یادنگاری معلوم ہوتا ہے، انتظار حسین پر ختم ہوگئی لیکن ''شامِ شعر یاراں'' کا مطالعہ کیا جائے تو انتظار حسین کی دلی، اے حمید و ناصر کاظمی کا امرت سر حتیٰ کہ غالب کا کلکتہ 'اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے'۔۔ یوسفی صاحب کے کوچۂ ماضی گیراں پشاور کو بھی ان میں شامل کر لیجیے۔ حتیٰ کہ پی آئی بی کالونی کراچی کا بے آب و برق دو کمروں کا مکان بھی

ان کی یادوں کی دنیا کو یوں جگمگاتا اور مہکاتا رہتا ہے کہ وہاں ادریس فاطمہ کے ذہن و دل سے پھوٹنے والی کرنیں اور خوشبو آج بھی ان کے مشام جاں کو منور اور معطر رکھتی ہیں اور پھر ساحل کنارے وہ پُر آسائش، بھرا پُرا گھر جہاں زندگی کے بہت سے سال آسودہ حالی میں ادریس فاطمہ اور بچوں کی محبتوں میں سرشار گزرے اور پھر ایک شام ڈھلے گھر آنگن سُونا ہو جائے۔

''شام شہریاراں'' کی قدر و قیمت بے حد و حساب، اس کا گزرتا ایک ایک پل ساعتِ نایاب ہے۔ وقت جب ریت کی مانند مٹھی سے برق رفتاری سے پھسلتا جائے، شام پر رات کے سائے تیزی سے لپکنے لگیں، عناصر میں اعتدال کی خواہش بے معنی معلوم ہونے لگے۔ ایسے میں شام شہریاراں یا شعریاراں یا ان کی یادیں اور باتیں ہی زیست کرنے کا بہانہ بن جاتی ہیں۔ ''شامِ شعریاراں'' عمر گذشتہ کی وہ کتاب جس کے لوٹانے کی حسرت، ان کے دل میں ہے یہ یاروں کو یاد کرنے کی ان سے اپنے تعلق کی، زندگی میں ان کی اہمیت کی، ان کی جانب سے ملنے والی محبت کی بارش میں بھیگنے کی داستان ہے، کتاب کا بیت الغزل، یوسفی صاحب کی زندگی کا ایک اہم باب، وہ آخری پانچ سات صفحات ہیں، جن میں ادریس فاطمہ کے بچھڑنے کا دکھ 'تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں۔ جان بہت شرمندہ ہیں، تو اس شرمندگی میں اداسی، تنہائی اکلاپا، بے بسی، بے چارگی و بیماری اور سب سے بڑھ کر زندگی کی شامِ غریباں کا نوحہ شامل ہے۔

''شام شعریاراں'' میں اداروں اور شخصیات پر ۲۱ مضامین یا تقاریر یا خطبات ہیں جب فرد تقریر کر رہا ہو یا مضمون یا مقالہ پڑھ رہا ہو یا خطبہ دے رہا ہو تو بہت سی باتیں فی البدیہہ بھی درمیان آجاتی ہیں۔ وہی مضمون جب اشاعت پذیر ہوتا ہے تو تحریر میں منتشر خیالی کا احساس ہوتا ہے، اس صورت میں جب کہ مصنف کی منشا کے بغیر ان مضامین کو یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہو۔ مختلف موقعوں، یا تقریبات میں پڑھے گئے مضامین میں کئی باتوں یا واقعات یا اشعار کی تکرار بھی دکھائی دے جاتی ہے، پھر قاری کی نظر سے بہت سی وہ باتیں بھی گزرتی ہیں جو وہ گذشتہ کتابوں میں پڑھ چکا ہے۔ جملہ ہائے معترضہ کا وافر استعمال، ''شام شعریاراں'' کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

کسی بھی تحریر کا مطالعہ کیجیے، ٹھٹھک کر سوچنا پڑتا ہے پلٹ کر دیکھنا پڑتا ہے کہ اصل موضوع کیا ہے اور کون ہے۔ یہ جملہ ہائے معترضہ بسا اوقات ایک سے زائد پیراگرافوں پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔

''شام شعر یاراں'' کے مختلف النوع موضوعات کے عنوانات دیکھیے۔

قائداعظم فوجداری عدالت میں، کیس ہسٹری، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے، انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹکچر، کلاہ ممریزی، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، نیرنگِ فرنگ، مہر دو نیم، چادر، چاندنی بی اور کالم بھر چاندنی، یادِ یارِ طرحدار، آم، رہو اور بچھو، سدِ سمندری، ضمیر واحد متبسم، مسندِ صدارت پر اولتی کی ٹپاٹپ، شاہ جی کی کہانی دوسرے شاہ جی کی زبانی، الطاف گوہر اور گڑ کی ڈلی، یہاں کچھ پھول رکھے ہیں، میں اختتام ہوں اک عہد کے فسانے کا، پلکوں سے پینٹ کرنے والا مصور او قصہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں تک۔

''شام شعر یاراں'' میں اقوالِ زریں خود یوسفی صاحب کے ہوں یا ان کے ہمزاد صاحب کے، کہ جو بات اپنے خلاف یا سماج کے یا اب ممدوح کے سامنے کہنے کی جرأت نہ رکھتے ہوں، مرزا صاحب سے کہلا دیتے ہیں، پھر ان اقوال سے بھی اپنا مافی الضمیر واضح کرتے ہیں جو مشرقی و مغربی مفکرین نے غالباً یوسفی صاحب کے لیے ہی سنہرے حروف میں لکھے تھے۔

''سمجھدار آدمی نظر ہمیشہ نیچی اور نیت خراب رکھتا ہے۔''

''جس مریض کو اپنے ذکر میں مزہ آنے لگے اسے Hypochondriac کہتے ہیں۔ افراد ہی نہیں کبھی کبھی قومیں بھی Hypochondriac ہو جاتی ہیں انھیں علاج سے زیادہ اپنی بیماریوں کے مبالغہ آمیز بیان میں مزہ آنے لگتا ہے۔''

یوسفی صاحب مثبت اندازِ فکر و نظر رکھتے ہیں اور یہی خوبی وہ اپنی قوم میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ چینی کہاوت نقل کرتے ہیں:

''زندگی میں اداسیاں تمھارے سروں پر منڈلاتی رہیں گی، ان کو اپنے بالوں میں گھونسلا نہ بنانے دو۔''

اسی مثبت اندازِ زیست نے انھیں زیست کرنے کے سب آداب از ۔کروادیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی آمد سے ان کی تحریر کی تمام فضا نکھر جاتی ہے ورنہ اس معاشرے میں ان لوگوں کی کمی نہیں جن کے کمرے میں قدم دھرتے ہی ایک لفظ کہے سنے بغیر ہی ان کے جسم ۔ سے ایسی منفی شعائیں منعکس ہوتی ہیں کہ آپ خود کو مروّت و برداشت کی آخری حد پر کھڑا ہوا ُسوس کرتے ہیں۔ایک بینکار،فنِ تعمیرات،فن مصوری،فن رقص اور گائیکی اور تہذیب وثقافت ۔ ہ اتنے اسرار و رموز اور باریکیاں کیسے جانتا ہے۔زبان وشعر وادب کے بدلتے رجحانات، تہذیب وثقافت کی بدلتی روایات، اقدار واخلاق کے زوال کی داستان ایک فردِ واحد کے ذہن کی دسترس میں کیسے ہو سکتی ہیں، اس کا جواب صرف ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے۔ ''ذہن رسا'' سرسری تم جہان سے گزرے ۔۔ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا' یوسفی صاحب کی زندگی کا ایک لمحہ بھی رائیگاں نہیں، عصر موجود کی بوالعجبیوں اور نیرنگیوں کو، سیاسی سماجی اخلاقی، معاشرتی تہذیبی، تعلیمی پستی اور گراوٹ سے پیدا شدہ بدحالی، انتشار، بے یقینی، رشوت ستانی، بے روزگاری، اقربا پروری، افراتفری، تشکیک و تذبذب کو گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان ناگفتہ بہ حالات، زندگی کی کج رویوں اور خامیوں سے گریز ان کے عقیدے میں شامل نہیں، یہی زندگی ہے اور تلخ، ترش، شیریں لہجے میں ان کا بیان انھیں اردو ادب کی تاریخ میں یادگار بناتا ہے۔

حرفِ آخر یہ کہ ''شام شعر یاراں'' کا موازنہ ومقابلہ یوسفی صاحب کی گزشتہ کتابوں سے نہ کیا جائے کہ وہ کتب یوسفی صاحب نے اپنی مرضی سے اپنے تحریری وتخلیقی اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے لکھی تھیں، ایک ایک لفظ اور فقرے کو کئی کئی مرتبہ آنکا اور جانچا تھا۔لکھنے کے بعد مہینوں تک اسے کاغذوں کے انبار میں دفنا دیا تھا، پھر نظرثانی میں، بہت کچھ کتر بیونت کی نذر رہا۔بے داغ تکمیلیت کی عادت نے کٹوتی زیادہ کی، بڑھایا کم کم۔اور پھر جو شکل نظر آئی ۔۔ اور اسی سبب یوسفی، یوسفی قرار پائے بلکہ ایک دوران سے منسوب ہوا۔'مباش منکر غالب کہ در زمانہ ٔست ۔۔۔'

کتاب : صبا اکبر آبادی

مصنف : مامون ایمن

مبصر : ولی عالم شاہین

صبا اکبر آبادی (ولادت ۱۹۰۸ء آگرہ۔ وفات اسلام آباد) کا شمار پاکستان کے ان نامور شعراء میں ہوتا ہے جن کے ہاں قادر الکلامی کے ساتھ زبان و بیان کی خوبصورتی، لہجے کی سادگی، خیال کی پاکیزگی، متخیلہ کی دلکشی اور کلاسیکی شعر و ادب کے رچاؤ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری میں ہندی اسلامی تہذیب کی قدروں کے ایسے امتیازات ملتے ہیں جو اس ماحول میں بسر کی ہوئی بھرپور زندگی کا واضح اشاریہ ہیں۔

صبا اکبر آبادی نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزل گوئی بڑے مرتبے کی حامل ہے۔ عمر خیام اور غالب کی رباعیوں کے ترجمے نے انہیں رباعی گو کی حیثیت سے ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ مرثیہ کو حق آگاہی حق پسندی اور حق نمائی کی تمثیل کے طور پر پیش کرنے کی بنا پر انہوں نے جدید مرثیہ نگاری میں اپنے لیے ایک الگ راہ متعین کی ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں (۱) کہ "صرف گریہ میرے مرثیوں کا مقصد اور ماحصل تھا اور نہ ہو سکے گا۔ جدید مرثیہ کو بدلتی ہوئی پیچیدہ زندگی کے مسائل کا جواب امام حسینؓ کی عظیم قربانی کی روشنی میں ہونا چاہیے اور جدید مرثیہ سے میری مراد یہی تصور ہے۔" نعت گوئی اور تضمین نگاری میں بھی ان کے ہاں تازہ کاری ملتی ہے۔

شاعر کا تعارف اس کی شاعری ہوتی ہے اور اس کی زندگی بھی شاعری سے شروع ہو کر شاعری پر ہی ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ صبا اکبر آبادی کی شاعری ان کی تراسی سالہ زندگی کا ماحصل ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے ہمہ صفت، باکمال شاعر کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے۔ پروفیسر مامون ایمن کی کتاب "صبا اکبر آبادی ایک ہمہ جہت شاعر" ایک مثبت کڑی ہے جو اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگی۔

پروفیسر مامون ایمن شمالی امریکہ میں اڑتالیس برس سے مقیم ہیں۔ ان کی اردو خدمات کی بنا پر انہیں ''بابائے اردو'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، نیز ان کے نام کے سابقہ کے طور پر انہیں ''علامہ'' اور ''استاذ'' جیسے خطابات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ وہ خود عمدہ شاعر تو ہیں ہی، ان کا اختصاص یہ بھی ہے کہ وہ باقاعدگی سے رباعی کہتے ہیں بلکہ اس صنف میں انہوں نے بقول خود ''وہ مجرد اسلوب چنا ہے جس کی نظیر اردو ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی'' (''میری ساڑھے بارہ سو رباعیات مرکب اضافی، مرکب عطفی، جزوی قوافی اور تقابلِ ردیفین سے یکسر مبرا ہیں۔ زبان کے حوالے سے یہ اہتمام ناممکن تو نہیں، انتہائی مشکل ضرور ہے'') ڈاکٹر کیول دھیر کے رسالے ''ادیب انٹرنیشنل'' کے پہلے شمارے میں (۲) جہاں سے یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں آگے چل کر پروفیسر مامون ایمن بجا فرماتے ہیں کہ ''میرا نام نیویارک شہر کی ادبی تاریخ کا پہلا باب ہے، بحمد اللہ'' درس و تدریس، شعر گوئی، اور نقد و نظر کے معاملات میں مامون ایمن کی خدمات کا دائرۂ کار خاصا وسیع ہے۔۔ بقولِ حفیظ جالندھری: ''نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں''۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان میں شعری محاکمہ کرنے کی جملہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ کتاب کے ابتدائی دو صفحات میں پروفیسر مامون ایمن نے ''عرضداشت'' کے عنوان کے تحت کچھ اپنی باتیں لکھی ہیں۔ اگلی تحریر صبا اکبرآبادی کے بڑے صاحبزادے جناب سلطان جمیل نسیم کی ہے جن کا شمار جدید ہم عصر اردو ادب کے ممتاز افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ''حضرت مامون ایمن۔ ایک عالم شاعر'' کے عنوان سے صاحب کتاب کا تعارف قلمبند کیا ہے۔ ایک وضاحت طلب امر یہ ہے کہ اس کتاب میں درج پندرہ صفحات پر محیط صبا اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی میں کئی برس پہلے ان کی مرثیوں کی کتاب ''دوام'' (۱) میں پڑھ چکا تھا۔ پتا نہیں یہ جناب ایمن کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے یا ''دوام'' کے مرتب تاجدار عادل کی کاوش کا۔ بہر نوع، اس کی افادیت مسلّم ہے۔

غزل کا جائزہ تین حصوں میں مجموعی طور پر ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا بڑا حصہ

(۷ اصفحات) خیام و غالب کی فارسی رباعیات کا اردو رباعیات میں ترجمے سے تعلق رکھتا ہے۔ بقیہ اوراق صبا اکبر آبادی کی نعت نگاری، مذہبی رباعیات، مرثیہ گوئی، تضمین نگاری، اور ملی نظموں کا احاطہ کرتے ہیں۔

مامون ایمن فن عروض کے ماہر ہیں جس کا انہوں نے جگہ جگہ ثبوت بھی دیا ہے۔ انہوں نے صبا اکبر آبادی کے اشعار کے اوزان کی نشاندہی کرنے کے بعد ہر شعر کی تقطیع بھی کی ہے جو ہم جیسے علم عروض سے نابلد شخص کے لیے رہنمائی کا کام سرانجام دے گی (مجھے تو بحروں کے نام پڑھنے میں بھی دقت ہوتی ہے)۔ انہوں نے علم عروض کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صبا صاحب کے اشعار میں فن عروض پر ان کی پوری دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔ آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صبا صاحب کی غزل میں زبان، بیان اور فن مربوط نظر آتے ہیں۔ نیز یہ ارتباط امتیاز کا مظہر ہے۔ صبا صاحب کی تضمین نگاری کے ضمن میں ایمن صاحب نے غالب کی ایک غزل پر صبا صاحب کی تضمین کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ غزل عروضیوں کا بھی نام پوچھتی ہے (آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے / طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے)، نیز یہ کہ صبا صاحب نے اس بحر میں بھی اپنی عروضی صناعی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بحر جس کی تقطیع یوں ہے "مفتعلن فاعلات مفتعلن فع"۔ بحر کا نام ہے منسرح مثمن مطوی منحور۔ ایمن کہتے ہیں "یہ بحر نہایت مشکل ہے اس لیے مروج نہیں۔"

صبا اکبر آبادی کی نعت نگاری کے سلسلے میں ایمن صاحب شاعر کے انفرادی محاسن کے تحت ان کے جذب، احساس، اور خلاص کو ان کے اسلوب نعت گوئی کے انسلاکی شواہد قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ باشعور اور مکمل جذبۂ خود سپردگی کے باعث صبا صاحب کی قرابتِ عشقِ رسولؐ برملا و برحق اظہار اور ابلاغ کے وسیلوں سے فیضیاب نظر آتی ہے۔ ایک نعت میں بحر رمل کے استعمال کے بارے میں ایمن رقم طراز ہیں کہ اس بحر کا طنطنہ درحقیقت نقارہ کی آواز ہے، نیز یہ کہ یہ آواز نظم کا کرّ و فر صیقل کرتی ہے۔ اس نعت کے دو شعر درج ہیں جن میں سے ایک یوں ہے:

منزل مقصود طیبہ ہے صبا کیوں چلیں وہ راہ جو کاواک ہو

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ 'کاواک' (کھوکھلی چیز) کے استعمال کا اہتمام برجستہ ہے (۳)۔ میرے خیال میں یہاں ان سے سہو ہوا ہے۔ 'کاواک' کے دو اور معانی بھی ہیں، خالی اور بے مغز۔ چونکہ شعر میں لفظ 'راہ' موجود ہے اس لیے موزوں اور مناسب مفہوم کھوکھلی چیز کے بجائے خالی یا سنسان راستہ قرین قیاس ہے۔ ضمناً یہ عرض کردوں کہ میں نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے ایک ممتاز پروفیسر ڈاکٹر سید انوار احمد کی زبانی یہ سنا تھا کہ فردوسی نے "شاہنامہ" میں نقارے کی آواز کی پیکر سازی ایک شعر میں جو بحر رمل میں نہیں، یوں کی ہے۔

زنقارہ آواز آید بروں — کہ دون است دون است دنیائے دوں

کہیں کہیں یہ احتمال سا گزرتا ہے کہ بحر اور وزن کی تکرار اور پیچیدگیوں کے تذکرے میں شعر کا اصل حسن او جھل ہو گیا ہے۔ غالباً علامہ شبلی نعمانی نے لکھا تھا کہ ماہر نباتات پھول کا مشاہدہ کرتا ہے اور کاٹ چھانٹ کرتے ہوئے پتیوں کی بناوٹ اور رگوں کو دیکھتا ہے اس کے برعکس شاعر یوں گویا ہوتا ہے "اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری"۔ میرے نزدیک ادب کا نقاد اگر ماہر نباتات بن جائے تو نتیجہ معنی خیز نہیں رہتا۔

رباعیات کے ترجمے کے سلسلے میں مامون ایمن نے بہ تفصیل وضاحت کی ہے کہ صبا صاحب کی شخصیت جذباتی طور پر ان دونوں حضرات یعنی خیام اور غالب سے منسوب ہے۔ وہ ان کی شخصیات میں اپنی شخصیت کے نقوش، اپنی زندگی کے شب و روز دیکھتے ہیں۔ یوں وہ اپنی ذات کی وضاحت کرتے ہیں، اپنے معاشرہ اور ماحول کا مطالعہ کرتے ہیں اور تناظر کی میزان پر جذب و فکر (کو) تولتے ہیں۔

عمر خیام کی ایک مشہور رباعی:

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما — کاے رند خراباتی دیوانۂ ما

برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمے — زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

اس رباعی کا ترجمہ صبا اکبر آبادی نے یوں کیا ہے:

اک صبح کو میخانے سے آئی یہ ندا اے رندِ خرابات مرے سن تو ذرا

اٹھ جلد کہ پیمانے کو مے سے بھر لیں اس سے پہلے کہ پُر ہو پیالہ اپنا

اب ہم خیام کی اسی رباعی کے کئی اور ترجمے "خمکدۂ خیام" (۴) کے حوالے سے تقابلی مطالعے کی خاطر درج کیے دیتے ہیں:

آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے اے رندِ شراب خوار دیوانے سے

اٹھ جلد بھریں شراب سے ساغر ہم کمبخت چھلک جائے نہ پیمانے سے

(آغا شاعر قزلباش دہلوی)

میخانے سے آئی یہ دمِ صبح ندا اے رندِ خرابات، ہمارے شیدا

اٹھ جام کو تیرے مے سے کر دیں لبریز قبل اس کے کہ پیمانہ ہو لبریز اپنا (صفی لکھنوی)

کل صبح خرابات سے آئی یہ ندا اٹھ جاگ صراحی مئے خنداں کو اٹھا

کب ٹوٹ کے ہو جاتا ہے، ریزہ ریزہ پیمانۂ ہستی کا نہیں کوئی پتا (عبدالحمید عدم)

"خمکدۂ خیام (۴) کے مرتب سید فیضان حسن نے اپنے مقدمے میں خیام کی اس رباعی کے دو اور ترجمے قوی امروہوی اور راجہ مکھن لال کے شامل کیے ہیں۔ ایسے تقابلی مطالعوں سے ہی کسی شعری کاوش بالخصوص ترجمے کا صحیح معنوں میں جائزہ لیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی طرح حسنِ خیال اور حسنِ بیان کو نمایاں کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ایمن صاحب نے اپنی کتاب میں تقابلی مطالعے کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ ایمن صاحب نے صبا صاحب کے ترجمے کے ضمن میں خیام کی محض ایک اور رباعی دی ہے جس کے نیچے مسرور الٰہی خاں کا ناقص اردو ترجمہ درج کیا ہے لیکن اس کے ساتھ صبا صاحب کا بھی اسی رباعی کا ترجمہ ہوتا تو پرکھ میں آسانی ہوتی۔ اصل بات تو صبا صاحب کی تھی۔

ایک بات اور۔ رباعی مشکل ترین صنف قرار دی گئی ہے۔ اس کے چوبیس اوزان مقرر

ہیں۔کم رباعی گو ایسے ہیں جنھوں نے ان سارے اوزان میں رباعیاں کہی ہوں۔ غالب، انیس، دبیر، شاد عظیم آبادی، جگت موہن لال رواں، حالی، جوش، فراق، امجد حیدر آبادی، یگانہ، ناوک حمزہ پوری، شمس الرحمٰن فاروقی، محسن ملیح آبادی، اور کئی دوسروں کے اس سلسلے میں نام لیے جا سکتے ہیں۔ان میں سے کسی نے بھی میرے محدود علم کی حد تک رباعی کے سارے اوزان استعمال نہیں کیے ہیں۔حال میں ایک کتاب رفیع الدین راز کی آئی ہے۔(۵) جس میں رباعی کے سلسلے کے اس التزام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ایمن صاحب نے جہاں غزل کے اشعار کے اوزان جا بجا دیے ہیں اور ان کی تقطیع بھی کی ہے وہاں رباعیات کے چوبیس اوزان میں سے کسی ایک کا بھی تعین نہیں کیا ہے، بلکہ اوزان اور تقطیع سرے سے غائب ہیں۔وہ علم عروض کے ماہر ہیں اس لیے رباعی کے اوزان کی مشکلات کے پیش نظر اس توقع کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

''صبا اکبر آبادی ایک ہمہ جہت شاعر'' ایک ایسی کتاب ہے جس میں بیسویں صدی کے ایک اہم اردو شاعر کی شعر گوئی کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ شامل ہے، نیز شاعر کی شخصیت اور اس کے مجموعی کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے عصری تناظر میں متعلقہ شاعری کی تفہیم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

کتابیات

(۱) ''دوام'' مرثیے، مرتب: تاجدار عادل [۲۰۰۲]۔''دستِ دعا بولنے لگے'' کے عنوان کے تحت کم و بیش ۳۰ صفحات کی تاجدار عادل کی تحریر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

(۲) ''ادیب انٹرنیشنل'' لدھیانہ، شمارہ اول۔ مدیر: ڈاکٹر کیول دھیر۔ [۲۰۱۱] سوالنامے کے جواب میں از مامون ایمن

(۳) ''صبا اکبر آبادی: ایک ہمہ جہت شاعر''۔از مامون ایمن۔ص ۶۶ [۲۰۱۱]

(۴) ''خمکدۂ خیام''۔ترجمہ منتخب رباعیات عمر خیام، از افسر الشعرا آغا شاعر قزلباس دہلوی، مرتب: سید فیضان حسن۔اشاعتِ ثانی [۱۹۹۸ء]

(۵) ''سازِ آواز'' از رفیع الدین راز [۲۰۱۰]

مراسلات

"اللہ کے نام سے شروع جو رحمٰن و رحیم بھی ہے"
۳۶ ہجری ۱۴

"نازک طبع، منصور عاقل صاحب، مدیر الاقربا"
۳۶ ہجری ۱۴

"چشمِ ناز، تحیاتِ مسنون"
۳۶ ہجری ۱۴

"لطف و عنایت، سہ ماہی الاقربا موصول ہوا"
۳۶ ہجری ۱۴

"سیاست گزیدہ ادب و ثقافت دل افروز اداریہ"
۱۵ عیسوی ۲۰

"سیاست گزیدہ، خوب خوب لکھا ہے"
۳۶ ہجری ۱۴

"میرا مقالہ عقدۂ تاریخ گوئی نمایاں"
۱۵ عیسوی ۲۰

"اور سرِ چہرۂ فہرست چھپا"
۳۶ ہجری ۱۴

"آپ کا بہت بہت بے لاگ شکریہ"
۳۶ ہجری ۱۴

"بدایوں کا منفرد شاعر شاد، از پروفیسر زاہد، پر اثر نایاب"
۱۵ عیسوی ۲۰

"ڈاکٹر مظہر کا مقالہ اچھا پایا ہے"
۱۵ عیسوی ۲۰

"محترم محمد فیصل مقبول عجز کا مقالہ، فائق"
۱۵ عیسوی ۲۰

"انہونی" اور "درخت کی کیلیں" مکمل افسانے"
۱۵ عیسوی ۲۰

"مکرمی تنویر پھول کی حمد دل فروز"
۳۶ ہجری ۱۴

○

مساعیٔ انتخاب علی کمال
۳۶ ہجری ۱۴

شاہ نشیں، پچپن اے زمان آباد، لانڈھی چار، کراچی

تاریخ کارگزاری: سولہ مارچ

محمد طارق غازی، ایسٹ یارک (ٹورانٹو)، کینیڈا

سلام ورحمت الاقرباء کا ہر شمارہ بصد شوق دیکھتا ہوں ہر تحریر، نثر ہو کہ نظم، 'کرشمہ دامن دل می کشد' پڑھتا ہوں، لطف لیتا ہوں، پھر پڑھتا ہوں، سبق لیتا ہوں پھر پڑھتا ہوں اور آپ کو داد دیتا ہوں، پھر آپ پر رشک کرتا ہوں اور پھر خود اپنے رشک کو داد دیتا ہوں از اول تا آخر علم و تحقیق، افکار وادب کے اتنے بہت سے خزانے جمع کرنا کچھ آسان نہیں ضرور ہمزاد آپ کے تابع ہے وہ حضرت میرے ہاتھ لگ جائیں تو ہر تحریر پر تأثرات لکھوں، لکھنے والوں کو ان کے افکار و دانش کی اور ادب کی قوت اظہار کی داد دوں مگر پڑھنے سے فرصت نہیں ملتی کاش دن میں تیس بتیس گھنٹے یا کچھ زیادہ ہوا کرتے بس اسی لیے میں مریخ وغیرہ پر جانے سے دلچسپی نہیں رکھتا کہ وہاں کا دن بھی ارضی دن کے برابر ہی ہے تو جانے کا کیا فائدہ زحل سے دلچسپی یوں نہیں کہ وہاں الاقربا کے اگلے شمارہ کے لیے سات سال انتظار کرنا پڑے گا تو بس یہ زمین ہی ٹھیک ہے جیسی بھی ہے، ہے تو اپنی۔

اردو رسم الخط کے موضع پر ڈاکٹر خلیل طوق اَر کے مقالہ پر میں کچھ لکھنا چاہتا تھا، بروقت نہ لکھ سکا یہ مقالہ ذہن کشا ہے ڈاکٹر طوق اَر نے آئینہ سامنے رکھ دیا ہماری لسانی شکل اتنی بری نہیں ہے رسم الخط کا مسئلہ ویسا آسان نہیں جیسا کہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے زبان سیکھنا آسان ہو جائے گا ڈاکٹر طوق اَر نے چین جاپان کی مثالوں سے ثابت کر دیا کہ، مشکل کچھ نہیں میں ڈاکٹر طوق اَر سے اتفاق کرتا ہوں اردو رسم الخط کی تبدیلی ہمیں اپنی تہذیب و ثقافت سے محروم کر دے گی زبان جسم پر جلد ہوتی ہے، قمیض نہیں آدمی جلد نہیں بدلتا انہوں نے ترکی زبان کی مثال دی کہ عربی یا عثمانی رسم الخط میں ذخیرہ ہونے والی علمی میراث سے ترک قوم محروم ہو گئی اور سو سال بعد بھی اس سرمایہ کو نئی نسلوں تک پہنچانے کے عمل میں حسب دلخواہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ اردو کا معاملہ اس سے مختلف نہیں۔ اسلامی علوم کے اصل ماخذ تو عربی میں ہیں اور ثانوی تشریح ذرائع عربی کے علاوہ فارسی میں بھی ہیں لیکن تقریباً تین صدیوں میں اردو میں علوم اسلامی کا جو ثانوی ذخیرہ یکجا ہوا ہے وہ بے مثال ہے تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کی فروعات و ذیلیات اور تاریخ و تہذیب پر جتنا اب تک کام

اردو میں ہوا ہے وہ کمیت میں کسی اور زبان سے برتر ہو یا کمتر کیفیت میں بہت بلند ہے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے آج تک کوئی نسل نہیں گزری جس میں کسی نہ کسی عالم نے نئی تفسیر، صحاح ستہ کی نئی شرح، اصول و جزئیات فقہ پر نئی تحقیق، برصغیر اور باقی دنیا کی اسلامی تاریخ پر کوئی تالیف شائع نہ کی ہو درسی یا حوالہ کی کتاب نہ سہی، ناول ہی لکھ دیا ہو قابل ذکر بات یہ ہے کہ تین سو برس میں ملت کی علمی میراث میں غیر معمولی اضافہ ہوا رسم الخط بدلا تو یہ سب محض کاغذوں کا ڈھیر رہ جائے گا۔

ایک قابل توجہ سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں جو ترک، ایرانی اور عرب آئے تھے انہوں نے سیدھی ہندی زبان کیوں نہ اختیار کرلی۔ یہ اردو زبان بنانے کی زحمت کیوں اٹھائی؟ سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ سندھ اور چناب اور راوی اور گنگا اور جمنا میں دامن نچوڑنے کے لیے نہیں آئے تھے ان نو واردوں کو اس خطہ کی تہذیب اور علوم میں اضافہ کرنے کا شوق اس دھرتی پر لایا تھا اور اس کار خیر کے لیے ایک ایسی زبان درکار تھی جو مقامی بھاشاؤں کے برعکس ترک، فارسی اور عربی اصوات پر بھی قدرت رکھتی ہو۔ اس دور اندیشی کے ثمرات سامنے ہیں دوسری طرف آج یورپ اور امریکہ کا مسلمان یہاں کی تہذیب و آداب میں غرق ہو رہا ہے اور اس کی ثقافت ہی نہیں زبان و ادب پر بھی مقامی مذہبی آثار کی چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسے ابھی تک اس تہذیب میں مادری لسانی اور مادری علمی اضافہ کرنے کا وہ خیال نہیں آیا جس نے ایک ہزار برس تک برصغیر کی سیاست پر بھی گہرا اثر ڈالا تھا اور اب بھی خود شناسی کا جوہر آبدار ہو جائے تو دنیا میں بہت کرنے کے قابل ہے

اس باب میں جو نقصان ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس درد کو ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں زیادہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں اردو کا انحطاط بہت سوچا سمجھا تھا اور اس کے اسباب بھی کچھ ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ پاکستان کی حد تک اس رویہ کا جواز نا قابل فہم ہے ہندوستان میں اب صورت حال یہ ہے کہ اردو اخبارات زبان و بیان میں ہندی کے غیر تربیت یافتہ اسلوب سے متاثر ہیں اور سوائے رسم الخط کے ان میں وہ زبان استعمال نہیں ہو رہی ہے جس میں عوامی سطح پر ابوالکلام

آزاد تو خیر، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، شبلی نعمانی، عبدالمجید سالک، ظفر علی خان، حامد الانصاری غازی کی تحریروں کو بخوبی سمجھا جا سکے یا زبان کا لطف ہی لیا جا سکے۔ مرزا غالب اور شیخ ابراہیم ذوق ہی کیا اب داغ دہلوی بھی سمجھ میں نہیں آتے تلفظ کے اس مسئلہ پر ڈاکٹر طوق اَر نے بھی بات کی ہے نصف صدی پہلے اپنے بزرگ دوست ظ۔ انصاری سے میں نے کہا تھا کہ زبان اتنا سہل مت بناؤ کہ آنے والی نسلیں گونگی ہو جائیں اس وقت میں نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ پچاس برس بعد ہندوستان اور پاکستان میں نام تو اردو ہی کا ہوگا مگر وہ دو مختلف زبانیں ہوں گی الحمدللہ ابھی وہ نوبت نہیں آئی کچھ عرصہ بعد آ جائے تو حیرت بھی نہ ہوگی تلفظ اور اس کے ساتھ بیان کی درگت کے پیش نظر میں اکثر کہتا ہوں کہ بالخصوص شمالی ہندوستان کے ہندی داں مسلمان ہندی میں ثانوی اسلامی علوم کو منتقل کرنے بلکہ ان موضوعات پر راست تحریروں پر توجہ دیں اور اس زبان کا کینڈا ابھی درست کریں یہ ایک الگ فغان درویش ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزوں اور ان کے دیسی وکلاء کے پیدا کردہ لسانی (اور تہذیبی) احساس کمتری کا جنون آزادی کے بعد بھی کم نہیں ہوا بلکہ لگتا ہے جیسے پاکستان میں بڑھا ہے علاقائی زبانوں پر ضرورت سے زیادہ اصرار نے بھی ملی اور لسانی یکجہتی کے برخلاف اقدام اور تہذیبی پیش رفت کو متاثر کیا ہے اور اسی لیے اس نظریہ کو فروغ بھی دیا جاتا ہے علاقائی زبانوں کی نفی مقصود نہیں ہے اقبال اپنے گھر میں اور بے تکلف دوستوں سے پنجابی ہی میں بات کرتے تھے مگر شاعری پنجابی میں نہیں کی کیونکہ ان کے قارئین و سامعین صرف اہل پنجاب نہیں تھے پھر بیرون ہند لوگوں کی خاطر انہوں نے فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا یہ معمولی بات نہیں ہے کہ اردو کے واسطہ سے پشاور بخارا اور ابادان سے استنبول تک ایک ہی گھر کا آنگن بن جاتا ہے یہ دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے' افعال میں ہندوی اور اسماء میں افغان، ایرانی، تاجک، ترکستانی، عراقی، شامی، مصری اور ترک، یہ اردو زبان ذرا سی انفرادی توجہ سے تقریباً سارے عالم اسلام میں جزوی طور پر قابل فہم یا قابل مطالعہ بن جاتی ہے بن سکی ہے نعرہ نہ سہی، سرگوشی تو بنے گی ویسے بھی محبت نعروں میں نہیں سرگوشیوں ہی میں ہوتی ہے۔

میں ذاتی بات کرتا ہوں فقط اردو اور فارسی جاننے کی وجہ سے مجھے عربی اور کسی درجہ میں ترکی زبانوں کا فہم پیدا ہو گیا جب کہ رومن رسم الخط کی بناء پر ترکی زبان کو سمجھنے میں نسبتاً دقت پیش آئی اگرچہ میں اچھی خاصی انگریزی جانتا ہوں مسئلہ وہی تلفظ کا پیش آتا ہے اردو کے پس منظر کی وجہ سے میں نے (quzel) کو توچاکی کے بجائے چاقی پڑھ لیا کیونکہ اردو میں چاقو کا لفظ بڑے طمطراق سے مستعمل ہے اور کاٹ ہو جائے تو ناچاقی بھی بولی اور برتی جاتی ہے لیکن (quzel) بہ معنی حسین کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہوا کہ نشہ حسن کے عنوان سے یہ (گ) سے بانداز گزک بولا جائے گا یا اس کا تعلق غزل کے خاندان سے ہے عثمانی رسم الخط میں یہ مشکل پیش نہ آتی۔

تلفظ ایک اہم مسئلہ ہے کچھ پچاس پچپن برس پہلے اردو رسم الخط کی حمایت میں عصمت چغتائی نے بھیونڈی مہاراشٹر، کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اردو دنیا کی واحد زبان ہے۔ جس میں ہر صوت کے لیے ایک مجرد یا مرکب حرف پایا جاتا ہے واقعی اور کوئی زبان اتنی خوش بخت نہیں ہے میں نے اکثر سوچا ہے کہ یہاں کینیڈا میں میری آئندہ نسلیں باذوق ہوئیں تو اپنا خاندانی نام تبدیل کر لیں گی ورنہ (گازی) کہلانے پر راضی ہو جائیں گی لہجہ کی دشواریوں کے علاوہ بھی ان ملکوں کی زبان بہت سی آوازیں ادا کرنے کے قابل نہیں ہے ان خطوں کے مستقبل کو بھی ایک مغربی اردو کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت اردو والے بہتر طور پر پوری کر سکتے ہیں کہ صرف انہی کو زبان سازی کا یہ ہنر آتا ہے۔

میں کسی زبان کا دشمن ہوں نہ مخالف ہر زبان اچھی اور خوبصورت ہوتی ہے کیونکہ وہ بہر حال انسانوں کو باہم قریب لاتی ہے مگر مجھے اپنی زبان اور اپنی زبانوں سے زیادہ پیار ہے مجھے دنیا کے سارے بچے اچھے لگتے ہیں مگر اپنے بچوں پر زیادہ پیار آتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اردو کی ترویج اساتذہ کا حق ہے چوتھی جماعت میں تھا تب سے اپنے استادوں کو یہی کرتے دیکھا حکومتوں کا تعلق کسی درجہ میں ہنگامی عوامی مفادات سے ہو سکتا ہے۔ مگر ان کو تہذیب وثقافت، علم وافکار کے ہجے معنی نہیں آتے ان سے کچھ مدد مل جائے تو سبحان اللہ، باقی

تہذیبی کام مختلف سطح پر ہی ہوتا ہے الاقرباء کے اداریوں میں آپ اس سمت توجہ دلاتے رہے ہیں۔ صحرا میں اس صدا کو بازگشت کی گونج بنانا لازم ہے۔ مدرسوں کے بوریہ نشین ذکر خفی کی صورت بلا ارادہ یہ کام کر رہے ہیں خاص طور سے ہندوستان میں سکولوں، کالجوں یونیورسٹیوں میں ایسے کام کرنے کے لیے بہت سے خادم علی ہاشمی درکار ہیں مجھے یقین ہے وہ موجود ہیں انہیں ڈھونڈنا اور ان سے کام لینا کچھ مشکل بھی نہیں زندہ قومیں ایسے کام شوقیہ بھی کرتی ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا نے ۲ مارچ ۲۰۱۵ء کے شمارہ میں بین الاقوامی رسالہ نیورو سائنس لیٹرس کے حوالہ سے یہ دلچسپ اطلاع دی ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے سینٹر فور بائیو میڈیکل ریسرچ کے اُتم کمار صاحب نے طبی تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ اردو زبان ذہانت میں اضافہ، دماغی عدم توازن اور نسیان کو درست کرنے میں نہایت مفید ہے کیونکہ اس کی تعلیم اور اس کے حروف کی شکلوں اور اصوات کا جاننا اور ان کا استعمال دماغ کے سامنے والے حصہ کو متحرک کرتا ہے جو یادداشت اور معرفت کا مرکز ہوتا ہے اس خبر کا سب سے اہم مگر محذوف نکتہ یہ ہے کہ اسی لکھنؤ کے راج سنگھاسن پر بیٹھ کر پنڈت سمپورنانند نے آزادی کے فوراً بعد اردو کا قتل فرمایا تھا، مگر ان کو خبر نہ تھی اس زبان کا لاشہ بھی ان کی اپنی زندگی سے زیادہ توانا ثابت ہوگا لکھنؤ یونیورسٹی کے اتم کمار صاحب نے یہ بھی بتایا وہ حیدر آباد کے نظام انسٹی ٹیوٹ آف سائینسز کی ایک تازہ تحقیق کے مطابق دو زبانیں جاننے والے لوگ رعشہ اور نسیان کے امراض سے محفوظ رہتے ہیں تو جیسا میں عرض کر چکا ہوں، اردو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اردو کے ساتھ بیک وقت عربی، فارسی، ترکی زبانوں کا جزوی علم بھی رکھتے ہیں چنانچہ فقط ایک زبان کے توسط سے یہ کثیر لسانی علم دماغی صحت کو برقرار رکھنے اور ذہانت میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے۔ سبحان اللہ اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ اردو کے تعلق سے احساس کمتری کسی ذہنی کیفیت کا غماز ہے اکتوبر/دسمبر کے اداریہ میں آپ نے اسلام آباد کانفرنس اور کراچی کانفرنس کے دوران جن مقررین کی ہرزہ سرائیوں کی گرفت کی ہے ان کی خدمت میں اگر یہ خبر پیش کر دی جائے تو شائد آئینہ کا کام دے۔

اس ضمن میں آصف الرحمٰن طارق صاحب کے افسانہ کا ذکر کروں گا جولائی/ستمبر ۲۰۱۴ء کے شمارہ میں ان کا افسانہ 'اکیلا آدمی' ان کی روایت کے مطابق بہت اچھا ہے۔ متذکرہ بالا طبی تحقیق کی روشنی میں بات یوں بنتی ہے و چونکہ وہ اردو کے محاوروں اور متروک روزمرہ کے ماہر ہیں اور انہیں دوبارہ زندہ کر رہے ہیں اس لیے طبی عنوان سے بھی ان کے افسانوں کی تاثیر بڑھ جاتی ہے یعنی زبان کے درست استعمال کی وجہ سے ان کی تحریر راست دماغ کے سامنے والے حصہ کو متحرک کرتی ہے اور یوں اس کی افادیت محض لفظوں سے لذت کوشی تک محدود نہیں رہتی بلکہ نظام فکر کو ایک سمت اور مقصد دیتی ہے اس جہت سے آصف الرحمٰن طارق صاحب کے فن تحریر کا مطالعہ اردو ادب میں تحقیق کا نیا باب بن سکتا ہے بننا چاہیے آصف الرحمٰن طارق صاحب کا یہ افسانہ 'اکیلا آدمی' بیک وقت دو لہروں میں بہتا ہے انفرادی اور اجتماعی انفرادی لہر سطح بیان پر نفسیاتی زیر و بم کی تصویر بناتی ہے اجتماعی لہر تہہ دریا میں روپوش ہے اور وہی اس کا افسانہ کا بیانیہ ہے جو بے قابو بہاؤ میں وقت کی زیر آب چٹانوں سے سر ٹکراتا ہے اور اار . . دردعیاں نہیں ہوتا موضوع نیا نہیں ہے یہ وہی عشق و زندگی ورقابت کے پرانے مثلث کا قصہ ہے مگر اس کا بیان نفسیاتی گرہ کو کستا چلا جاتا ہے اس افسانہ کے اختتام پر گیلی ہتھیلی سے خشک آنکھوں تک کا فاصلہ بس بالشت بھر ہے یہ افسانہ پڑھ کر یہاں کینڈا کا ایک حالیہ واقعہ مجھے یاد آ گیا بڑے شوق اور چاؤ کی شادی کے بعد اولاد سے گودیں خالی رہیں مگر جب امیگریشن کے سارے معاملات بہ حسن و خوبی طے ہو گئے تو ایک دن بے خوف 'لڑکی' نے شوہر اور اس کے والدین کے سامنے اعلان کر دیا کہ شادی سے پہلے وہ پاکستان میں کسی اور لڑکے سے محبت کرتی تھی اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے اب وہ معصوم سیدھا سادہ لڑکا دوسری شادی کے سوال پر اندیشوں اور عدم تحفظ کا شکار ہے تنہا راتوں میں اس کے چہرہ پر ہاتھ پھیر کر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

اسی شمارہ میں اویس جعفری صاحب کا منظوم ترجمہ سورہ فاتحہ وجد آور ہے حصہ غزلیات میں پرتو روہیلہ، محشر زیدی، عقیل دانش، سید قاسم جلال کرامت بخاری صاحبان کے کئی اشعار سوچنے پر

مجبور کرتے ہیں حساس شاعر تو غزل کے ایک شاعر میں کوئی عمرانی کلیہ یا حقیقت نظم کر دیتا ہے اور اس کی داد پر بات ختم ہو جاتی ہے حالانکہ معاشرہ میں بات وہاں سے شروع ہونی چاہیئے۔

بظاہر چپ ہے کالی رات لیکن سکوت شب میں گویائی بہت ہے
کرامت بخاری

ہیں عقل کی چٹکی میں آثار قیامت کے بس دیر ہے لمحوں کی نامہ ہوا چاہیے
خود بانٹنے والا تھا جو نور بصیرت کا وہ طائر لاہوتی جگنو کا دیا چاہیے
(محشر زیدی)

کھیل تو یہ ہے کٹ مریں پیدل شاہ بیٹھا رہے حفاظت میں
(پرتو روہیلہ)

ثمر ہوں شاخوں پر رشتہ مگر زمیں سے نہ ہو جہاں میں ایسا تو کوئی شجر نہیں ہوتا
ہو جس جس کے مقدر میں، ایسی بستی میں کسی محل میں بھی دیکھو تو در نہیں ہوتا
(عقیل دانش)

متاع علم و ادب میرا اصل ورثہ ہے یہ بات کوئی کہے میرے جانشینوں سے
(سید قاسم جلال)

اکتوبر/دسمبر ۲۰۱۴ء کے شمارہ میں ماریشس کے حوالہ سے اردو کے ایک اور افق کا تعارف ہوا 'ڈاکلین' اچھا افسانہ ہے اور سلیقہ سے لکھا گیا ہے۔ کہ اس کے مصنف کوئی رحمت علی صاحب ہیں اس کی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا اس کے بین السطور میں گھریلو 'نوکرانی' سے زیادہ تہذیب عصر پر تبصرہ ہے جہاں میاں بیوی دونوں کو کسی دفتر، دکان، فیکٹری میں 'نوکر' اور 'نوکرانی' بننے کا شوق ہے یا مجبوری اس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ موریشس جیسا ایک چھوٹا سا خاموش جزیرہ بھی اب تہذیب جدید کی لپیٹ میں ہے موریشس میں اردو پر سمیرا حمید کا مختصر مضمون اس افسانہ کے فہم میں مددگار رہا۔

سید انتخاب علی کمال صاحب فن تاریخ گوئی کے ماہر کی حیثیت سے اس عصر کی نہایت اہم

شخصیت ہیں ان کا تازہ مضمون اس فن شریف کی تاریخ کا اجمالی احاطہ کرتا ہے اور بہت وقیع ہے اس میں ایک جگہ سہو کتابت ہوا ہے صفحہ ۱۹ پر کنوز التواریخ کے مصنف کا نام راجا گردھاری پرشاد حرف (گ) پر پیش سے دیا گیا ہے یہ نام گرو سے نہیں بنا، بلکہ (گ) پر زیر ہے اور اس کا تلفظ گِردھاری ہے سنسکرت اور ہندی میں (گر یا گری یا گیری) پہاڑی کو کہا جاتا ہے اور گردھاری کرشن جی کا لقب ہے جس کے معنی ہیں پہاڑ کو اٹھانے والا، ہندو دیومالا رامائن میں دراصل یہ کام ہنومان نے کیا تھا لنکا پر چڑھائی کے دوران لکشمن زخمی اور بے ہوش ہو گئے تو رام جی نے ہنومان سے کہا کہ لکشمن کو ہوش میں لانے کے لیے فلاں پہاڑی سے ایک بوٹی توڑ کر لاؤ ہنومان گئے مگر بوٹی کی پہچان نہ ہوئی تو پورا پہاڑ اٹھا کر لنکا لے آئے کرشن جی رامائن کے بجائے داستان مہابھارت کا کردار ہیں میرے ہندی کے استاد مرحوم محسن علی برہانپور والا صاحب کہا کرتے تھے کہ دیومالا میں تو ہنومان گردھاری ہیں مگر بولا جاتا ہے کرشن جی کے لیے کیوں کا جواب انہوں نے دیا نہ مجھے معلوم ہے۔

باقی غم ذات کی بات بس اتنی ہے کہ ایک مضمون قوم عاد کی تاریخ و تہذیب پر حاضر ہے یہ قدیم و معدوم تہذیبوں پر زیر قلم ایک کتاب کا حصہ ہے اس کے علاوہ ایک نظم بانداز غزل اور ایک غزل حاضر ہے۔

بیرسٹر سلیم قریشی۔لندن (برطانیہ)

اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۴ء کا الاقربا نظر نواز ہوا۔سرِ ورق پر پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین کی تصویر اور شمارہ میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر مضامین نے اِس شمارہ کو یادگار ڈاکٹر معز الدین نمبر بنا دیا ہے۔مضمون نگار خواتین و حضرات نے اُن کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں طور پر اُجاگر کیا ہے۔میری موصوف سے پہلی ملاقات لندن ہی میں غالباً ۱۹۶۰ کی دہائی میں ہوئی تھی جب وہ یہاں پوسٹ ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے لیے تشریف لائے تھے اُن دنوں وہ میرے کزن ڈاکٹر ستار اور اُن کے دوست ڈاکٹر فاروقی کے فنبری پارک (Finbury Park) میں ہمسایہ تھے۔ان سے قریبی

ملاقاتیں اَسّی کی دہائی میں ہوتی رہیں جب وہ کیمبرج میں اقبال چیئر پر فائز تھے۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں میں نے لنکنز اِن میں جناح سوسائیٹی کی طرف سے قائداعظم کی زندگی پر ایک یادگار جلسہ کے انعقاد کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سے خاصی رہنمائی حاصل کی۔ الاقرباء کا موجودہ شمارہ ڈاکٹر صاحب کی الاقرباء اور اس کے صدر نشین سے قربت کا شاہد ہے۔

''سیاست گزیدہ ادب و ثقافت'' کے زیر عنوان آپ کا اداریہ ادب، ثقافت اور اردو کی نمائندگی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں آپ نے ادب کے نام پر سیاست اور ذاتی شہرت کے دلدادہ عناصر کو بے نقاب کیا ہے۔ ذیلی اداریہ میں ''شرمناک ذہنی افلاس اور قومی بے حمیتی'' کے زیر عنوان آپ نے الحمرا آرٹ کونسل کے کارپردازوں کے شرمناک ذہنی افلاس اور قومی و دینی بے حمیتی کا بروقت نوٹس لیا اور اِن کی بے حمیتی کا پردہ چاک کیا ہے۔ علامہ اقبال نے مجسمہ سازی کو صنعتِ آذری کہا تھا کہ وہ مذہب تھا اقوامِ عہد کہن کا۔ الحمرا آرٹ کونسل کے کارپرداز صنعتِ آذری کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ براہمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔

اس دفعہ کا شمارہ بھی حسب سابق ضخیم ہے اُمید ہے کہ دوسرا شمارہ آنے تک تمام مضامین کا احاطہ کر سکوں گا جو مضامین میں نے پڑھے ہیں اُن میں ''عہدِ حاضر میں مسدّس حالی کی اہمیت'' اور ''کلامِ داغ میں حمد و نعت و منقبت'' اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ابتر تھی (پہلے سے بھی ابتر چلی آ رہی تھی) مسدّس میں حالی نے قوم کے سوئے ہوئے افراد کو خوب جھنجوڑا اس کے بعد علامہ اقبال نے اس مشن کو آگے بڑھایا اس طرح قوم میں بیداری کی لہر آئی کہ قائداعظم کی آواز پر پوری قوم ایک پلیٹ فارم پر مجتمع ہوگئی۔ قیام پاکستان کے بعد قوم پھر اسی حالت میں ہے۔ جس کا رونا مولانا الطاف حسین حالی نے رویا تھا۔ آج بھی اُن کی قدسی روح حضورؐ سے عرض کر رہی ہوگی:

اے خاصۂ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

کلامِ داغ میں حمد و نعت و منقبت میں جناب محمد فیصل مقبول عجز نے داغ کے اُس مذہبی

عقیدت کے گوشے کو اُجاگر کیا ہے جو عام لوگوں سے پوشیدہ ہے۔ حمدیہ غزل کا ایک شعر:

تری بندہ نوازی ہفت کشور بخش دیتی ہے جو تُو میرا، جہاں میرا، عرب میرا، عجم میرا

حُضور سے عقیدت کا اظہار:

الٰہی نقش ہو کلمہ رسولؐ اللہ کا دل پر چلے کونین میں نامِ محمدؐ سے درم میرا

تاریخ کے گوشے میں جناب محمد طارق غازی کا مضمون 'صلح حدیبیہ کا عمرانی رُخ' حضورؐ کے تدبر اور دوراندیشی کی یاد دلاتا ہے۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی شاہ کا 'شہنشاہِ فرانس نپولین کا قبولِ اسلام' تحقیقی مضمون ہے۔ نپولین ملٹری جینئس تھا حضورؐ کو اپنا رول ماڈل تصور کرتا تھا۔ اُس نے فرانس کو نپولین کوڈ (لیگل سسٹم) دیا جسے یورپ کے دوسرے ممالک نے بھی اپنایا افسوس کہ اُسی ملک کی صحافت اور ثقافت کے دعویدار حضورؐ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوئے۔ انگلستان کے سابق چیف جسٹس لارڈ ولف نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ گستاخانہ خاکے شائع کرنے والوں کو بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔

حصہ نظم میں شعرا نے اپنے کلام میں نگینے پروئے ہیں شفق ہاشمی صاحب کی نظم 'یہی رہا جو نظام گلش' پاکستان میں حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کرتی ہے۔ جناب معظم سعید نے اپنی آزاد نظم میں جنّت کے پھول پروئے ہیں۔ سید تابش الوری نے اپنی نظم میں لہو کی تاریخ لکھی ہے۔ فیض احمد فیض نے بھی خونِ دل میں انگلیاں ڈبولی تھیں۔

جناب اویس جعفری نے ہمیں عظیم ترک شاعر یونس ایمرے سے متعارف کرایا۔ جس طرح علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ کی ترجمانی کی اِسی طرح جناب اویس جعفری نے بھی عظیم ترک شاعر یونس ایمرے کی ترجمانی کی ہے اِن کی نظم ''لفظ'' اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ میں بلند خیالات بندھے ہوئے ہیں:

کبھی یہ قطرہ ، کبھی سمندر   یہ سنگ ریزہ کبھی یہ گوہر
یہ گاہ ذرہ، یہ گاہ صحرا کبھی پرکاہ بھی یہی ہے

جناب اویس جعفری کے نوکِ قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ عظیم ترک شاعر یونس ایمرے کا پیغام ہم تک پہنچا رہے ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

عقیل دانش۔لندن (برطانیہ)

الاقرباء نظر نواز ہوا۔ تازہ شمارہ آپ کی کاوشوں کا بہترین مظہر ہے۔ آپ نے حصہ نثر اور نظم کو ادب کے آفتاب و مہتاب سے سجا دیا ہے۔ الاقرباء کا بین الاقوامی منظر نامہ اللہ کے کرم سے روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اور الاقرباء پڑھ کر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔

قاری کو فکر کا نیا منظر دکھا دیا   الاقرباء نے روپ ادب کو نیا دیا

خدا آپ کو ادب کی خدمت کی مزید استقامت عطا فرمائے۔ ہم سب اہلِ قلم آپ کے کاروانِ ادب میں شامل رہیں گے۔ الاقرباء کے لیے ۲ غزلیں اور ۲ مضامین حاضر ہیں۔

نوید سروش۔میرپورخاص (سندھ)

آپ کا اداریہ "سیاست گزیدہ ادب وثقافت" ہماری ذہنی بدحالی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہم اپنی تہذیب واقدار سب فراموش کر چکے ہیں۔ ہماری اجتماعی سوچ ختم ہو چکی ہے ذاتی سوچ اور چھوٹے بڑے ذاتی مفاد کو مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔ "ذیلی اداریہ" میں بھی کچھ ایسی ہی باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

سید انتخاب علی کمال صاحب کا مقالہ "عقدۂ تاریخ گوئی" بڑی توجہ سے پڑھا۔ حیران کر دینے والی ذہانت اور فن میں کمال مہارت ہے۔ میرا خیال ہے کہ سید صاحب موجودہ عہد میں اس علم میں اپنے نام کی طرح عالم میں "انتخاب" بھی ہیں اور "کمال" بھی ہیں۔ ڈاکٹر مظہر حامد

صاحب نے ''عہد حاضر میں مسدّس حالی کی اہمیت'' کو جس تناظر میں پیش کیا ہے وہ موجودہ پاکستانی معاشرے کی خصوصاً اور مسلم اُمّہ کی عموماً یہی صورت حال ہے۔ ہمیں اپنے چھوڑے ہوئے راستے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکامات اور نبی کریمؐ کی تعلیمات کی جانب واپس آنا ہوگا۔ مسدّس حالی کے متعلق درست لکھا ہے۔

''مسدّس حالی کی مقبولیت میں آج بھی جس قدر اضافہ ہوا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہر دور میں اس سے رہنمائی لی جا سکتی ہے۔'' (۳۹)

گوشہ پروفیسر ڈاکٹر معزالدین مختصر مگر بہت اہم ہے۔ محمد صادق کے لیے گئے تفصیلی انٹرویو میں اُن کے ذاتی حالات، تحریک پاکستان کا پس منظر، سیاسی منظرنامہ، تعلیمی کامیابیاں، ملازمتوں کے مختلف ادوار، کتابوں کی اشاعت، ہندوستان میں علامہ اقبالؒ کے صد سالہ جشن میں شرکت اور وہاں کی تقریریں، ڈاکٹر صاحب کی زبانی سُن کر ایک الگ ہی لطف آیا۔ یہ انٹرویو، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن و فکر پر کام کرنے والوں کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوگا۔ محترمہ عمرانہ معز کا حسین یادوں کی خوشبو میں بسا ہوا مضمون ''میری یادوں کا مرکز'' انتہائی شستہ زبان اور دھیمے لہجے کی تحریر ہے۔ جس میں تہذیب، اعتماد اور رفاقت کے رنگین پھول کھلے ہوئے ہیں۔ تحریر کا بہاؤ ایسا رواں ہے کہ پڑھنے والا مصنفہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ رومی معز کی تحریر محبت اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جو ایک مشفق باپ با اصول استاد اور پُر خلوص راہ نما کو زبردست خراج تحسین ہے۔ سید منصور عاقل صاحب نے ''رفتید و لے نہ از دلِ'' میں دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔

''احمد ندیم قاسمی بحیثیت شاعر'' ڈاکٹر گل ناز بانو نے اقتباسات سے زیادہ مدد لی ہے۔ محترمہ نے کہیں کہیں ''ندیم قاسمی'' لکھا ہے۔ ندیم قاسمی کسی اقتباس کا حصہ نہیں ڈاکٹر صاحبہ کی تحریر کا حصہ ہے جو مناسب نہیں۔ غلام ابن سلطان نے سرشار صدیقی کی شخصیت اور فکر و فن کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ مگر انھوں نے صرف چار کتابوں کے نام تحریر کیے ہیں جب کہ ۲۰۰۶ء تک اُن کی نظم و نثر کی پندرہ کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ان پندرہ میں ''ارتقا'' شامل نہیں اور نہ ہی مرے علم میں

ہے سرشار صدیقی مرحوم کا مقطع یاد آ رہا ہے آپ بھی سنیئے۔

ہمارے عہد کا غم مستزاد ہے سرشار حقیقتوں سے گریزاں بھی، بے یقین بھی ہے

اقبالیات کے باب میں پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی نے اقبال کے نظریہ قومیت وملت'' کی تفہیم کی ہے جب کہ ڈاکٹر کوثر طلعت نے ''عہد آئندہ کا فلسفی'' فکر اقبال کے نئے گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تاریخ کے حصے میں محمد طارق صاحب نے صلح حدیبیہ کا عمرانی رخ'' موجودہ دنیا کی طاقتور وہ قومیں جو مسلم ممالک کے متعلق غلط اندازے رکھتی ہیں اور اپنی رائے یا یک طرفہ سوچ رکھتی ہیں سراسر غلط ہے۔ صلح حدیبیہ واقعتاً معجزہ تھا۔ محمد طارق صاحب کی اس کتاب کا انتظار رہے گا۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی شاہ نے شہنشاہ فرانس نپولین کے قبول اسلام کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ تحریر قارئین تک محمد طارق علی کے خوب صورت اور رواں ترجمے کے ذریعے پہنچی۔ کمال کی تحریر ہے۔ نپولین کی قبول اسلام سے پہلے اور بعد کی فکر اور نفسیات میں واضح تبدیلی حیرانی کی بات نہیں یہی اسلام کی تعلیمات ہیں عطاالرحمان قاضی (تیسری غزل) پروین شیر، ڈاکٹر سید قاسم جلال، کرامت بخاری اور صابر عظیم آبادی (پہلی غزل) اپنے لہجے اور انداز کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ تنویر پھول کی غزل میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار بھی آگئے ہیں۔ شفق ہاشمی کی غزل کی لفظیات کی مٹھاس نے متاثر کیا۔ پرتو رومیلہ کی پہلی غزل ہمارے سماجی روّیوں اور سیاسی منظرنامے کی تصویر ہے۔

بند کر دینا سیدھے رستوں کا ہو گیا لازمی حکومت میں

مفتیٔ وقت کا ہے یہ فتویٰ قتل شامل ہوا عبادت میں

انور شعور صاحب کی غزلیں سادگی اور سہل ممتنع کی مثال ہیں

تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں فیض اٹھایا کرو مقولوں سے

کیا یہی افتراق سیکھا ہے اُمتوں نے بھلا رسولوں سے

میرا خیال ہے کہ ایک شاعر کی دو سے زائد غزلیں نہ ہوں تو بہتر ہے۔ معظم سعید (جنت کے پھول) پروین شیر، (شہر خموشاں اور شکست) کرامت بخاری (بوڑھا درخت) اور صوفیہ انجم تاج (ایک سوال) کی نظمیں ہماری سماجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور پھر اُن سے ملنے والے دکھوں کی عکاس ہیں۔ پروفیسر زہیر کنجاہی، رشید آفریں، حبیب اللہ بخاری اور اویس الحسن کی نعتوں میں عشق رسولؐ، اطاعت نبیؐ اور سیرت کے نمونے اپنے اپنے انداز میں ملتے ہیں۔

مرا اک اک نفس مدحت سرا ہے — یہ سب عشق محمدؐ کا صلا ہے
سند اُن کی غلامی کی ہے یہ بھی — کہ مجھ سا شخص نعتیں کہہ رہا ہے۔
(زہیر کنجاہی)

آپؐ جب آئے تو آیا اس جہاں میں انقلاب — آپ کی رحمت سے عالم ہوگیا پھر فیضاب
(سید حبیب اللہ بخاری)

سیّد منصور عاقل صاحب! ویسے تو ''الاقرباء'' کا ہر پرچہ اہم ہوتا ہے مگر خصوصیت کے ساتھ یہ پرچہ اپنے مضامین اور گوشۂ پروفیسر معزالدین کے حوالے سے تادیر یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر قاسم جلال۔ بہاولپور

''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ ترسیلِ جریدہ اور اشاعت کلام کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ''الاقرباء دینی، اخلاقی، علمی اور ادبی حوالے سے احیائے خیر اور دفع شر کے لیے جو مساعی سر انجام دے رہا ہے، بے شبہ تاریخ کا حصہ بنتی جارہی ہیں۔

خداوندِ تعالیٰ آپ کو اس کارِ خیر کی مزید توفیق عطا فرمائے اور سرپرست اعلیٰ حضرت سید منصور عاقل اور رسالے کی ادارتی ٹیم کو دُنیوی و اُخروی سعادتوں سے نوازے۔

کرامت بخاری۔ لاہور

آپ کا ''الاقرباء'' نظر نواز ہوا جب سے موصول ہوا ہے زیر مطالعہ رہا اداریہ سے لے کر مراسلات و خبر نامہ تک سب تحریریں انتہائی اہم اور جاندار ہیں۔ اردو زبان کے حوالے سے اور

اردو کانفرنسوں کے انعقاد کے بارے میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی بہاولپور کی کانفرنس زیادہ اہم کانفرنس تھی سیاست نے اور گروہ بندیوں نے لاہور اور کراچی کو اپنی ذمہ داریوں سے قدرے دور کر دیا ہے۔

لاہور اُداس بھی ہے کہ عقیل روبی، محترمہ صابر لودھی، اور محترمہ افضل توصیف صاحبہ یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہو گئیں کراچی میں عجیب وحشت اور خلفشار کی فضا ہے، تخلیقی کام تو بہر حال ہوتا رہتا ہے مگر اس کے لیے امن کی فضا اور عافیت کا گوشہ بھی تو ہونا چاہیے۔ اردو کی حمایت میں میں نے مختصر تاثر اور نفاذ اردو تحریک کے لیے لکھا تھا وہ بھجوا رہا ہوں وہ اس کے رسم الخط کے حوالے سے ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گا۔

آپ کے موجودہ پرچے میں حصہ نثر خاص وقیع ہے۔ کلام داغ، مسدس حالی اور بدایوں کا ایک شاعر مظہر حامد، فیصل مقبول اور پروفیسر زاہد کی بہت اچھی کاوش ہے۔ اقبال کے حوالے سے دونوں مضامین نسبتاً کمزور دکھائی دیے، تاریخ میں دونوں تحریریں اچھی ہیں۔ ڈاکٹر معزالدین مرحوم بڑے آدمی تھے اور اپنے مشاہیر کو یاد رکھنا زندہ قوموں کی علامت ہے۔ یادِ رفتگاں بھی اسی تسلسل کا حصہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے تقریباً ۷۰ سال فعال ادبی زندگی گزاری اور تمام عمر ادب سے پیوستہ رہے۔ سرشار صدیقی مرحوم صحافی، شاعر، ادیب دانشور اور نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اُس نسل کے نمائندہ تھے جس نے تقسیم کی اذیت ناک صورت حال کو آنکھوں سے دیکھا اور برداشت کیا۔ حمد ونعت، منظومات میں، سید تابش الوری، سید حبیب اللہ بخاری، مضطر اکبر آبادی، ظفر اکبر آبادی، اور اویس جعفری، نوید سروش کی تخلیقات بہت متاثر کن تھیں۔ نقد و نظر میں آپ نے سید نواب حیدر کے مجموعہ ''غنچہ نگاہ'' پر بہت خوب تبصرہ کیا ہے۔ ان کے اشعار کا گرویدہ ہوں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ کے جریدۂ ادب وثقافت کے لیے حسب روایت تخلیقات روانہ کر رہا ہوں۔

صابر عظیم آبادی۔ کراچی

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔ الاقرباء کا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء موصول ہوا۔ سرورق پر پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدین کی خوبصورت تصویر بہت اچھی اور پُر شکوہ ہے۔ آپ کا اداریہ ''سیاست

گزیدہ ادب وثقافت'' سیاست داں طبقے پر گہرا طنز ہے۔ادبی محفلوں میں سیاسی افراد کو مدعو کرنا نہیں چاہیے۔ان کا شمار غیر ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔وہ کیا جانیں کہ ادب، ادیب اور شاعر کس بلا کا نام ہے۔محفلوں میں انھیں چندہ لینے یا سیاسی تعلقات بڑھانے کے لیے بلایا جاتا ہے۔زیر نظر شمارے کے تمام مضامین بشمول اقبالیات اور تاریخ بہت عمدہ اور جامع ہیں۔ڈاکٹر معزالدین اور یادرفتگاں کے گوشے بھی بہت خوب ہیں۔منظومات اور غزلوں کا حصہ بھی معیاری ہے۔کتاب ''غنچہ نگاہ'' پر آپ کا تبصرہ پڑھنے کے قابل ہے جس سے آپ کی بصیرت اور لیاقت ٹپکتی ہے چند تخلیقات حاضر خدمت ہیں۔باقی سب خیریت ہے۔تمام احباب اور اراکین کو میرا اسلام کہیے۔

نسیم سحر۔راولپنڈی

سہ ماہی الاقرباء باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے اور ہر بار اس کے مندرجات میرے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔یہ پُر وقار ادبی جریدہ یقیناً دوسرے بہت سے جرائد سے بہتر انداز میں اہم موضوعات کا احاطہ کر رہا ہے۔تازہ شمارے میں قومی ورثہ اور قومی تشخص کے بارے میں جس دردمندانہ انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے اور قومی سطح پر قومی ورثہ کے تحفظ اور اقوام عالم میں اس کے عمدہ انداز میں تعارف اور پہچان کروانے کے بے شمار ذمہ دار اداروں کی موجودگی کے باوجود جس طرح کوئی ٹھوس کام سامنے نہیں آیا، اس کی نشاندہی آپ نے بہت خوب کی ہے۔مگر۔۔۔'' مردِ ناداں پر کلامِ نرم ونازک'' والا حال ہے۔

جناب محمد طارق غازی نے سلطنت عثمانیہ کی تاریخ اُرخان کی فتوحات پر جو مقالہ تحریر فرمایا ہے اُسے بھی اس شمارے کی قابلِ قدر تحاریر میں شمار کیا جا سکتا ہے۔محمد طارق غازی کا طویل صحافتی وادبی تجربہ ایک ایک لفظ میں اپنا اظہار کر رہا ہے کناڈا جانے سے پہلے وہ ایک طویل عرصہ تک جدہ، سعودی عرب میں ایک انگریزی کے روزنامے کے مدیر رہے ہیں، اور اُن کے دولتکدے پر اور بہت سے دیگر مقامات پر ہونے والی ادبی محافل میں ان کی شاعری اور ادب وتاریخ کے حوالے سے ان کے زرّیں خیالات سننے کی خوش نصیبی مجھے میسّر رہی ہے۔اُن کے عظیم القدر والد مولانا حامد

انصاری غازی سے بھی وہیں ملاقاتیں رہیں اور بلاشبہ ایں ہمہ خانہ آفتاب است والی مثال ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے کہ محمد طارق غازی کی والدہ محترمہ بھی ایک معروف ناول نگار تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طورقا ارنے ترکی کے تجربات کے تناظر میں اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل کو حقیقت پسندی سے اُجاگر کیا ہے اور اُن کا یہ سوال اس موضوع پر طویل اور بے مقصد بحث کرنے والوں کے لیے قابلِ توجہ ہے کہ کیا اردو کا کوئی اور مسئلہ باقی نہیں رہا جو اردو داں دوست اردو کے رسم الخط پر آ کر اٹک جاتے ہیں اور اس پر قلم فرسائی کرتے جاتے ہیں۔

آمنہ عالم۔ کراچی

''الاقرباء'' کا اکتوبر تا دسمبر شمارہ موصول ہوا آپ کے مستقل قاری سعود صدیقی صاحب کی وساطت سے الاقرباء کا تعاف حاصل ہوا تھا چند شمارے ہی زیر مطالعہ رہے لیکن ان میں شامل وقیع علمی وادبی مواد نے بے حد متاثر کیا۔ ہمارے اس روبہ زوال معاشرے میں اور ان دِگرگوں حالات میں جس محنت سے آپ اتنے معیاری جریدے کی اشاعت کا سلسلہ قائم رکھے ہوئے ہیں وہ یقیناً دادو تحسین کے لائق ہے۔

موصول شدہ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ یادِرفتگاں میں شامل دونوں مضامین پسند آئے ڈاکٹر معزالدین صاحب جیسی قابل شخصیت کے بارے میں علم ہوا لیکن اب وہ ہمارے درمیان نہ رہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

شمع سید۔ لاہور

اللہ پاک سے دُعا ہے کہ آپ ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔ (آمین) الاقرباء کا گزشتہ شمارہ بھیجنے پر آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ کی دونوں کتابیں بھی موصول ہوگئیں ہیں تہہ دل سے ممنون ہوں آپ کی عنایت کے لیے۔

پرچہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ اور متاعِ فکر ونظر کے بارے میں کیا کہوں۔۔؟ بے حد خوبصورت تحریریں اور شعراء پر لاجواب تبصرے۔ اپنا نام اہل ادب لوگوں کے درمیان دیکھ کر

بے حد خوشی ہوئی اور کچھ تقویت بھی ملی دل کو یہ سوچ کر کہ جس لکھنے والے پر آپ کے قلم سے چند
الفاظ بھی میسر آ جائیں تعریف و تنقید کے وہ یقیناً خوش نصیب ہے۔ اللہ پاک آپ کی عمر دراز کرے
تا کہ آپ جیسے گوہر شناس ہم جیسے نوآموز اور ناتجربہ کار لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے رہیں۔ تاخیر
کے لیے بے حد معذرت خواہ ہوں۔ افسانہ ارسال کر رہی ہوں اگر آپ کے ذوق اور الاقرباء کے
معیار پر پورا اترے تو خوشی ہوگی۔ آپ کی رہنمائی، عزت افزائی اور عنایات کے لیے ایک بار پھر
شکر گزار ہوں۔ آپ کی پوری ٹیم اور آپ کے لیے صحت و سلامتی کی ڈھیروں دعائیں۔

راجہ نور احمد عبد المومن ماہر۔ (مکتوب بنام محمد اویس جعفری۔ سیاٹل۔ (امریکہ)

> یہ آخری خط اور اشعار ہمارے محترم قلمی معاون جناب راجہ نور احمد
> عبد المومن ماہر نے بستر علالت سے لکھے تھے جب کہ ان کا قیام لیونیا مشی
> گن (امریکہ) میں تھا۔ مکتوب کے مندرجات ہی سے یاس و حسرت ٹپک
> رہی ہے اور زندگی سے مایوسی بھی۔ افسوس صد افسوس کہ یہ تحریر ان کی زندگی کا
> حرف آخر بن گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پس
> ماندگان کو صبر جمیل۔ آمین (ادارہ)

میرے بھائی۔ سلام عرض کرتا ہوں۔ کہیں غیر وقت تو تکلیف نہیں دے رہا ہوں؟ افسوس
ہے کہ آپ کی کئی کالز کا قرض دار ہوں، شرمندہ ہوں کہ جواب نہیں دے سکا۔ بس کیا عرض کروں۔
اچھا خاصہ سیاٹل سے آیا تھا، یہاں آ کر بیمار ہو گیا اور کئی امراض نے بیک وقت حملہ کر دیا نتیجتاً
ہسپتال میں ہوں۔ وجود و عدم کی سرحد قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ زندگی کا سفر بیشتر تنہا
گزارا، طویل تھا لیکن ہوا کی طرح گزر گیا۔ معلوم نہیں زندگی میں کتنی مہلت اور باقی ہے۔ اللہ کا
شکر ادا کرتا ہوں کہ بیٹا، بہو اور بچیاں قریب ہیں اور بیٹی مستقل رابطہ میں ہے۔ اللہ انھیں اجر عظیم
دے۔ آپ پریشان نہ ہوں اور دعا میں ضرور یاد رکھیے۔ گزارش ہے کہ چند اشعار اپنے بیٹے عمر کی
وساطت سے بھیج رہا ہوں۔ انھیں بھائی منصور عاقل صاحب کو سلام اور گزارش قبولیت کے ساتھ

روانہ کردیجے۔ سیاٹل کے احباب اور الاقربا کے قارئین تک دعا کی درخواست پہنچا دیجیے۔ مولانا صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام، مسجد کے احباب کو سلام، بھائی پرویز اور ان کی اہلیہ کو سلام۔ اور ہماری بہن مسرت کو سلام۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ زندگی رہی تو بات ہوگی ملاقات ہوگی۔ اللہ آپ سب کو خیریت سے رکھے، سب کی حفاظت فرمائے۔ تندرست رکھے اور دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین آپ سے دیر تک بات کرنے کو جی چاہتا تھا صحت ساتھ نہیں دے رہی۔ بادلِ ناخواستہ اجازت چاہتا ہوں اور اب ہسپتال کے اسٹاف کے آنے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔ اللہ حافظ

آہٹ بھی نہ محسوس ہوئی ختمِ سفر تک یہ عمرِ رواں کتنے دبے پاؤں چلے ہے

(بسترِ علالت سے)

زباں وہ دے کہ ترا ذکر صبح و شام کروں قلم وہ دے کہ تری معرفت کو عام کروں
گناہ گار ہوں مجھ کو عطا وہ کر توفیق کتابِ زیست کا عنوان تیرے نام کروں
جو دل کو موم کرے، سینہ کو کرے روشن مجھے وہ نطق ہو حاصل تو پھر کلام کروں
دل و نظر کو عطا کی ترے پیام نے جو ترے کرم سے میں اس روشنی کو عام کروں
وہی جو ساقیِ کوثر کے خُم میں ہے یارب میں اس شراب سے لبریز اپنا جام کروں
میں تھک گیا ہوں بہت، ہے یہ آرزو ماہر جو آئے وصل کی منزل تو پھر قیام کروں

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلیے)

مرتبہ
شہلا احمد

احوال و کوائف

○ سید معتز احمد کو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی تکمیل پر دلی تہنیت:

سابق سیکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید نعیم احمد و بیگم عظمیٰ احمد کے ہونہار صاحبزادے عزیزی معتز احمد نے اس سال ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ماشاء اللہ بحسن و خوبی مکمل کر لیا ہے۔ دسمبر ۲۰۱۵ء سے وہ آرمی میڈیکل کالج سے ہی ہاؤس جاب کا آغاز کریں گے۔ مستقبل میں ان کا ارادہ ایمرجنسی میڈیسن میں خصوصی تعلیم حاصل کرنے کا ہے۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اس کامیابی پر انہیں اور جناب و بیگم نعیم کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے آئندہ بھی ان کی بہترین کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ سیدہ سدرہ سالاری کے لیے ہدیۂ تہنیت:

سیدہ سدرہ سالاری رکنِ مجلسِ انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید ظفر اللہ سالاری و بیگم نیر سالاری کی ہونہار صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے گزشتہ دنوں آرمی میڈیکل کالج سے بہترین کارکردگی کے ساتھ ہاؤس جاب مکمل کیا ہے۔ آج کل وہ ہولی فیملی ہسپتال سے چار سالہ پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ (PGT) کر رہی ہیں۔ یہاں بھی ان کی کارکردگی بہترین ہے۔ مستقبل میں ان کا ارادہ میڈیسن میں Specialize کرنے کا ہے۔ ادارہ سہ ماہی آئندہ بھی ان کی اعلیٰ ترین کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ عزیزی محمود الحسن خان اور عزیزہ آمنہ اویس کی شاندار امتحانی کامیابی

عزیزی محمود الحسن خان اور عزیزہ آمنہ اویس سہ ماہی الاقرباء کے ممتاز قلمی معاون اور بلند

پایہ سکالر جناب اویس الحسن کے فرزند ارجمند اور دختر نیک اختر ہیں اور وہی ایجوکیٹرز سکول اسلام آباد میں کے۔جی کلاس کے طالب علم اور نرسری کلاس کی طالبہ ہیں ان میں سے بھائی اور بہن نے علی الترتیب سکول کے سالانہ امتحان میں اول اور دوم پوزیشن حاصل کی ہے۔ادارہ ماہی الاقرباء انھیں اور جناب وبیگم اویس الحسن کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں عظیم کامیابیوں کے لیے دعاگو ہے۔

○ انتقالِ پُرملال:

رکن مجلسِ منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن محترمہ ماریہ صابری اہلیہ محترم جی اے صابری (سینئر نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن) کی والدہ محترمہ خالدہ مسعود صاحبہ انتقال فرما گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھیں۔ علالت کی باعث کافی کمزور ہوتی گئیں اور مورخہ ۱۲ فروری ۲۰۱۵ء کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) وہ نہایت خلیق، مشفق و مہربان اور ہمدرد خاتون تھیں۔ زندگی بھر مستحقین کے لیے کام کرتی رہیں۔ اور اس حوالے سے "ادارہ بحالی معذوراں" کی بنیاد ڈالی اور اپنی خدمات کے صلہ میں پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے "فاطمہ جناح ایوارڈ" حاصل کیا۔ پسماندگان میں انہوں نے ایک صاحبزادی (ماریہ صابری صاحبہ) اور دو صاحبزادے اظہر مسعود (ریٹائرڈ ائرفورس افسر) محمد علی مسعود (لاہور انجینئرنگ کالج میں پروفیسر ہیں) چھوڑے ہیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے کو اٹھارہ سال پہلے ہی کسی بدبخت نے آفس سے نکلتے ہوئے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔۔۔ اللہ جملہ لواحقین و پسماندگان کو صبرِ جمیل عطاء فرمائے۔ آمین

سیدہ سارہ سلمان

گھریلو چٹکلے

- **پیاز اور مرچوں کی مہک:** ہاتھوں سے لہسن پیاز اور مرچوں کی مہک دور کرنی ہو تو ٹوتھ پیسٹ ہاتھوں پر مل لیں۔ بدبو دور ہو جائے گی۔
- **لیموں کے رس کے فائدے:** کوئی بھی چیز تلتے ہوئے کڑاہی میں دو یا تین بوند لیموں کا رس ڈال دیں تو تیل تلی ہوئی چیزوں میں کم جذب ہوگا۔
- **ہچکی روکنے کے لیے:** ہچکی کو فوراً روکنے کے لیے ایک سبز الائچی کھا کر فوراً ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیں ہچکی رک جائے گی۔
- **کھانسی سے نجات:** کھانسی سے نجات حاصل کرنے کے لیے تلسی کے پتوں کا پیسٹ بنا کر شہد میں ملا کر دن میں دو سے تین دفعہ چاٹ لیں۔
- **فریج میں بدبو:** اگر فریج میں بدبو آ رہی ہو تو اچھی طرح صفائی کر کے ایک پیالی میں سرکہ ڈال کر فریج میں رکھ دیں
- **ہاتھوں پر جلن:** ہاتھوں پر اگر کسی وجہ سے جلن ہو رہی ہو تو املی کے رس میں چینی ملا کر مل لیں۔ جلن ختم ہو جائے گی۔
- **استری جل جائے تو:** اگر استری نیچے سے جل جائے تو اس کے اوپر بیکنگ سوڈا ڈال کر ریگ مال سے رگڑ لیں۔ استری صاف ہو جائے گی۔
- **آٹا خمیر سے بچانے کے لیے:** آٹے کو خمیر سے بچانے کے لیے گوندھنے کے بعد آٹے پر ہلکا سا گھی لگا ہاتھ پھیر دیں۔ چکنائی کی وجہ سے خمیر کے بیکٹیریا اندر نہیں جا سکیں گے۔